

غالب

غلام رسول خاں

بفتر مائیش
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندون لومباری و ازہ لاهور

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عسالم چھپا
طبع چہارم قیمت للہ

فہرست ابواب

۱	پیدائش نام و نسب اور خاندان	۱	پہلا باب
۲۶	عہد طفلی اور تعلیم	۲	دوسرا باب
۳۳	شادی خانگی زندگی اور متعلقین	۳	تیسرا باب
۷۷	دہلی میں سکونت اور مکان	۴	چوتھا باب
۸۷	سفر ملک	۵	پانچواں باب
۱۲۴	رام پور اور میرٹھ کے سفر	۶	چھٹا باب
۱۴۵	پنشن کا مقدمہ	۷	ساتواں باب
۱۷۸	ابتلاء اسیری	۸	آٹھواں باب
۱۹۵	مالی حالت مدح گوئی اور صلہ یابی	۹	نواں باب
۲۳۸	دہلیستان غدر	۱۰	دسواں باب
۳۰۵	پنشن کے لئے سعی و سفارش	۱۱	گیارہواں باب
۳۳۲	عوارض اور وفات	۱۲	بارہواں باب
۳۴۱	اخلاق و عادات	۱۳	تیرہواں باب
۳۸۱	تصانیف	۱۴	چودھواں باب
۴۴۹	کام طریق اصلاح اور مشاعرے	۱۵	پندرہواں باب

نوٹ: غالب کی جن تصانیف کے حوالے کتاب میں دیئے گئے ہیں ان کے ڈیشنوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) کلیات نظم فارسی مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۸۹۳ء (۲) کلیات شرف فارسی مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۸۸۴ء

(۳) اردو منتخبہ مطبوعہ طبع فاروقی دہلی ۱۳۲۴ھ (۴) غزل ہندی مطبوعہ نو لکھنؤ جولائی ۱۹۰۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ آج غالب کی مگرزشت حیات کا یہ مرقع اپنی زندگی کے چوتھے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے جیسا کہ بار بار عرض کر چکا ہوں۔ ہندوستان کے اس نادر الوجود شاعر کے سلسلے میں کام کے وسیع پروگرام کا یہ محض متعدد مرتبہ تھا۔ افسوس کہ اب تک اصل کام کے لئے ایک قدم اٹھانے کی بھی مہلت نصیب نہ ہو سکی۔ زندگی کے بیشتر اوقات، اور فکر و نظر کی بضاعت مریضات کو سیاسی مشغولیتوں کی غلغلہ دینا پڑا۔ ان مشغولیتوں سے فراغت کے جو چند لمحے وقتاً فوقتاً میسر آئے۔ وہ غالب سے بھی اہم تر کام کے حوالے کر دیئے۔ اب تو وہ آرزو ہی افسردہ ہو چکی ہے جو غالب کے مفصل سوانح کی ترتیب میں مشعل راہ بنی تھی۔ اور یہی ہم اعاذ اللہ اس ذکر میں بھی لطف و ذوق کی کوئی چاشنی باقی نہیں چھوڑی۔

کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی آج بھی یہ دستور ہو رہا ہے بلکہ اس مرتبہ کتابت کے انتظام میں بھی سخت دشواریاں پیش آئیں جن کی وجہ سے کتاب کی طباعت کم و بیش دو بیسے مؤخر ہو گئی۔ ان حالات میں غالب کی ظاہری آرایش کے متعلق میری بے بسی کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔

کتاب جسد پہلی مرتبہ چھپی تھی تو میرے عزیز دوست جناب عبدالرشید صاحب راحل نے ایک بغیر طبع مادہ تاریخ حضرت حفیظ ہوشیار پوری کے ہاتھ میرے پاس بھیج دیا تھا۔ پھر میری درخواست پر ایسے ایک قطعہ کی صورت میں نظم کروایا یہ قطعہ اسی زمانے میں انقلاب میں چھپ گیا تھا۔ اب میں اپنے عزیز و مخلص دوست کے اس گداں بہادر مخلص کو مستقل طور پر شامل کتاب کرتا ہوں اور یہ ہر لحاظ سے میرے لئے اور کتاب کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔ حضرت راحل فرماتے ہیں:-

جائے بدہ زبادة غالب بہ لطف خاص بجانم خدا نے لطف تو ساقی مہر پھر
نہیں بعد گو بہ حضرت مہر میں پیام من دل را بہ دل رنجیست دریں گنبد سپہر
در زیر چرخ راحل سر مست دلبس است جائے دوست ساقی و غالب رکھک مہر

آخر میں اپنے محترم بھائی الحاج شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے ابتداء ہی سے غالب کی کتابت و طباعت وغیرہ کی تمام ذمہ داریاں اپنے دوش بہت پر اٹھائی تھیں اس سلسلے میں نگرانی کے سوا مجھے ہر چیز سے بچائے رکھا۔ اگر یہ ناچھن کام کسی اعتبار سے بھی قابل توجہ سمجھا جاسکتا ہے۔ تو شیخ صاحب ممدوح اس کے اجراء میں بہ الفاظ غالب یقیناً ”شریک غالب“ ہیں۔

مسلم ٹاؤن لاہور ۱۲ ستمبر ۱۹۴۶ء

مہر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلا باب

پیدائش، نام و نسب اور خاندان

غالب نام آدم نام نشانم مہر سید

بسم اللہم و بسم اللہم

تاریخ پیدائش اسد اللہ بیگ خاں نام، میرزا نوشہ عروت، نجم الدولہ و سپر الماک نظام جنگ
خطاب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۴ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو اکبر آباد (اگرہ) میں زینت
آرا سے عالم وجود ہوئے۔ نواب علاء الدین احمد خاں رئیس لوہار کو ایک خط میں
جو غالباً ۱۲۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، فرماتے ہیں:-

”میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے آٹھ سو سال برس شروع ہوا ہے۔

ایک اور خط میں نواب صاحب ممدوح ہی کو لکھتے ہیں:-

قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارجح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے۔

اسے غالب نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ ان کی ولادت بوقت شرب چار گھنٹی پیش از طلوع سورج روز یکشنبہ ہشتم
رجب ۱۲۱۲ھ مطابق آغاز ۱۲۱۲ھ ہوئی۔ حساب کے مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی عیسوی تاریخ ۲۴ دسمبر ۱۷۹۷ء عتیقی
نیز اس دن یکشنبہ نہ تھا۔ بلکہ چہار شنبہ تھا یعنی غالب نے وقت اور قمری تاریخ درست لکھی لیکن دن اور عیسوی تاریخ کی غلطی ظاہر ہے۔

کہ عالم ادراج کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ء کو مجھے
رو بکاری کے واسطے یہاں (یعنی دنیا میں) بھیجا۔ (مترجمہ ماہ ذی الحجہ ۱۲۴۴ء)

خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

حضرت! میں اب چراغ سحری ہوں۔ رجب ۱۲۸۲ء کی آٹھویں تاریخ سے اکتوبر ۱۲۸۳ء
شروع ہو گیا۔ طاقت سلب اور اس مفقود امراض مستولی۔

دیوان فارسی کے خاتم کی نشر میں غالب نے اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک
لچسپ رباعی لکھی ہے جس میں دو مادے نظم کئے ہیں۔ اور دونوں اس تاویر و نگار
ہستی کی سرگزشت حیات کا آئینہ ہیں :

غالب چوڑا سازی فرجام نصیب ہم خوف مدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم شورش شوق آمد و ہم لفظ غریب
”شورش شوق“ اور غریب دونوں سے ۱۲۱۲ء کا عدد برآمد ہوتا ہے تاویر و نگار
مادے غالب کی زندگی کا نہایت ہی صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔

صاحب عالم مارہروی سجادہ نشین درگاہ برکاتیبہ معروف بہ سرکار خور و غالب
کے ایک نہایت عزیز دوست تھے۔ اردوئے معلیٰ کے مکتوب الیہم میں ہیں :-
۱۲۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ ایک مرتبہ غالب کو لکھا کہ میرا سنہ ولادت لفظ
”تاریخ“ سے نکلتا ہے۔ اس تاجدار اقلیم تفتن نے بے تکلف لکھ بھیجا :-

ہاتف غیب شب کو یوں چینا
اُن کی تاریخ میرا تاج تاج

”تاریخ“ کے اعداد میں الف کا ایک ہندسہ بڑھا دیا جائے۔ تو ۱۲۱۲ء بن جاتے

ہیں ۔

نام | نام، عرف اور خطاب کے متعلق غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں جا بجا

تصریحات ملتی ہیں۔ غدر کے متعلق نشر کی مشہور کتاب "دستبنو" پہلی مرتبہ آگرہ میں فشی شیونرائٹن آرام کے مطبع مفید خلائق میں چھپی تھی۔ اور چھپائی کا سارا انتظام فشی سرگوپال تفتہ، فشی نبی بخش حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہرگیرا ہوا تھا۔ ایک خط میں تفتہ کو ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

فشی شیونرائٹن کو سمجھا دینا کہ نہ ہمارا سرورق و ستبنو پر ہرعت نہ لکھیں مابراے خطائی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ان نام کے بعد لفظ بہادر کا اور بہادر کے بعد تخلص "

اسد اللہ خاں بہادر خاں

پھر فشی شیونرائٹن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

سنو میری جان انواری کا مجھ کو خطاب ہے، نجم الدین اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب بہادر نے جوان دنوں ایک روبکاری بھیجی ہے۔ تو لفظ نواب اسد اللہ خاں لکھا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا میرزا اسد اللہ خاں اور بہادر

کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

تفتہ نے پوچھا تھا کہ اسد اللہ خاں کے بجائے محمد اسد اللہ خاں کیوں نہ لکھا

جائے۔ نیز نام سے پہلے میرزا لکھا جائے یا مولانا یا نواب۔

جواب میں فرماتے ہیں:-

سنو صاحب! لفظ مبارک ماحم (محمد) کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر

چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں یہ لفظ یعنی محمد اسد اللہ خاں نہیں لکھا جاتا

میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرزا مولانا و نواب اس میں سے تم کو اور بھائی (فشی

نبی بخش حقیر) کو اختیار ہے جو چاہو لکھو۔

عرفت کا ذکر غالب نے اپنے اردو دیوان کے دیباچہ کی تشریح کیا ہے۔

فرماتے ہیں :-

یارب این جوئے ہستی ناشنیدہ از ہستی پیدائی نارسیدہ یعنی نقش پیمبر آمدہ نقاش
کرید اسد اللہ خان موسوم بہ میرزا نوشہ "معروف بہ غالب" تخلص است چنانکہ کبر آبادی
مولدہ و ابوہی مسکن است فریام کار بخشی مدفن یارہ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ابتدا میں اپنے عرف کا اظہار بے تکلف کرتے
تھے لیکن جس زمانے میں "دستنبو" چھپ رہی تھی۔ منشی شیونرائن صاحب آرام
مالک مطبع مفید خلافت نے غالب کو ایک خط ایسا بھیجا۔ جس کے لفظی پڑ میرزا نوشہ
"صاحب غالب" درج تھا۔ غالب کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں "دستنبو" کے سرورق پر
بھی یہی عبارت درج نہ ہو جائے۔ چنانچہ نکتہ کو لکھتے ہیں :-

صاحب مطبع (منشی شیونرائن) کے خط کے لفظ پر لکھا ہے "میرزا نوشہ صاحب غالب" اللہ
غور کرو! کتنا بے جوڑ محکمہ ہے۔ ڈرنا ہوں کہ صفحہ اول کتاب پر یہی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان
یا اردو کا یا پنج آہنگ یا "مہر نیمروز" چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر (آگرہ) میں نہیں چھپی
جو وہ (منشی شیونرائن) میرا نام دیکھ بیٹھ؟ تم نے بھی میرا نام انہیں نہ بتایا۔ صرف اپنی
نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ دہلی کے عوام کو تو عرف
معلوم ہے۔ مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزیرا کے محکمہ میں اور ملک عالیہ کے حضور میں کوئی
اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "میرزا نوشہ" لکھ دیا۔ تو میں غارت
ہو گیا، کھویا گیا۔

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء تک غالب عرف سے متنفر ہو چکے
تھے اور اس کے اظہار کو موجب عار سمجھنے لگے تھے۔ شاید ابتدا میں عرف اس لئے
اختیار کر لیا تھا کہ اس زمانے کا ایک عام دستور تھا۔ اور "میرزا نوشہ" کہلانے کی وجہ
یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ کا عرف "میرزا دولہا" تھا۔

لیکن جب شباب کی رنگینیوں اور عامیانہ آرائش جوتیوں کا دور گزر گیا اور طبیعت میں متانت و ثقاہت پیدا ہو گئی تو عرف سے عار آنے لگی۔

مولد سے محبت اگرچہ ابتداء میں باب ہی میں آگرہ کو چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، لیکن مولد کی محبت ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہی۔ نواسب ضیاء الدین احمد خاں تیرا ایک دفعہ آگرہ تشریف لے گئے غالب نے انہیں آگرہ خط بھیجا۔ دیکھیے اس میں مولد کے ساتھ والہیت کا اظہار کس ولولہ انگیز انداز میں کرتے ہیں:-

جان برادر! اشک و آہ غالب امراد یعنی آب و ہوائے اکبر آباد بہ شما سازگار باد
 گو قسم کہ خود را بہ سفر گرفتہ و نزدیک خود از من دور تر رفتہ ایذا ماچوں ہنوزم درد طن یہ ہمانا کہ نزدیک
 با من آید۔ شادم کہ شوق دور اندیش ویدہ و دل را دریں سفر بہ شما فرستاد تا ہم دریں
 غربت و ادو شادمانی دیدار وطن نیز تو اتم داد۔ زینہار اکبر آباد را بچشم کم نگرند و از رہ گزر ہائے آن
 دیار الحفیظ گوئے "دلا مان سرائے" گزند کہ آن آباد چہ ویران و آن ویران آباد بازی گاہ
 ہسم چو من مجنوں نے و ہنوز آن بقعہ را در ہر کف خاک چشمہ خولے است۔ روزگار سے بد
 کہ در آن سرزمین جز مہر گیانہ رستے و میچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح در آن گل کہ بہ
 مستانہ وزیدن دلہار را آغایہ از جا برانگیختے کہ زنداں را ہوائے حبس و پارسیاں را نیت
 نماز از ضمیر فرو تختے۔ ہر چند ہر ذرہ خاک آن گل زمیں را از تن پیامے بود دل نشیں و ہر برگ آن گلستاں
 را از جان درودے بود خاطر نشان، اما تازگی وقت شمار اور نظر داشتہ چشم براہ آن داشت کہ کے
 نویسندہ در یغ کہ پہچ گاہ ننوشتند کہ رخس سسنگیں دعائے مرا بہ کدام ادا پذیرفت و دریا
 بہ پاسخ سلام من از زبان موج چہ گفت :-

سے یعنی تیرہ کا گھڑا۔ سکندرہ (آگرہ) میں اکبر کے مقبرے کے قریب اعتباری خاں کی مسجد سے ملا ہوا
 سنگ سُرخ کا ایک نہایت خوبصورت گھوڑا نصب ہے۔ غالب کا اشارہ اسی کی طرف ہے (تقیہ شامیہ صفحہ ۱۰۱ پر)

بقیہ حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۵۔ عام روایت یہ ہے کہ کسی تاجر کا ایک عزیز گھوڑا اس مقام پر بچا ایک مرگیا تھا اس کی قبر پر بطور یادگار یہ مجسمہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔

اورنگ زیب نے زمانہ شہزادگی میں جبکہ اس کی عمر صرف چودہ برس کی تھی، مست ہاتھی سے جو جاننا نازہ جنگ کی تھی، ہتھارنچ وان کو معلوم ہوا شاہان مغلیہ بالعموم مست ہاتھیوں کی لڑائی کو تماشا دیکھا کرتے تھے۔ اسی قسم کا ایک تماشا شاہجہاں کے حضور میں ۱۶۹۹ء دی قدست ۱۱۰۰ھ (۱۶۸۳ء) کو ہوا تھا۔ جس میں عام تماشاٹیوں اور امراء کے علاوہ داراشکوہ، شجاع اور اورنگ زیب بھی موجود تھے۔ لڑنے والے ہاتھیوں میں سے ایک کا نام سدھکر اور دوسرے کا صورت سندھ تھا۔ لڑتے لڑتے صورت سندھ ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ سدھکر نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن بیکار ہو کر اورنگ زیب کے گھوڑے پر اس زور سے حمل کیا کہ سوار اور گھوڑا دونوں زمین پر آ رہے۔ جوں سال شہزادے کو یوں ہولناک خطرے میں دیکھ کر پادشاہ امرا اور تماشاٹیوں کی سانسیں رُک گئیں۔ بادھرا دھر سے سدھکر پر چرخیاں چھوڑی گئیں۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ اورنگ زیب گرتے ہی اٹھا اور تلوار بھینچ کر تنہا ہاتھی کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ شجاع نے بھائی کو بچانے کے لئے گھوڑا آگے بڑھایا، لیکن سوا اتفاق سے اس کے گھوڑے کی پیشانی پر ایک چرخہ لگی اور وہ گر پڑا۔ میرزا راجا جے سنگھ نیزہ ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا۔ اس اثناء میں صورت سندھ پلٹ آیا۔ اور سدھکر کا رخ اس کی طرف ہو گیا۔ اس طرح شہزادے کی جان بچی۔ شاہ جہان نے چودہ برس کے جگر بند کی یہ شان جلالت دیکھ کر معاً "بہادری" کا خطاب عطا کیا۔

کلیمن ہائی نے اس واقعہ کو شہنوی کی شکل میں نظم کر دیا تھا۔ میرے پاس دیوان کلیم کا ایک فلمی نسخہ ہے۔ جو شاعر کی وفات سے صرف سترہ برس بعد لکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک علیحدہ ورق پر اس واقعہ کے متعلق ایک قطعہ بھی موجود ہے۔ جس کے بعض اشعار ذیل میں درج ہیں۔

شیر دل شہزادہ فطرت بلند اورنگ زیب	آب شمشیرش بہ آتش دعوئے پیکار کرد
در حضور ثانی صاحب قراں شاہ جہاں	بر آتش بافیل مست آہنگ گیر و دار کرد
نیزہ اش چوں از سر آں فیل جوئے خوں کشاد	سپ گشتی اسوئے دشت آہنگ از کہسار کرد
رخش آں رحم دل از آسیب فیل از پا قتاد	جاں ندائے شہسوار عرصہ پیکار کرد
چوں سپرد آں باد پارا حق شناسیہا ہنگام	مرقد اورا مطاف آہوئے تار تار کرد

آساں سنگ مزارش را بہ شکل اسپ ساخت
زانما ز دل نقش او نتواں بروں یک بار کرد

نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قطعہ کلیم کا ہے۔ یا کسی دوسرے شاعر کا اور موجودہ رخس سنگیں اورنگ زیب کے گھوڑے کی یادگار ہے۔ یا کسی دوسرے گھوڑے کی۔ لیکن قطعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کے گھوڑے کی قبر بھی یہ شکل اسپ بنی تھی۔

خطاب ”نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب و دوران تنہوریہ کے آخری
پادشاہ سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف سے ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو ملا تھا۔
جبکہ خاندان شاہی کی تاریخ نگاری کا منصب غالب کے حوالے کیا گیا تھا۔ مہتمم روز
کے دیباچہ میں ہے:-

بہشتیہ لبت و سوم شعبان سال یک ہزار و صد و شصت و شش ہجری یا چہارم جون سال
یک ہزار و شصت و صد و پنجاہ عیسوی برابر شہنشاہ بہ شکوہ کے پنداری آفتاب است در بیت الشرف
بر اورنگ نشستہ و من بہ نشا طے کہ کوئی عطار دست در صمیم بہر و بدایتا وہ کار پروازان شاہی
بہ فرمان حضرت ظل الہی بہ خلعت خانہ غاصم برد و قاتمتم را بہ خلعت شمش پارچہ آراستہ بہ
سلام گاہم آوردند خداوند دنیا و دین بدان دست شمش آئین کف آں دست در بایستہ ہست کہ
ہفت دریا کف اوست جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ و سر سبز بہ سرم لبت، رگ جان بر نیساں یعنی
حائل مروارید بہ گردنم آویخت۔ پاؤش فرخ سرش گہائے تراویدہ رگ ابرخارہ شاہ پرویں
سپاہ برگوشہ بساط بارگاہ افشاں و غالب سخن سرانے را نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ خواند۔

تخلص غالب نے ابتدا میں اُردو میں شعر کہے۔ تو اسے تخلص رکھا۔ جب فارسی
میں کہنے شروع کئے۔ تو غالب تخلص اختیار کیا۔ بعد ازاں اُردو میں بھی بالعموم
یہی تخلص رہا اور اسی نے عالمگیر شہرت پائی۔ لیکن اُردو میں اس تخلص کی پابندی
انہوں نے کبھی گوارا نہ کی۔ چنانچہ پچیس برس کی عمر کے بعد جو اُردو کی غزلیں کہی گئیں۔
ان میں سے دس بارہ میں اس تخلص موجود ہے۔ بعض اوقات تخلص کی جگہ پورا نام
رکھ دیتے تھے۔ مثلاً: مارا ز مانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

۱۸ مہتمم روز میں جون ۱۸۵۷ء چھپا ہوا ہے۔ لیکن تقویم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۳ شعبان ۱۲۷۶ھ کو ۴ جون نہیں بلکہ
۴ جولائی تھی۔ دن یقیناً پنجشنبہ یا جمعرات کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ غالب کا سہو نہیں ہے۔ بلکہ کتابت کی غلطی ہے۔

تبدیل تخلص کی وجہ | تخلص بدلنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض لوگ جو ذوق سخن سے نا آشنا تھے، میرا مانی اسد ایک غیر معروف شاعر کے اشعار غالب سے منسوب کرنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ غالب کے عزیز شاگرد منشی شیونرائن آرام نے بھی میرا مانی کے ایک شعر کو غالب کا شعر سمجھ کر پوری غزل مانگی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-
بھائی۔ حاشا! تم حاشا! اگر یہ غزل میری ہو۔

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے خوب مطلع کہا ہے۔

اسد اس جفا پر جھٹوں سے دغا کی

میرے شیر شاہیاش رحمت خدا کی

میں نے ان سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت بات یہ ہے کہ ایک شخص میرا مانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں ہے۔ اور منہ کروں میں مرقوم ہے میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے۔ ورنہ غالب ہی ملک تارما ہوں۔ تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مرتزف ہو!

لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا چکا ہے۔ بعد میں کبھی کبھی اسد تخلص فرماتے رہے۔ مولانا آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے کہ جھج میں کوئی فرد مایہ شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن ان کا منقطع کسی نے پڑھا:-

اسد تم نے بتائی یہ غزل خوب

اسے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیڑا ہو گیا۔ اور انہوں نے سنہ ۱۲۴۵ھ میں "اسد اللہ غالب" کی رعایت سے غالب تختا اختیار کیا۔

ہیں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد مرحوم کے اس بیان کو بنیاد لیا ہے۔ کیونکہ سنہ ۱۲۴۵ھ میں تخلص بدلنے کا واقعہ یا بہت مذمت ہے۔ غالب ۱۲۴۱ھ میں کدیتہ جاتے ہوئے لاکھنؤ ٹھہرے تھے۔ وہاں انہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص موجود ہے۔

مئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادوہ کشش کا نہ ہے ہم کو

اس سے ظاہر ہے کہ وہ سنہ ۱۲۴۱ھ سے پہلے ہی آزاد ہیں جو غالب تخلص فرماتے تھے۔

نسب و خاندان | قوم کے ایک ترک تھے۔ بار بار دعویٰ کرتے ہیں کہ میر اسلسلہ نسب توران ابن فریدوں سے ملتا ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تورانیوں کا جاہ و جلال کیا بیواں کے عروج و اقبال کی آمدی میں مشیت نیکار کی طرح اُٹ گیا تو حکمران خاندان کے تمام بقیہ اسبف افراد وطن کو چھوڑ کر باہر منتشر ہو گئے۔ اسلامی عہد میں اس خاندان کے بعض افراد نے وہ عظیم الشان سلطنت قائم کی جو تائیں کے اوراق پر سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کے تاجداروں میں الپ اسلان، ملک شاہ اور سنجہر شہرت عام کے تاج پہن چکے ہیں۔ جب یہ سلطنت زائل ہو گئی تو افراد خاندان دوبارہ غربت اوسے کی طرح پریشان و منتشر ہو گئے۔ انہی میں سے ایک کا نام شہزادہ ترسم خاں تھا، جو سمرقند میں جا بسا۔ یہ غالباً غالب کا پردادا تھا۔

لیکن ان بیانات کی تاریخی حیثیت کے متعلق و ثلوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے

کہ تختیہ کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی اشیخ تو رائیوں کی نسل سے
تھے جن کی عظمت و بزرگی کا ذوق شاہ تاسہ نے سنایا ہے یہ نسب نامہ غالباً
اس وقت بنایا گیا، جب بخر نے خلیفہ بغداد کی لڑائی سے نکاح کی خواہش کی تھی۔
مقصود یہ تھا کہ سلجوقیوں کے خاندان کو قدیم و باجبروت پادشاہوں کا نامزدان دکھلایا
جائے۔ بہر حال غالب کے یہ دما دی ہر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں لیکن حقیقت
ہے کہ وہ بچے درجے کے نامزدان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے آباء بہادری محبوب
ترین مشغایہ زنی و پہگری تھے۔

دہندستان آئے غالب نے دادا غالب احمد شاہ پادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔
اور سب سے پہلے لاہور میں نواب معین الملک سے پاس ملازم ہوئے۔ معین الملک
کے انتقال کے بعد پنجاب میں طوائف گردی شروع ہو گئی تو غالب کے دادا لاہور سے
واپس چلے گئے۔ بہ شاہ عام پادشاہ سے اور ذوالنثار دود میرزا نجف خان
مختار کل بن گئے۔ تو غالب کے دادا کو ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ اور پیاسوکا پر گنہ
ذات اور رسالے کی تحواہ کے لئے مقرر ہو گیا۔ اس وقت سے انہوں نے دہلی میں
سکونت اختیار کر لیا۔ اور غالب کے والد میرزا عبداللہ صاحب نام دہلی میں پیدا

ہوئے۔ ذوالفقار لاہور میں نجف خان ایران کے نذر خانہ میں ایک فرد تھا۔ شاہ وقت کے دربار میں صفوں نماز تریا ہی
آئی تو نجف خان بے یار و مددگار رہ گیا۔ نواب میر صفی جنگ ویداد دھ کے بھائی میرزا حسن بیک ایران گئے تو نجف خان ورسلی
ہیں خدیو سلیم کو ہندوستان لے آئے۔ خدیو سے میرزا حسن نے خود نکاح کر لیا۔ میرزا نجف خان بہت شہلے اور دل کے پاس و دھڑ سے جو
میں تعلقات بہت خراب ہو گئے تو میرزا محمد نے میرزا محمد بیدار خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے بعد نجف خان ورسلی خدیو
کی پھر شاہ عام کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ اس نے مختاری عام کا منصب حاصل کر لیا۔ آگرہ میرزا محمد بیکری جاٹ علاقہ وردوار گنگا و
جھٹکا کا برحقہ جاگیردار بن کر ان کی سالانہ آمدنی میں لکھ بوند تھی۔ اس نے معین الملک کے بھرتے جسے شیراز سے کو
درست کر کے انتہائی کوشش کی۔ بڑا دربارہ پیر خوش راج، خوش تقریر اور انصاف بندہ میرزا تھا بعض بیانات
سے یہ ظاہر ہے کہ وہ بہت سے بڑا علوف تھا۔ پر اس شخص میں وفات ہوئی۔

سوئے۔ نقشی جدید: اللہ خان زکریا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں :-

میں قوم کا ترک سلجوقی ہو رہا ہوں اور میرے انتہائی شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطانیت میں قسمت کوئی تھی۔ صرف بچان ٹھوسے اور سارے دوسرے سے شاہ عالم کا کرڑا۔ ایک پرگنہ یہ حاصل ذات کی تخواہ اور سلسلے کی خواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو بیٹے اندر کا ہوتا کہ وہ علقہ نہ رہا۔

موروی سرلج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :-

ترک تبار اور فلسفہ میں بہادر یاب و بنگلہ کے چوند و بزرگان میں ازبک کہ اسلجوقی تبار چوند
ہو گیا۔ دیکھو کہ وہ اس زمانے میں رہا۔ وہ بڑی فرشتہ بعد پیری شدن و درنگ
جاہ میں آں کرہ چو تار فی بے نوائی رہے تار۔ جسے راؤ فی بہر فی وغارت گری از
جائے بُرد۔ و طالعہ را کشا و رزی پیشہ نہایت۔ تبار کا یہ بقولان زمین شمس و تندرستی کہ شد
از ان میان نہایت (دادا) من از ہر خوردہ۔ دستک بندہ اور وہ تار ہوئی حیدر صاحب کو دید۔
چوں بساط معین الملک دروشتند و دلی بدو۔ ذوالقادران را میرزا نجف خان ساور و پور
از ان میں یہ عبد اللہ یاب خان بہ شاہ جہاں آباد ہو چکا۔ دوسرے بہ اکبر آباد۔

انور الدین نوب محمد سعد الدین خان بہادر شفق رئیس کدورہ لپسی کو لکھتے ہیں :-

نیا ہے: یہ نگار تری بود ز زوارا یاب و پستنگ۔ از ترک تان بہ چہ دروے اور
لاہور در معین الملک نیک گاہ و رانش جائے ساخت۔

مہر نیمروز کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

نیاہ نام نگار از تہذیب و پستنگ بود نہ وہ ماندہاں باذ در رنگ۔ نورین
چراغ ہستی نور در غرا سباب بہ باد سبب کینہ کینہ پستنگیاں را روز سیاہ

میں درخداوندان اورنگ، و سیم را از ان بگ و ساز بزمی گندناگون یہ گفت نہ ماند۔
 یہ مرزا بوم بیگانہ روئے آورند و بہ دست مزق و تیغ زدن ناں خوردند ہم ازیں ہیستان، یونان
 کسارتیں سلجوقیاں و گریارہ سرہ، فسر و فسر گوہر استغند چرخ گردنہ چنایچہ خوسے دوست
 ایں نامداں کاؤس کوس را نیز از پائے قلندہ۔

در شرب ما خواہش فرود من جوی در مجمع ما طایع مسعود نہ یابی

در بادہ اندیشہ مادر و نہ بینی در آتش ہنگامہ مادر و نہ یابی

ز و پس بیان میں قائد نیاے من کہ در قلمرو مادر ساسانہ سمرقند شہر مسقط الرأس شہ بدو
 چون سبیل کہ از بالا پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد و در دفتر بہید شاہ از و الفقار الدورہ میرزا
 محف خاص نوپنج توکری تاش زشتند و بہر گنہ پاسو بات دینی سے و پانہ فہشتند
 نہ کہے دے دا ا غالب کے دادا کا نام میرزا اوقتان بیگ خان تھا۔ وہ خود ایک تحریر
 میں جو عالماء لکھ کر ڈکٹہ العجائب کے لئے لکھی گئی تھی۔ (مطبوعہ رسالہ دوم)
 فرماتے ہیں۔

اسد اللہ خان نائب مجلس عرف میرزا نونہ قوم کازک سلجوقی، سلطان برکیہ رقی کے
 دوستوں سے اس کا اوقتان بیگ خان، شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دی آیا چپاس
 گورے اور نقارہ و نشان سے پادشاہ کازک بڑا بہ پاسو کا پرندہ جو عمر کی بیگم کو سرکار
 سے مدد تھا۔ وہ اس کی جاداد میں مقرب پڑا تھا۔

خوجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ غالب کے دادا کی زبان ترک کی تھی۔ نیز ان کے متعدد
 بیٹے تھے۔ جن میں سے سرف و و کے نام معلوم ہیں۔ ایک میرزا عبد اللہ بیگ خان
 عرف میرزا ولہا (غالب کے پدر بزرگوار) دوسرا میرزا نصر اللہ بیگ خان
 (غالب کے عم محترم)

”یادگار غالب“ میں فشی نبی بخش حقیر نے نام غالب کا ایک خط موجود ہے جس

میں اپنی بچپنی کے مرنے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین بچے سیار، تین چچا ورامک
بابہ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے مرنے سے میں جانتا تھا کہ یہ آدمی
زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے سے میں نے جانتا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوتان بیگ خان کے سات بچے تھے، چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔
غالب کا یہ دعویٰ عمل نظر ہے کہ ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان
آئے۔ اس لئے کہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ ۱۵۵۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور
نواب معین الملک غور۔ میر مقبول نے یہ کہے پاس غالب کے دادا، یہیں ملازم ہوئے
تھے۔ نومبر ۱۵۵۵ء (محرم ۱۰۰۵ھ) میں وفات پائی۔ لہذا مائتا چالیس۔ کہ میسر مرزا
قوتان بیگ زین محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ یہ بہت زیادہ غالب کا عام
خاندانی اہانت پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی
کی سبب سے مراد مرنے کی وجہ سے وہ اس کی تصحیح نہ کرتے۔

نواب نے انساب سے بہت نسب پر جا بجا کر لیا ہے۔ وہ کبھی اپنے نوا فراسہ بیان اور
پیشگی کہتے ہیں، کبھی دودہ زادہ کہتے ہیں، کبھی ساجوئی اور نورانی
بتاتے ہیں، کبھی ایک ہونے پر غر کرتے ہیں مثلاً:

غالب زند خاک پاک تورانیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
تُرک زادیم و دہر زادیم یہ ستر گن قوم پیوندیم
ایک یکیم از جماعہ انزاک در نامی ز ماہ دہ چندیم

فن آیاسے ما کشا و رزمی است

مرزبان زادہ سمرقندیم

۱۵۵۵ء کا سفر ۱۵۵۶ء پیشگی فرمایا گیا۔ آپ ۱۵۵۶ء زادہ فرمایا گیا اور ۱۵۵۷ء ایک مرتبہ لکھے اور ایک سے بڑھتی ماہ کاں
یہ ترکوں کے ایک قبیلے کا نام ہے۔

پہر فرماتے ہیں :-

سانی چہ ن پشنکی و فراسیایم دانی کہ اصل گوهرم از دودہ حمد است
میراث جم کہتہ بوداکنوں بہ من سپار زان پس رسد بہ نیت کہ میراث بادام است
مہر نیروزک دیباچہ میں اپنے نسب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

غائب بہ گہر ز دودہ زاد ششم زان رو بہ صفائے دہ تیغ است و دم
چوں رفت سپیدی زوم چنگ بشعر شد تیر شکستہ نیا گاہ تسلیم
بہادر شاہ کے ایک قبیلہ میں فرماتے ہیں :

سلجوقسیم بہ گوہر دنا قانیم بہ فن
توقیع من بہ سحر و ناناں برابر است

فتح پنجاب پر لارڈ ہارڈنگ کی مدد میں جو قبیلہ کہان تھا اس میں لکھتے ہیں :-

بلند پایہ سرا اگر چہ من سخن نجسم و یک پیشہ آبا بہ عالم اسباب
سپیدی بدو ترا فراسیاب تاپدہ ہماں طریقہ اسلاط و اشتقاق
دل و زان نگری تا پشت پشت بہ پشت بہ پیشگاہ تو چوں خویش را شوم تساب
من آن کسم کہ بہ توقیع میرا فیتاںش شبہ قلم و ششم دریں جہان خراب

ہے کسم بقلم کار ترخ و این کار لیت

شگرف و آخر و پندیرہ ادبوالالباب

آغا بزرگ شیرازی منخلص بہ فنا کے مکتوب میں لکھتے ہیں :

نعلیم و لے نور چشم مجھ تسلیم غریب و لے رشتہ اس جہانم
بہ شمار دعوے خدو نہ ز شرم در تعلیم معنی جہاں پہلوانم
گر فتم کہ از تحمہ فراسیایم گر فتم کہ از نسل سلجوقیہ نم
دل و دست تیغ زانی ہزارم رہ و رسم کشو کشائی نہ دامنم

تہل ساں نہ تیج میں نہ تہ
سند گرو بھند صاحب فرغم

بہروں کے قضیہ میں ذوقِ کلمہ ملگئی اور دانشناسی سے جو ناگوار صورت پیدا ہو گئی تھی، اسے ختم کرنے کے لئے نائب نے اردو میں ایک قلعہ لکھا تھا، جو اس زمانہ میں عام ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

سو پشت سے بہ پیشہ آبا سپہ بکری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں ہے:

غالب کے اجداد کی جو کیفیت اور پر بیان ہو چکی ہے، اسے مد نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ حرفاً حرفاً درست ہے۔ اور اسے عام شاعرانہ مبالغہ یا خیالی سخن گستری پر محمول نہیں ہونا چاہیئے۔

اپنے ہم قوموں کے متعلق نواب انوار الدولہ بہادر شفیق کو لکھتے ہیں:

بھائی! اللہ اکبر! میں تم کو سم خان پاتا ہوں۔ عزیزوں کی شہم کینتی اور شہزادوں سے

ناخوشی۔ میرا ہم قوم تو سرسراہرو ہند میں نہیں، ہمرقند ہیں، اوجار اور دشت خنجاں میں

سو دو سو ہوں گے، مگر ہاں اقربا! یہی ہیں۔

غالب کے والد ماجد امیرز قوٹان بیگ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ بیگ خاں

اور نصر بیگ خاں اپنے آبائی پیشہ یعنی سپہگری میں مصروف رہے۔ دونوں میں سے

کسی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی۔ نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ وفات کے وقت

ان کی عمر کیا تھیں۔ لیکن چونکہ دونوں غالب کی کم سنی میں فوت ہوئے، اس لئے قیاس

کہتا ہے کہ ان کی عمریں تیس پینتیس برس سے متجاوز نہ ہوں گی۔

غالب کے والد پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے، پھر حیدر آباد چلے گئے۔

اور نظام علی خاں کے پاس تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہے۔ یہ ملازمت

جاتی رہی، تو اگر وہ چلے آئے۔ جہاں ان کی شادی خراجہ غلام حسین خاں کمبندان کی

صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔ آکر اسے راجہ سخت اور سنگھ والی اور کے پاس بغرض ملازمہ بننے پہنچے لیکن مدعا براری کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے۔ کہ اور کا ایک زمیندار راجہ سے سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھی گئی۔ اس میں میرزا عبداللہ بیگ خاں کا دستہ بھی شامل کر دیا گیا۔ راج گڑھ کے مقام پر سرکشی زمیندار کے ساتھ چیتا ش ہوئی، جس میں میرزا عبداللہ بیگ خاں گولی کھا کر شہید ہو گئے اور وہیں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ غالباً سنہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ غالب کی عمر اس وقت صرف پانچ برس کی تھی۔ راجا شیو دیان سنگھ نے اور کے قیدیوں میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ موجود ہے فرماتے ہیں:

زاں پس کہ گشت کو ہر سن در جہان قیام	زاں پس کہ گشتہ شد پر سن بہ کارزار
در پنج سالگی شدہ ام چپا کر حضور	تلیں سخن طرازم و دیریں و طہینہ خوار
دارم بہ گوش حلقہ زنجار و ہشت سال	انوں کہ عشرت و سال است رشمار
باید شنید راز را عیان بارگاہ !	باید شنفت قصہ پیران آں دیار

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرورت

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

منشی حبیب اللہ خاں، نکاحیہ آبادی کو لکھتے ہیں :-

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں مکنو جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمیعت سے ملازم تھا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر اور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ سخت اور سنگھ کا نوکر ہوا۔

وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

تذکرہ مظہر العجائب کے لئے غالب کی جس تخریق کا ادھر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اس میں

لکھتے ہیں۔

باب اسد اللہ خان مذکور کا عہد سندھ سب خان دلی کی یا سب چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا تھا اس وقت خان اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ عہد اللہ بیگ خان اور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی جہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا جس حال میں کہ اسد اللہ خان مذکور پانچ چھ برس کا تھا۔

عبداللہ بیگ خان نے تین بچے چھوڑے۔ سب سے بڑی ایک لڑکی تھی جس کا عرف چھوٹی خانم تھا اور دوسرا بیون بیگ بدخشی کے ساتھ ہزاروں اکبر بیگ سے بیاہی گئی تھی۔ اس سے چھوٹے اسد اللہ خان غالب تھے اور سب سے چھوٹے یوسف خان۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ راؤ نے دو گاؤں سپر ساسل اور کسی قدر روہینہ عبداللہ بیگ خان کے بچے کو پرورش کئے مگر یہ کہتا ہوتا کہ مدت دراز تک ہامی رہا۔ غالب کے علم محترم عبداللہ بیگ خان درویش موت کے بعد ان کے بچوں کی کفالت نصر اللہ بیگ خان سے متعلق ہوئی۔ وہ پیٹ مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے سوہیار تھے۔ لیکن جب آگرہ انگریزوں کے ہاتھ میں آگیا اور سوہیار کی کشمیری بن گئی، تو کشمیری ایک انگریز مقرر ہو گیا۔ فخر اللہ ولد درویش ملک نواب احمد بخش بہادر رستم جنگ رہیں

۱۔ افسان کے کہ راؤ نے بہادر خان مالدار کیوں دلی کو چھوڑ کر آگرہ گئے۔ اگر میرزا بخت نالی نے ہیں انتہا ہر مسئلے میں بھجواتو یہ خان کشمیر سے پیشہ لاد اقمہ ہو گا۔ اُردو بخت خان کی وفات کے بعد میرزا شفیق، افسر اسلحہ خان، زمین، عابد، محمد علی بیگ، اور اسماعیل بیگ کی کشمکش سے تنگ آکر آگرہ گئے تو یہ ... شہر میں سماں بڑا گرم و غلا ہزاروں بیسے کے لہذا درویش عالم کی بیسی کھانہ میں ہاں گئے، تو اسے دو تین برس کا واقعہ کہنا ہے۔ مگر یہ کہ راؤ نے ... کی ... سے شادی ہوئی کہ راؤ نے چھوڑ کر آگرہ چلے گئے۔

شہزادہ حقیقی کے واسطے تھیں جانیے وہ بے حد کین تھیں جو ہم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے
انہوں نے نہ دینے لگے۔ مگر تین ہزار روپے سال

مولوی سراج الدین احمد خاں کہ ایک فاضل تھی کہ تو یہ ہیں۔ تم نے جانتے ہیں۔
پنج سال از عمر من گزشت کہ پھر نہ مہرم ساریہ بر سر نہ دینے۔ تم میں نے یہ سب مانگا تھا کہ
کہ مراد خان پروردگار ہر گز نہ دے گا۔ میں نے اس سے بچاؤ کیا۔ پس مراد خان
برداشت و مراد میں شہزادہ تھانہ سب سے بڑا اور اس میں مراد خان اور اس کے
بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں

جہیز لارڈ لیگ صاحب بہادر پروردگار ہر گز نہ دے گا۔ میں نے اس سے بچاؤ کیا۔ پس مراد خان
بابو ہے چار سو سو روپے ہر رکاب صاحب مراد خان اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں
نستعلیق کے سرکار گزشتہ دور میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں
انگلشیہ بہر حق صاحب مراد خان سب سے بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں
زخار خاں جیسو صاحب مراد خان سب سے بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں
مراد خان سب سے بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں مراد خان سب سے بڑا اور اس میں

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :-

نصرت بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا موبیذہ تھا۔ سٹیشن میں جب زیل بکس
صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصرت بیگ خاں نے شہر پہ دکر دیا اور طاقت کی مرہٹوں سے
نے چار سو سو روپے کا برگینہ پر کیا اور ایک ہزار سات سو تترہ غنہ کی پھر جب اس سے
زور بازو سے سونک سونک کے پر گئے بھرت پور کے قریب ہلکے کے سواروں سے
لئے بہر نیل صاحب نے وہ دونوں پر گئے بہادر موصوف کیہ بطریق استمعا اذنا نے گنہ
موصوف جانیہ مقرر ہونے کے دس بیٹے بعد ہر مرث نگاہ یا تھی پر سے کر کر دیا مگر
میں باز یافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہوئی۔

غالب نے کسی جگہ بھی صراحت نہیں لکھا کہ چائی موت کس طرح واقع ہوئی مگر یہ بال
تحریرات سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اوں موت ۱۵۵۵ء کی اور دم کس حالت میں ہوئی جبکہ
میرزا نصر اللہ بیگ ناں لارڈ لیگ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد یہ لکھی گئی ہے کہ
غلام خوں بہانہ یہ شب بھی تو سکتا ہے کہ شاید نصر اللہ بیگ ناں شہید ہوئے لیکن میں
جس حد تک معلوم کر سکا ہوں اس سے کہ تو شہادت نہیں مل سکی۔

حال یہ ہے کہ دو چار سال کے اندر بدست بعد دیگرے سے بگڑتے عالم بقا
ہو گیا اور لارڈ لیگ نے ان کے چچا کی وفات کے بعد دس ہزار روپے سالانہ کی نقد
معاوضہ شامل جاگیر نواسہ محمد بخش خاں پس ماندوں کے لئے مختص کر دی۔ لیکن
نواب مرحوم نے تین ہزار روپے سالانہ سے زیادہ نہ دیتے تھے۔ بن میں سے غالب
کے حصے کی رقم ساڑھے سات سو روپے سالانہ تھی۔ اس پانشن کا تفصیلی ذکر
دوسری جگہ اسے گا۔

غالب کی والدہ | غالب کے ایک غیر مطبوعہ خط سے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ کا نام
عزت النساء بیگم تھا اور وہ اپنی تعلیم یافتہ تھیں کہ دستاویزیں پڑھ سکتی تھیں۔ اگرہ
میں خداداد خاں اور اس کا بیٹا دونوں داخلہ ہو کر رہ کر رہتے تھے جن سے غالب
کی والدہ کو بھی روپیہ منگوانے کی ضرورت پڑی تھی۔ انہی کو غالب نے لکھا تھا کہ میری
والدہ پڑھی لکھی ہیں جس دستاویز پر ان کے دستخط ثبت نہ ہوں گے وہ معتبر اور
جائز متصور نہ ہوں گی۔

غالب کے نانا | غالب کے نانا خواجہ غلام حسین ساں کبیر خان تھے جو خواجہ حالی مرحوم
کے بیان کے مطابق سرکارِ ہند کے محترم و جی افسر اور اگرہ کے عمائد میں سے تھے۔

یہ خط نواب صدریہ کے لکھنا نصیب میں آیا ہے۔ اس کی نقل جولائی ۱۹۳۲ء کے رسالہ مانہ کا پڑھیں۔ یہاں پر بھی

ان کی دولت اور وسعت جایدا دکا اندازہ اردوئے معلّے کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو غالب نے منشی شہباز خان آرام کو لکھا تھا فرماتے ہیں :-

تم کو ہمارے خاندان اور اپنے نندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے؟ پچھلے سنو تمہارے دادا کے والد محمد نجات خان میں میرے نانا صاحب خواجہ غلام حسین خان کے رفیق تھے جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر بھول دی اور پھر کبیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں مگر سب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھرم منشی شہباز خان کے دادا، خان صاحب (خواجہ غلام حسین خان) کے ساتھ ہیں اور انہوں نے جو کچھ تمہاراں اپنی باگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھرم اس امر کے منکر ہیں، دکالت اور انتشار کی گت ہے میں اور وہ منشی بنسی دھرم تمہارے شاید منشی بنسی دھرم مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس بیس برس کی میری عمر اور اسی ہی عمر ان کی۔ باہم شہر نیچے اور املاط اور صحبت آدمی آدمی ذات نر جاتی تھی چونکہ گھران کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے بس ہمارے اور ان کے مکان میں پچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ مکھی چند نے مول لی ہے اس کے دروازے کی سنگین بارہ درمی پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کٹھیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے کیکے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے گی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑے کرا ایک اور کٹرہ کہ وہ گدیوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کٹرے کے ایک کونے پر میں پٹنگ اڑانا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پٹنگ لڑا کرتے تھے۔ اصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا۔ وہ کٹروں کا کرایہ اگاد کر ان کے پاس جمع کرتا تھا سنو تو یہی تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ ملاقاتی مول لئے تھے اور زمیندارہ اپنا کر دیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مالگزار دی ادا کرتا تھا۔

خواجہ سانی مرحوم کے ارشاد کے مطابق جس سرکار (خواجہ غلام حسین خاں) کے متوسلین دس دس ہزار روپے کے مالگزار بن گئے تھے اس کے بڑے بونے میں کیا شبہ ہے۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ غالب کے والد اکبر خاں بہ طور خانہ واد کے رہتے تھے۔ اس سے کہ غالب نے اپنے نانا ہی کے ملائے ہوئے اپنے ملاک ظاہر کیا ہے یا اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ والد ورنہ بیک وقت کے بعد غالب اپنے نانا ہی کے ہاں رہتے تھے۔ مذکورہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب غالب نے بڑی بی بی حکونتم، ختیار مراد کی لکھی تو ان کے نانا کے بعض املاک فروخت ہو گئے تھے یا خود غالب نے وہ املاک فروخت کر دیئے تھے جو نانا کی ملکان سے انہیں ملے۔

خاندان حسنین یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب کا خاندان بڑے اونچے درجہ کا تھا اس کے والد کی شادی جو جو غلام حسین خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے چچا کوٹلی قرار مشاہیر حسنین صاحبزادی کی بیگم تھی۔ درود غالب نے ان سے مراد مشاہیر سے منسوب تھے۔ غالب اس آخری رشتے ہی کی وجہ سے غالب کی شادی اندر بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الہی بخش خاں معروفت کی پھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔

بقیہ اور حکمت الہی یہ خیال ہے کہ اگر غالب کے باپ اور چچا کا سایہ کافی نہیں ہو سکتا نہ اٹھ جاتا، تو یہ ظاہر ہوتی امکان نہ تھا کہ انہیں پہلے ہی کے آبائی پیشہ پر پھرتا۔ چوتھی زندگی ادب و شعر کی نہ مرت کے لئے وقت کر دینے کا موقع ملتا۔ اگر باپ یا چچا نہ ہوتے تو میر تک زندہ رہتے تو غالب یہی ہے کہ شاخوئی کا یہ گنج گراں مایہ سیری کی نذر ہو جاتا۔ لیکن قدرت اس نادر روزگار وجود سے وہ سزا کا مہینا پھر بھی لکھی لکھا گیا۔ آبائی پیشہ میں لگانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتی تھیں وہ اس کے

بوش سنبھالنے سے پہلے ہی دنیا سے رحلت ہوئیں یہ سگری میں غالب بڑی سے بڑی ترقی کرتے تو اپنے چچائی طرح رسالہ بریل اپنے نانا کی طرح کبیران بن جاتے۔ لیکن ادب و شہرہ میں انہیں وہ پیر حاصل ہوا جو سدھنت و تاجدار می میں افراسیاب طعزن بنو، انیسپار سلطان ازرنک شاہ نے حاصل کیا۔ آق ترسم خاں عبداللہ بیگ خاں، نصر اللہ بیگ خاں اور خواجہ غلام حسین خاں کے ناموں سے ہم صرف اس لئے روشناس ہیں کہ وہ غالب کے بزرگ تھے۔ ورنہ ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہر جگہ میں موجود رہے ہیں جن کے نام بھی دوادین سیر سوانح میں شایان اندراج نہیں سمجھے گئے۔

اہل خاندان | یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے والد اور چچائی وفات کے بعد ان کے اور کون کون سے رشتہ دار موجود تھے، اور پر غرض کیا جا چکا ہے کہ چچا کی وفات کے بعد غالب کے خاندان کے لئے دس ہزار روپے کی معاش مقرر ہوئی تھی جس میں سے غلاب اسکا بخش مرحوم نے صرف تین ہزار سالانہ کی رقم دی۔ اس میں سے غالب کا حقہ سائتے ساتھ سو روپے تھے۔ ساتھ ہی سات سو ان کے بھائی یوسف خاں کو ملتے تھے۔ دہلی وزیر فن کے پرانے کاغذات حکومت پنجاب کے ریکارڈز آفس میں محفوظ ہیں ان میں غالب کی پنشن کے متعلق بھی بعض کاغذات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پندرہ سو روپے نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ یعنی غالب کی دادی اور خان مذکور کی تین بہنوں یعنی غالب کی چھ بیویوں کو ملتے تھے۔ دوسرے رشتہ داروں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ جب غالب دہلی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے تو ان کی والدہ اس وقت بھی زندہ تھیں اور وقتاً فوقتاً مافی امداد فرماتی رہتی تھیں چنانچہ نواب علاؤ الدین خاں والی دہلی کو ایک خط میں اپنی مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

بیس سو کچھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی اور سے کچھ دلوادیا کبھی ماں نے کچھ اگرہ سے بھیج دیا۔

غالب کا شجرہ نسب

میرزا قوقان بیگ خان

سرتما انسا، گم بہت خواجہ غلام حسین خان، میرزا عبداللہ بیگ خان، میرزا عبداللہ بیگ خان، دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں
(ان کی شادی نواب محمد علی خان (جن کے نام معلوم نہیں ہو سکے)
کی مشیر سے ہوئی تھی لیکن
لاولہ وفيات پائی۔)

چھوٹی خانم، میرزا اکبر بیگ بدخشی
(اولاد کیسے دیکھتے شجرہ خاندان بدخشی)

میرزا یوسف خان، میرزا اسد اللہ بیگ خان غالب
لاولہ

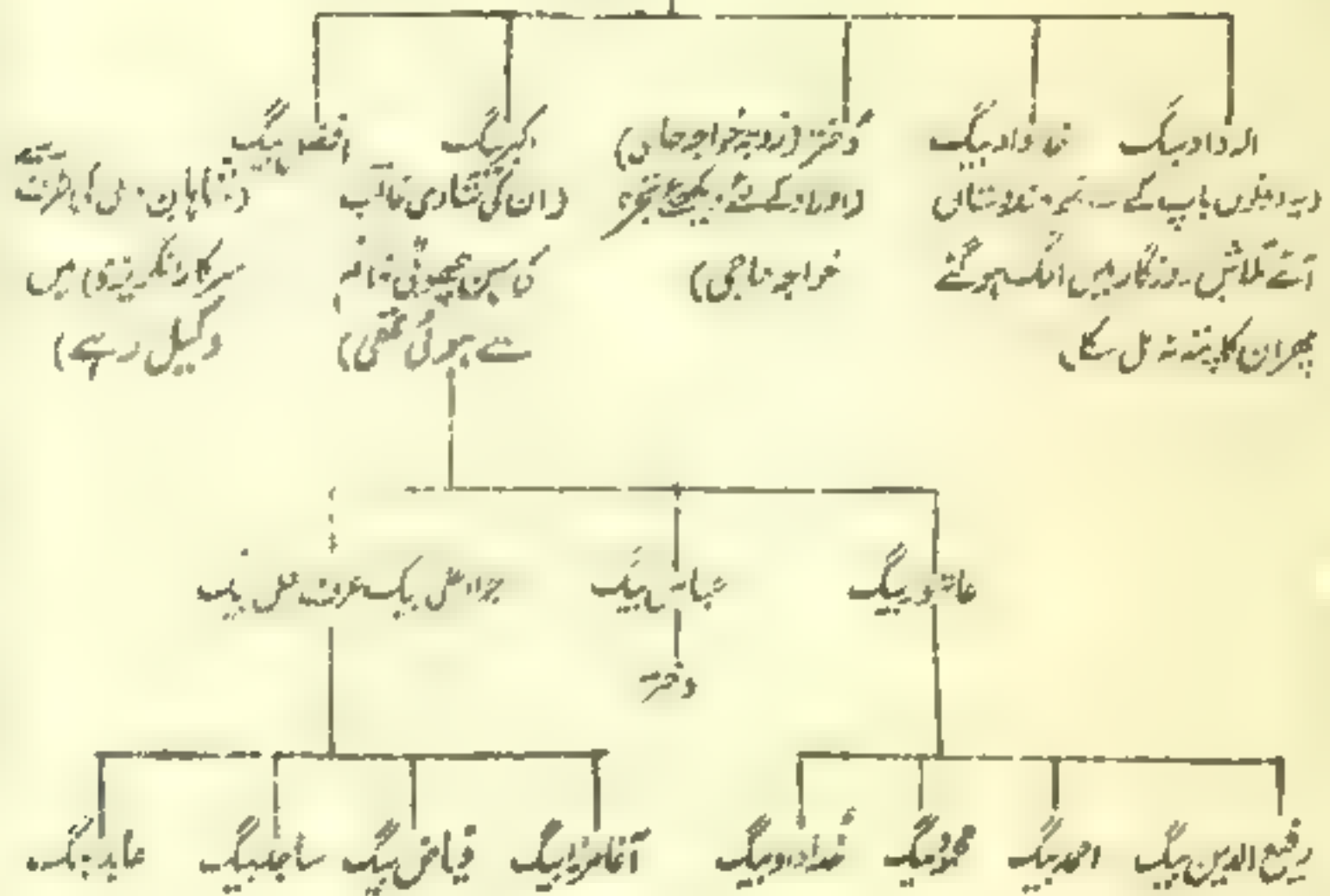
عزیز انسا، بیگم، میرزا غلام فخر الدین
(اولاد کیسے دیکھتے شجرہ خاندان لودارو)

سلطہ نواب آغا بخش خان مرحوم

شجرہ نسب خاندان بدخشی

یہ خاندان بھی غالب کے خاندان کی طرح ترک تان سے آیا تھا۔ اور ایک بزرگ کی وجہ سے سبز پوش "شہرہ تھا۔ اس کا مختصر سا شجرہ یہ ہے :

جیون بیگ کمیدان



نوٹ (۱) عاشق بیگ (غالب کے بھانجے) نے اپنے بیٹے احمد بیگ کے غدر میں مارے گئے۔

(۲) عباس بیگ دو دھریں ڈپٹی کمشنر کلکٹر بن گئے تھے۔ غدر کے زمانے میں لکھنؤ میں تھے بعد ازاں ریش آباد میں۔

(۳) آغا مزید بیگ حیدر آباد چلے گئے اور وہاں حیدر نظام کے ساتھ رہے جسے جہاں انہیں نواب سرور ملک کا خطاب عطا ہوا۔

(۴) محمد بیگ اور عبداد بیگ اپنے بچا عباس بیگ کے پاس دو دھریں ڈپٹی کمشنر بنے اور وہاں بعد میں ڈپٹی کلکٹر بنے۔

(۵) رفیع الدین بیگ بدخشی ابن عاشق بیگ دیوان میرزا جبرک دہلوی کے مقدمے کے ساتھ چھپ چکا ہے۔

دوسرا باب

عہد طفلی اور تعلیم

گہرا زراعت شاہان عجم پرچیدند بعض خاتمہ گنجینہ فشا نم دادند
افسر ارتقا کند ترکان پیشگی بردند برنخن نامیہ ترکیب نام دادند

سونا علی اغالب زیادہ سے زیادہ پانچ برس کے ہوں گے جب ان کے والد کا اشتغال ہوا
اکھ نو برس کے تھے جب اس شفیق چچا کے نقل عانت سے بھی محروم ہو گئے۔
میں نے باپ کے بتے ہی یتیم بستی کو آغوش میں محبت میں لے لیا تھا۔ کرو و پیش
امارت کے وسیع سامان موجود تھے چچا کی باگراچی جھپٹ سکی تھی۔ لیکن جس نمائندگی کی
سالانہ آمدنی لاکھ ڈالر ملتا تھا۔ اس کا محفوظ سرمایہ بہر حال کافی ہو گا چچا نے اس کے
وسیع املاک و مہر تھے۔ اور خراجہ خانی مرحوم کا بیان اگر درست ہے تو اور بڑا رستہ ہے۔
میر حاصل گا۔ اب بھی سے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ روزیہ بھی مقرر تھا۔ سرکار کی پیشانی
میں رہی تھی۔ ان سامانوں کو پیش آفا رکھتے ہوئے و فوق سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ
غالب کی ابتدائی زندگی میسرانہ ہوگی۔ عرب بطنی کے حالات اگرچہ تفصیلاً معروض نہیں ہو سکے
لیکن یہ یقینی ہے کہ اس زمانے کے عام میسر چہر کی طرح ان کی زندگی بھی لا آباویسی
ہو گئی تھی۔ وہ شطرنج اور پوسر کھیلتے پتنگ اڑاتے۔ یاروں اور دوستوں کے

کے جھگڑنے میں ہینکرمی سے دن گزارتے غالباً اسی زمانے میں عرق نوشی کی عادت پڑی جو مرتے دم تک نہ چھوٹی۔

سلیم لعلیہ سے متعلق تصانیف کی روایات معلوم نہیں ہیں خواجہ آبی مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ شیخ معظم شہید حضرت تھے جو اس زمانے میں آگرہ کے مشہور معلموں میں سے تھے بعض لوگوں نے نظیر اکبر آبادی کو بھی غالب کا استاد بتایا ہے لیکن میرے نزدیک درست نہیں۔ ان کی فارسی تعلیم میں سب سے بڑا حصہ ایک نو مسلم ایرانی پارس کا ہے۔ اس کا ابتدائی نام ہرمز تھا۔ ملا علی نام عبد العہد رکھا گیا۔ یہ فارسی اور عربی کا متبحر عالم تھا۔ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں برہیل سیاحت آگرہ پہنچا۔ دو برس غالب کے پاس مقیم رہا۔ ملا عبد العہد کے والد پر غالب کی جو رت و ذکاوت اور حسد استعداد

۱۵ سنہ ۱۲۰۸ھ ابو لکام آزاد فرماتے ہیں :-

ایک بات بالکل واضح ہے کہ یہ عبد العہد غریب و نادار تھا۔ اس کا نام غالب نے دیکھا۔ غالب نے دیکھا کہ وہ فارسی زبان کے لوگوں میں اور نہیں بدلتا۔ اس کی بات نہ بدلتی ہے۔ اس سے اس وقت پریشانی پڑتی ہے فارسی زبان کے لوگوں کو وہ فارسی کی کچھ نہ دانتا تھا۔ وہ فارسی تو یہ کہتا تھا کہ اس کی بات نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی ربط سے کام لے کر اس پر کچھ نہ سمجھتا تھا۔ اردو زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں بڑی تعداد میں پر نمایاں ہو چکی ہیں۔ مرزا غالب اور قشقاہ کی کتابوں میں در زبان درسی و زبان سنسکرت، قواعد پیش ازین آ کرشہ و ... میں درج ہیں۔ اور مرزا علی چونس وغیرہ کے ابتدائی مباحثہ میں بھی انہی سے کام لیا گیا ہے۔ پانی بعضی کتب میں درج ہے۔ سنسکرت معنی دار و سنسکرت فارسی پر تپا ہے۔ در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے گاہ و گاہ سنسکرت پریم سا و سنسکرت در زبان معنی لکھنے کے لئے در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے۔

۱۶ فارسی معنی در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے۔ ۱۷ فارسی معنی لکھنے کے لئے در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے۔ ۱۸ فارسی معنی لکھنے کے لئے در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے۔ ۱۹ فارسی معنی لکھنے کے لئے در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے۔ ۲۰ فارسی معنی لکھنے کے لئے در ہر دو زبان معنی لکھنے کے لئے۔

الف فارسی کے ابتدائی زمانے میں ان کے الفاظ سنسکرت میں بھی یہی اشد کتب مرزا غالب نے اس مشابہت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ل اور ت و ر میں و نین وغیرہ کے استبدال کی بھی مثالیں دی ہیں جو بالکل صحیح ہیں۔ پارسیوں کا جو دینی لٹریچر تھا۔ عیسوی اور انیسویں صدی میں سنسکرت میں پورب اور مینی کے پارسیوں کی کوششوں سے نمایاں ہو کر شائع ہوا۔ اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو صریح اسلامی عقائد اور اسلامی روایات کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً زشت کا معراج جنت و دوزخ کے مشاہدات، پلہ و دوزخ، اسپگل و دیگر محققین ان تحریرات کی زبان و اسلوب کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ یہ تمام تر بعد از اسلام عہد کے محو سی اعتراضات ہیں اور ان کی قدامت زیادہ سے زیادہ دسویں صدی عیسوی تک سے جانی جاسکتی ہے۔ اور وہ بھی ہر تحریر کے لئے نہیں۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸ پر)

غالب کی غیر معمولی فطری استعداد نے اس مختصر سی صحبت میں اتنا فیض حاصل کر لیا۔ کہ وہ مہر وں کے مدتِ عمر کے اکتسابات بھی اس کا منتِ بلا نہیں کر سکتے۔ صحیح تعلیم اور صحیح استعداد کے اجتماع کی یہ ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔

شاعری میں غالب کو کسی سے نکر نہ تھا۔ ملا علی القلی سے فارسی پڑھی اور اس کے اصول و قواعد سیکھے۔ لیکن شعر گوئی میں بہت انبیاض کے سوا وہ کسی کے منتِ پذیر نہ ہوئے۔

علی حشیت غالب کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کے قواعد اور تاریخ پر کامل عبور حاصل تھا۔ اسانہ کے دوادین نظم و نثر نظر سے گزر چکے تھے۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے۔ اس کے تمام ضروری حصے یاد ہو جاتے۔ سرعتِ فہم کا عالم تھا۔ کہ مشکل سے مشکل مسائل کو صرتِ سرسری طور پر دیکھ کر حل کر لیتے۔ خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ایک مرتبہ شاہ ولی اللہ محشدا کا ایک رسالہ دیکھ رہے تھے جو متنازع و معارف کے دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ ایک مقام بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت غالب آئے۔ نواب صاحب نے وہ مقام انہیں دکھایا۔

کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ کہ

شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے

فارسی زبان کے علاوہ غالب عربی خاصی جانتے تھے۔ نجوم و تصوف اور منطق و فلسفہ میں بھی کافی درجہ تھا۔

علمِ طب آگاہی کے شواہد بعض تحریرات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ طب سے بھی صاحبِ فن کی حیثیت میں آگاہ تھے۔ ایک مرتبہ نواب کلب علی خاں مرحوم فرما کر لے رام پور کا مزاج ناساز ہو گیا۔ انہیں لکھتے ہیں:-

اے مسیح زماں تو مے دانی
 بو علی کے رسد بہ تشجیعت
 مے سز و گر بگو میت بقراط
 مسہل دادی و لفرمودی
 بجنابت ارادتے کہ مراست
 کے ارسطو مثال تو دانا است
 ورفلاطون تجوانست زیاست
 بعلم آریہ گماں کہ شفاست

زبان عمل و ورشد مرض بالکل

گر گویم توئی مسیح بجاست

جہاں تسم ہی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

شعبه رفتن من نیز مسجلی از راغز و میدا بخیر و نیک آب آتش میده بودم اما طبع آن را نه بدفیت

و زنج قیض : شیر - امروز به خود ترکیبی که بر فعل مسهل شبانه مؤثر باشد بخند بعل آوری و ده -

جناب مخدوم عبدالرزاق صاحب دانش مددگار مخلصند قیاس دولت آصفیہ ۱۶ فروری

۱۵۱۔ کوئی لب کے متعلق ایک تقریر نشر کی تھی۔ اس میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب

آپ کے کتب خانہ کی ایک کتاب "ذخیرۂ دولت شاہی" کا حوالہ دیتے

ہندو مت کی مہر بھی نسبت ہے۔ نیز یہ شعر درج ہے۔

من بركة من الجبار فينا لنا عمل وليحمدنا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت کمزیر مطالعہ ہے۔

سلسلہ : سارنگدھرم و نرجس ہے لیکن فلاں چپڑا کے شریوں پر آیا ہے۔ ہذا میر خیاں بہ کہ اس جگہ

ثُمَّ : مَسْمُومٌ وَكَأَنَّ تَقْصِيرَ فِي سَبَابٍ فَإِنَّ طَرَفَ مَسْمُومٍ يَبْدَأُ

مستعدی مری سہو ہر کو کمر ویدیا تھما نہ کہ جان ایسے چاہے تھی غائب نہ چاہے تھیں اسکی نہ سامنے یہ ہے۔

جہانگیر شاہ نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ

بلائے توحید پر نگار ایں با
کسرہ خود ہے مضاف بیغطا

فن انشا نیایان ته کمر دازم یکم مطیب طهر ثقیه امام است

لیکن یہ سب کچھ اس غرض سے عرض کیا جا رہا ہے کہ غالب کے علم کا تنوع ظاہر ہو جائے۔ یہ درست ہے۔ کہ وہ طیب نہ تھے۔ اور ان کی شہرت و عظمت کا میدان دوسرا ہے۔

اسراف اور قرض ارسال "بتدوستانی" میں شائع شدہ خط کا اقتباس اوپر درج ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ تعلیم و تدریس ابتدائی حالت میں تھی جب غالب ابو ولعب فسق و فجور اور عیش و طرب میں منہمک ہو گئے۔ رندی اسراف پر منتہج ہوئی۔ اور اسراف نے انہیں قرض کا عادی بنا دیا۔ نواب علامہ الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ ہی سے قرض لینا شروع کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں :-
 بھائی (نواب امین الدین احمد خاں) والی بواہ۔ وہ کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر تمہارا اس سے قرض لیا، ادھر دے! یہی مل کو مارا۔ اور خوب چند چن سکھ کی کوٹھی جاوٹی ہر ایک کے پاس مسک مہری موج داشتہ لگاؤ پاٹوانہ مول نہ سود۔
 یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رشتہ دار بہت کافی مالی امداد دیتے تھے۔
 خود لکھتے ہیں :-

اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بائکان پھیپھی کے سراپاں ہمہ بھی خان نے کچھ دیدیا کبھی اور سے کچھ دلوادیا۔ کبھی ماں نے کچھ آکر مے بھیج دیا۔ اب میں اور ہاتھ پٹے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔

میرزا یوسف خاں غالب دہلی چلے آئے تو ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف خاں بھی آگرہ کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آئے۔ وہ غالب سے دو برس چھوٹے تھے۔ تیس برس کو عمر میں دیوانگی کا عارضہ ہوا۔ جس سے تادم مرگ کا مل اخلاقہ نہ ہوا۔

سلسلہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ اشارہ غالباً نواب احمد بخش خاں مرحوم دانی فرزند پور محمد کی طرف ہے۔

دہلی میں وہ غالب سے الگ رہتے تھے۔ ان کی صرف ایک لڑکی تھی، جس کی شادی میرزا علی بخش خاں رنجور (ابن نواب الہی بخش خاں معروف) کے صاحبزادے غلام فخر الدین خان کے ساتھ ہوئی تھی۔ غدر میں میرزا یوسف کی بیوی اور لڑکی بچوں سمیت دہلی سے بچے پور چلے گئے اور میرزا یوسف کی خبر گیری کے لئے گھر میں ایک سن رسیدہ ملازم اور ایک بڑھیا خادمہ کو چھوڑ گئے۔ غالب نے انہیں اپنے مکان پر لانے کی کوشش کی مگر نہ لاسکے۔ ”دستبنو“ میں لکھتے ہیں :

برادر کہ دو سال از من کوچک است درسی ساکی خرد بہ بار داد دیوانگی و کاریوں کی گز بہ ۔
 سی سال است کہ آن دیوانہ کم از مر مست و بے ہوش سے زید خانہ و سے از خانہ من
 جداست و کہ بیش دوری دو ہزار گام در میان۔ زن و دخترش با فرزند ان و کنیزان زندگی در
 گریختن پنداشتند و خانہ خداوند دیوانہ را با خانہ دکان پال را سباب خانہ و در بان کہن سال و کنیز
 پیر زلل بجا گزاشتند کس فرستادن و آن سہ تن دکان را بدیں جا آوردن اگر جادو و دستہ سے توانستہ
 گمان اندوہے دیگر و از بار ایں ماندہ مردی کو۔ بے دیگر است ۔

میرزا یوسف کی وفات | غدر کے دوران ہی میں میرزا یوسف کو پانچ روز بخار آیا جو ان کی موت کا بہانہ بن گیا۔ بڑھے دربان نے غالب کو یہ خبر پہنچائی۔ ”دستبنو“ میں ۹ اکتوبر کے حالات میں لکھتے ہیں اب یہ تشویش ہوئی کہ کفن دفن کا کیا انتظام کیا جائے نہ مردہ شو کا پتہ نہ گور کن کی خبر نہ بازار کھلے تھے کہ کفن کے لئے کپڑا خریدنا جائے ۔

ہندو ہیے تو اندک مردہ را بہ دریا بردہ ہر لب آب در آتش سوزاند۔ مسلمان را چہ نہ ہرہ کہ
 و سہ کس ہمپائے یک و گرد و شادوش بر رہے گز نہ چہ جائے آنکہ مردہ را نہ شہر بردن ہند
 ہمسایگان بر تر نائی من بخشودند و بہ سر انجام کار کمر بستند۔ یکے را از سپا میان پتیا پیشا پیش
 دو تن را از چاکرن من با خویش گرفتند و رفتند و تن مردہ را ششستند و مردہ سپا و کازین جانہ

ہو رہے تھے پیدہ ہو کر نماز گاہ مسجد کے پہلو سے آں کا شانہ بود زمین کنند و مردہ را در
آنجا نہادند و مخاک بہ خاک انہا شتند و برگشتند۔

دریغ آن کہ اندر درنگ سہ بیست سڑہ شادوسی سال ناشاد زیست
بہ خاک بالیس ز خشتش نہ بود بہر خاک در سر نوشتش نہ بود
خدا یا ہر ایں مردہ بخشائے کہ ناوید در زیست آسائے
سروشے بہ دجوتی او فرست

روانش بہ جادید مینو فرست

یعنی ساٹھ برس رہ حساب سنیں قمری کی زندگی ہوئی جس میں سے تیس
سال شادمانی میں گزرے اور تیس سال ناشادمانی میں بسر ہوئے۔

تاریخ وفات یوسف خاں | میرزا یوسف کا انتقال ۲۹ صفر ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۹ اکتوبر
۱۸۵۷ء کو ہوا۔ غالب نے تاریخ وفات لکھی۔

ز سال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف کہ زیستہ بہ جہاں دراز خویش بیگانہ

یکے در انجمن از من ہمے پڑو ہش کرد کشیدم آہے و گفتہ ”دریغ دیوانہ“

”دریغ دیوانہ“ کے اعداد میں سے ”آہے“ کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو تاریخ نکلتی ہے۔

یوسف خاں کی اولاد | یوسف خاں کی صاحبزادی کے چار بچے تھے ان کے شوہر

غلام فخر الدین خاں غدر سے قبل بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے۔ اور

بادشاہ کی ہدایات کے مطابق غدر کے دنوں میں بھی روپیہ دیتے رہے تھے۔ اس بنا پر

ان کے خلاف مقدمہ بنا لیکن انجام کار وہ بری ہو گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد چلے گئے۔

دہاں ان کے لئے دو سو روپے ماہوار کی رقم بہ طور منصب مقرر ہو گئی۔ غلام فخر الدین

خاں کے صاحبزادے میرزا محمد سعید خاں تھے جنہوں نے ابتدا میں ملازمت اختیار کی مگر

بعد میں درویش بن گئے، اور بائیس برس گوشہ نشینی اور یاد الہی میں بسر کر دیئے۔ وہ بعد وفات

محلہ مستعد پورہ حیدر آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے میرزا غلام احمد خاں بیڑا والہ
 اس وقت حیدر آباد میں صدر محاسبی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہیں۔
 بھتیجی کی پرورش کا اضطراب | غالب کو اپنی بھتیجی اور اس کے بچوں کی پرورش کا بڑا خیال
 تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی اس کے چارہ پئے۔ اس کی ماں، میری بھانج
 بچے پور میں پڑے ہوئے ہیں اس تین برس میں یعنی قدر کے بعد ایک روپیہ ان کو نہیں
 بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی چاہتا۔

غلام فخر الدین کے مقدمے کے دوران میں بھی غالب بڑے مضطرب تھے
 اور جب انہوں نے ریلوئی پائی تو اتنے خوش ہوئے کہ اسے غلام فخر الدین کی نئی
 زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

تیسرا باب

شادی، خانگی زندگی اور متعلقین

بکاشی تختے از کاشانہ یاد آر وریں جنت از اں ویرانہ یاد آر
دریغدار وطن و اماندہ چند بخون دیدہ ز ورق راندہ چند
ہوس را پلے در دامن شکستہ

با امید تو چشم از خویش بستہ

شادی | غالب کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ء کو بھٹک تیرہ برس کی عمر میں نواب
الہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ نواب علاؤ الدین
احمد خاں کے جس مکتوب میں وہ اپنی حیات مستعار کو عالم ارواح کی گناہ گاری کی
سزا پڑھتے ہیں، اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

۸ رجب ۱۲۱۲ء کو بہ نور بکاری کے واسطے یہاں بھیجا یعنی کتم عدم سے معرض وجود میں آیا
تیرہ برس حیات جس پر ۷ رجب ۱۲۲۵ء کو میرے واسطے حکم دوام جس صادر ہوا۔ ایک
بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال
دیا ظم و سر کو مشقت ٹھہرایا۔

ظاہر ہے کہ اس خط میں ”حکم دوام جس“ سے مراد شادی اور ”بیڑی“ سے

مراد بیوی ہے۔

ہرگوپال تفتہ نے اپنے اور غالب کے مشترک دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی اطلاع دی تھی۔ اس کے جواب میں ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

امراؤ سنگھ کے دل پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اور پر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پروا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔

قمری حساب کے مطابق یہ خط ۱۲۷۶ھ میں لکھا گیا۔ ۱۲۷۶ھ میں سکا کاون نکال دیئے جائیں تو ۱۲۲۵ھ رہ جاتے ہیں۔ گویا اس مکتوب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی شادی ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔

غالب کے خسر ان کے خسر نواب الہی بخش خاں معروف تھے جو فخرالدولہ لاہور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والی فیروز پور جبرکہ ورمیس بومارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر گرو شہ نشینی اور عبادت گزاری میں بسر کی۔ نواب احمد بخش خاں اگرچہ عمر میں بڑے تھے مگر چھوٹے بھائی کے زہد و اتقا کے باعث ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ معروف اچھے شاعر تھے۔ شاہ نصیر دہوی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان مولینا عبدالحامد قادری بدایونی کی کوشش سے شائع ہوا ہے۔ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں دہلی سے عالم لقا ہوئے اور خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے پاس اس احاطہ میں دفن ہوئے جہاں بعد میں غالب سپردِ خاک ہوئے۔ مولینا محمد حسین آزاد نے استاد پرستی کے جوش میں معروف کے کمالات کو بھی ذوق کی تراوش طبع کا نتیجہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ دعوے بالکل بے اصل ہے۔

معروف کی اولاد معروف کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیس صرف ایک بیٹے میرزا علی بخش رنجور کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہیں۔ دوسرے

کا صرف نام معلوم ہے یعنی علی نواز خاں۔ بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بنیادی بیگم تھا جن کی شادی نواب غلام حسین خاں مستور سے ہوئی۔ چھوٹی کا نام امراؤ بیگم تھا۔ جو غالب کی رفیقہ حیات تھیں۔

امراؤ بیگم کی عمر امراؤ بیگم غالب سے دو برس چھوٹی تھیں جیسا کہ خود غالب کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ قدر سے دو تین برس بعد دہلی میں ہیفنہ کی وبا پھیل گئی تھی۔ میر ہمدی مجروح نے جو اس زمانے میں غالباً الوری میں تھے۔ وبا کی کیفیت پر بھی فرماتے ہیں:-

وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھپا سٹھ برس کا مرد غالب،
اور ایک پونسٹھ برس کی عورت (بیگم غالب) ان دونوں میں سے ایک بھی مرنے تو ہم
جانتے کہ وبا تھی۔ نفہ بریں وبا!

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت امراؤ بیگم کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ گویا ان کا سن ولادت ۱۲۱۲ھ سمجھنا چاہیے۔

علی بخش خاں رنجور علی بخش خاں رنجور غالب سے چار برس چھوٹے تھے۔
جیسا کہ خود غالب لکھتے ہیں:-

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا۔ اب کہ جب
کے پینے سے، نہ تروں برس شروع ہوئے۔ ان نے علی بخش خاں نے چھپا سٹھ برس کی عمر پائی۔
آب کے ساتھ ملی بخش خاں کے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے۔ انہوں
نے جب کلکتہ جا کر اپنی پنشن کے سلسلے میں چارہ جوتی کی تھی تو علی بخش خاں خاص

سے نواب غلام حسین خاں مستور سہراب جنگ ابن فیض اللہ بیگ خاں سہراب جنگ ابن شرف الدلہ
قاسم جان -

ہمرازمعاون تھے۔ اس باب میں غالب نے انہیں کلکتہ سے جو خط لکھے ان کا مفصل ذکر پنشن کے سلسلے میں آئے گا۔ فارسی نثر کی مشہور کتاب ”پنج آہنگ“ علی بخش خاں ہی کے ایما پر لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ اس کے دیباچہ سے ظاہر ہے۔ تفصیلات غالب کی تصانیف کے باب میں پیش کی جائیں گی۔

کلکتہ جاتے ہوئے غالب کو راستے میں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی اطلاع ملی تو سب سے پہلے علی بخش خاں ہی کی پریشانیوں کا خیال آیا۔ چنانچہ خسان موصوف کو لکھتے ہیں:-

از جانب شہانہ شیشہ ناکم دو انکم کہ آنچہ شمایا پیش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں راز و نہ بازار
خواہد بود۔ ہوشمندی را کار باید بست و ہوارہ بہ خود نگراں باید بود۔

علی بخش خاں کو فیروز پور جھڑک سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد یہ وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ دہلی سے نکل کر پہلے لکھنؤ میں رہے پھر جے پور چلے گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد پہنچ گئے جب نواب شمس الدین احمد خاں ولیم فریر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی پا گئے اور ان کی ریاست ضبط ہو گئی تو سرکار انگریزی نے علی بخش خاں کے لئے سو روپے کے بجائے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کر دیا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو انہوں نے دہلی میں وفات پائی اور غالب اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ غالب یکم جنوری کے خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-
بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات کو بارہ بجے پر دو بجے مر گئے۔ انا، اللہ وانا الیہ راجعون

تمہارے علم نامدار (نواب نصیاء الدین احمد خاں نیر) آج دن کے بارہ بجے (تدفین کے لئے)
مدفنان جی گئے ہیں۔ میں نہ جامہ کا تکیہ بیز و تکفین ان کی طرف سے (نواب نصیاء الدین احمد خاں
کی طرف سے) عمل میں آئے گی۔

علی بخش خاں کو سخن طرازی کا بڑا شوق تھا اور بعض اوقات وہ اپنے متعلق غلط
دعاوی میں بھی تکلیف نہیں کرتے تھے۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:
اکبر آباد میں (علی بخش خاں) میوہ صاحب سے ملے، ان کا کلمت میں کہنے لگے کہ میں چپا بس
(نواب احمد بخش خاں) کے ساتھ جرنیل لارڈ لیک صاحب کے شہر میں موجود تھا اور ہلکے
سے جو محاربات ہوئے ہیں۔ ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی بوقت ہے اور نہ قبائلی پیر بن اٹا۔
گردکھاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جابجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ (میوہ صاحب)
ایک بیدار خزانہ دیدہ ورامی تھے۔ ان کو (علی بخش خاں) کو دیکھ کر کہنے لگے: "نواب صاحب!
ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل کے وقت میں چارہ پانچ برس کے ہو گئے یہ سن کر
آپ نے (علی بخش خاں) نے کہا کہ درست و سجاوار شاد ہوتا ہے۔ خدائش بیا مرزا دوبہ
ایں درد غم لے لے تک لکیرا۔"

خاندان لوہارو | لوہارو کا خاندان چونکہ قرابت داری اور روابط خصوصی کے باعث
غالب کا اپنا خاندان بن گیا تھا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار
کے ساتھ اس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں سمرقند سے تین توراتی بھائی پنجاب آئے۔
قاسم جان، عالم جان، عارف جان۔

قاسم جان بڑے تھے۔ نواب معین الملک عرف میر منو ناظم پنجاب نے
ان کی قدردانی کی اور اپنی رفاقت میں رکھ لیا۔ وہیں نظیر بیگ خاں ہزارہ
کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی اور سندھ میں جاگیر ملی میر منو کے انتقال کے بعد

نظامت پنجاب کا کارخانہ وہیم برہم ہوا تو قاسم جان پانچسو توراتی سواروں کی جمعیت
لے کر لاہور سے نکلے۔ کہ کسی دوسری جگہ قسمت آزمائی کریں۔ اس زمانے میں شہزادہ
عالمی گوہر (جو بعد کو شاہ عالم ہوئے) بہار میں تھے۔ اور نظامت بنگال کی فوج کلائیو
کے ماتحت راہ۔ وہ کے کھڑی تھی۔ قاسم جان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وہیں کا قصد کیا
اور پٹنہ کے قریب پہنچتے ہی میرن (میر جعفر کے لڑکے) کے ایک دستہ پر حملہ کر کے تمام سامان
اور رسد کا ذخیرہ چھین لیا۔ شہزادہ کو یہ کارگزاری اور جو افراد نہ ہمت بہت پسند
آئی۔ شرف الدولہ کا خطاب دیا اور اپنے رفتار خاص میں داخل کر دیا۔

اس کے بعد بادشاہ (عالمگیر ثانی) کا نسل، لکھنؤ میں شہزادہ کی تخت نشینی
انگریزوں کا تقرب، دیوانی کی تفویض، آباد کی اقامت وغیرہ معاملات یکے بعد دیگرے
پیش آئے۔ اور ان سب میں شرف الدولہ وکیل و مشیر رہے۔ پھر جب شاہ عالم
ہلی آئے۔ تو جاٹوں کے دشمن و اتران کی مہم بھی انہی کے سپرد ہوئی اور توراتیوں کی
جائفتاشی سے اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ میرزا نجف خاں کے بخشی فوج مقرر
ہونے کا معاملہ بھی انہی کے حوالہ پر یہ سب انجام پایا۔

نجف خاں کے انتقال کے بعد سب غلام قادر خاں کا تسلط ہوا تو ہلی کے بچے بچائے
امرا اور اہل ہر منتشر ہو گئے۔ معلوم ہے کہ اس زمانے میں شرف الدولہ کو بھی دہلی سے
نکلنا پڑا۔ اور لکھنؤ چلے گئے۔ یہ آصف الدولہ کا عہد تھا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

نقشبندی عبد الکاظم تحفۃ الاحساب ہیں شرف الدولہ کے پوتے معین الدین حسین خاں
کی زبانی لکھتے ہیں۔ شرف الدولہ میرزا قاسم جان بخارا کے رہنے والے تھے۔ وہاں

سلسلہ تحفۃ الاحساب تاج پنجاب کے متعلق ایک مختصر اور مفید زبان میں ہے۔ جسے عبد الکاظم میر ثانی
نقشبندی نے لکھا۔ اگر وہ شرف الدولہ کو شائع کیا۔ اس میں سکھوں اور انگریزوں کی دونوں لاپرواہیوں
کے حالات بخاروں سے لے کر جمع کر دیئے گئے ہیں۔

سے سمرقند پہنچے اس جگہ کے حاکم کی رفاقت میں رہنے لگے۔ اور اس درجہ مقبول و
تحصیل ہوئے کہ ریاست کی مدارالہمامی ان کے سپرد ہو گئی پھر جب حاکم سمرقند کا چانک
انتقال ہو گیا تو شرف الدولہ نے وہاں رہنا پسند نہ کیا اور سید سے ہندوستان چلے آئے
اس وقت ان کے پاس اسباب و متاع کے علاوہ تیرہ ہزار نقد اشرفیاں تھیں۔ وہلی ہیں
بلیماراں کے پاس قاسم جان کی کھی مشہور ہے۔ یہ انہی شرف الدولہ میرزا قاسم جان
کے نام سے موسوم ہے۔ حالہ جان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

عارف جان | عارف جان کے چار بیٹے تھے جن میں سے دو بہت مشہور ہیں :- اول
نواب احمد بخش خاں دوم نواب الہی بخش خاں معروف :- احمد بخش خاں دور آخر کے
نہایت جلیل القدر فرد اور بڑے علے درجے کے جزیل تھے۔ اگر یہ کہہ جائے
کہ موجودہ ریاست اور کی نائیس احمد بخش خاں ہی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ تو یہ مبالغہ نہ
ہوگا۔ نواب موصوف نے لارڈ لیک کی معیت میں بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں
جن کی بناء پر انہیں علاقہ میرات میں فیروز پور جھڑ کی ریاست مل گئی۔ لوہارو کا پرگنہ
انہوں نے خود خرید لیا۔ یا ایک روایت کے مطابق والی اور نے حسن خدمات کے
اعتراف میں انہیں دے دیا۔

خواصوں کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں۔ ایک میواتی الاصل
جس کا نام مدی بیگم عرف بہو نام تھا۔ اس کے بطن سے بڑے صاحبزادے
شمس الدین احمد خاں نئے۔ ان کے ایک بیٹائی اور غالباً بہنیں بھی تھیں۔ دوسری
بیگم جس کے بطن سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب خیار الدین احمد خاں پیدا
ہوئے۔ نواب کی ہم قوم تھی۔ اور اس کا نام بیگم جان تھا۔

نواب نے ۱۸۲۲ء میں بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین
قرار دیا۔ وہ چونکہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے۔ اس لئے تانہ ان کے دوسرے افراد

جن میں غالب بھی شامل تھے، انہیں نیا اپنا ہم پایہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس طرح خاندان میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ شمس الدین احمد خاں ایک طرف تھے۔ اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا۔ غالباً اسی کشیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے نواب احمد بخش خاں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ دونوں چھوٹے رٹکوں کو لوہارو کی جاگیر مستقل طور پر دے دیں۔ اور بقیہ افراد خاندان کی نشستیں فیروز پور جبرکہ سے متعلق کر دیں۔ غرض انہوں نے شمس الدین احمد خاں سے ایک اقرار نامہ لیا، جو لوہارو کی جاگیر سے دست برداری پر مشتمل تھا۔ ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جبرکہ کی مسند شمس الدین احمد خاں کے حوالے کی۔ لوہارو میں الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو سونپا۔ اور خود اپنی خاندانی جوبلی (واقعہ قطب صاحب) میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔ اور اپنے پیرو مرشد مولانا فخر الدین اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

۱۷ مولانا فخر الدین فخر عالم دہلوی خرمیل اللہ راویا، ان سے تھے۔ آپ کا سلسلہ سجت خرم، بدکلم اللہ، بیان آبادی سے ملتا ہے۔ بہادر شاہ کے پیر شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں مولانا فخر عالم کے پوتے تھے۔ نواب احمد بخش خاں اور نواب الہی بخش خاں معروف مولانا کے بڑے محقق تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ریاست ملنے اور نواب بننے سے فیروز بخش ایک روز مولانا کے پاؤں داب سے تھے۔ حضرت نے فرمایا: "نواب صاحب! بس کیجئے! احمد بخش خاں، سن تلمب پر حیران ہوئے اس نے کوہ نواب نہ نیچے۔ لیکن چند روز کے بعد اس پر ریاست مل گئی۔

خواجہ نور محمد لوہارو والے آپ ہی کے خلیفہ تھے۔ خواجہ سلیمان تونسوی بھی اس سلسلہ فیض دہلوی کا ایک شاگرد تھے۔

۱۸ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں: میرزا غالب اور نواب احمد بخش خاں کے خاندانوں کا خاں ہر اعتبار سے اس درجہ اشیا و متشکر کوائف پر مبنی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں پہلے سے باہمی رفاقت اور اتحاد حالات کوائف کا رشتہ موجود تھا۔ دونوں سمرقند سے نکلے اور لاہور آئے۔ دونوں کا ابتدائی قیام لاہور میں ہوا۔ دونوں دہلی آئے۔ دونوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ دونوں کا تعلق آصف الدولہ سے رہا۔ دونوں ہمیشہ تھے۔ اور دونوں اس زمانے کے فری لانسرز کی طرح قسمت آزمائی میں سیر و رفس کرتے رہے۔ دونوں کے ترک وطن اور وطن ہند کا زمانہ ایک ہی ہے۔ غالباً فاسم جان اور مرزا و صاحب کے موت اعلیٰ ایک ہی قبیلہ کے افراد تھے۔ اور باہم رفاقت میں سمرقند کے تھے۔ بعد میں دونوں خاندانوں میں جو رشتہ داریاں ہوئیں۔ ان سے بھی بنیادی قرب و تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴ پر)

نواب احمد بخش خاں کے غائب کی پیشین گوئی کا جھگڑا نواب احمد بخش خاں کی زندگی ہی میں
 صاحبزادوں میں کشمکش شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بقیہ نامہ افغانی مناقشات ان کی وفات کے
 بعد رونما ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ لوہارو کا پرگنہ میرے حوالے
 کیا جائے۔ اور بھائیوں کی پیشین گوئیوں کے برخلاف میں نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ نواب مرحوم کے
 ترکہ میں جو نقد پائے پیش بہ اجوا برائے اور دوسری چیزیں تبتیان میں سے بھی حصہ ملنا چاہیے۔

آخر یہ جھگڑا وہی کے انگریز ریڈنٹ کے پاس پہنچا جس نے گورنر جنرل کے پاس
 رپورٹ پیش کی۔ وہاں سے ریڈنٹ کو فیصلے کا مختار بنا دیا گیا۔ اس نے ۲۵ مارچ ۱۸۶۲ء
 کو یہ سفارش کی کہ لوہارو اور احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو مل جائے۔ اور
 شمس الدین احمد خاں کو اس بارہا غارت گری میں حاصل نہ رہے۔ جاگیر کے مصارف
 انتظام و تحصیل کے لیے جو پچھونچہ اس کا تھوڑا سا ضیاء الدین احمد خاں کی نالائقی کے
 زمانے میں ان کے نام سرکار کو خراج میں جمع ہوتا ہے۔ جب وہ بالغ ہو جائیں۔ تو
 لوہارو کا پرگنہ دونوں بھائیوں میں بے حد مساوی تقسیم ہو جائے۔

یہ فیصلہ طرفین کو سنا یا گیا۔ تینوں بھائیوں نے اسے منظور کر لیا۔ اور ۲۱ اگست ۱۸۶۸ء
 کو ریڈنٹ نے اسے بغرض منظوری اور تصدیق حکومت ہند نے اس سے اتفاق کیا
 لیکن اپنی طرف سے تریز پیش کر دی کہ لوہارو کو تقسیم کرنا مناسب نہیں اگر امین الدین احمد خاں
 اور ضیاء الدین احمد خاں راضی ہو جائیں تو ہمیں جاگیر کی آمدنی کے برابر دفعہ مصارف
 انتظام (قدر و پیرسار بہ مال و بایا) اور جاگیر کا انتظام شمس الدین احمد خاں کو دیا جائے

دلیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۶۸ء کے یہ بات کو یہ نہیں آتی کہ میرا صاحب اس بات سے کیوں خاموش رہا کیوں نہ
 اپنے دادا اور شرف الدود کے باہمی تعلق و فائق کے حالات نمایاں نہیں تھے۔ اس نے نواب امیر الدین مرحوم دوالی
 کو اس سے ایک بار اس کا تذکرہ کیا تھا، انہوں نے شرف الدود کو میرا صاحب کے دادا کی بات ہی رفاقت اور باہم رزق
 وطن کو تو ذہن قیاس تسلیم کیا۔ لیکن اور کچھ نہ بتا سکے۔

اس طرح ایک ٹے شدہ معاملہ دوبارہ معرض کشمکش میں پڑ گیا اور شمس الدین احمد خاں جو لوہارو کو بجائیوں کے سپرد کرنے پر راضی ہو چکے تھے، حکومت ہند کی اس تجویز کے بعد پھر اپنے پہلے مطالبے پر چمب گئے۔

یہ جھگڑا جاری تھا کہ رینڈینٹ بدل گیا۔ نئے رینڈینٹ نے حکومت کی تجویز کے مطابق ۹ نومبر ۱۸۳۱ء کو لوہارو شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دیا اس سلسلے میں دوسری وجہ کے علاوہ ایک وجہ پیش کی جو شمس الدین احمد خاں نے چھائی ہوئی کہ امین الدین احمد خاں نے چھوڑ دی تھی کہ وہ یہ خرانے میں داخل نہیں کیا۔ حالانکہ اس باب میں اعتراض کا حق رینڈینٹ یا شمس الدین احمد خاں کو تھا۔ بلکہ صرف نصیباء الدین احمد خاں کو تھا۔ کیونکہ صرف وہ کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

اس ضمن میں رینڈینٹ نے جاگیر کی آمدنی کا جو فیصلہ کیا ۵۰۰۰ روپے سراسر نادرست تھا یعنی کل آمدنی ۱۰ تنجینہ پچیس ہزار کر کے پندرہ ہزار آٹھ سو روپے کر کے اور صرف دس ہزار کی بچت دکھائی۔ گویا امین الدین احمد خاں اور نصیباء الدین احمد خاں صرف دس ہزار کے حقدار قرار پائے۔

اس پر امین الدین احمد خاں اور نصیباء الدین احمد خاں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کہ کائنات کاروں کی سرکشی کے باعث پورا مال بید وصول نہیں ہوا۔ لہذا حقیقی آمدنی کی تشخیص صحیح نہیں۔ نیز لوہارو کو ہم سے چھینا ہی منظور ہے تو شمس الدین احمد خاں کے حوالے کرنے کے بارے میں سرکار انگریزوں نے اپنی تجویزیں دیں۔ اور ہمارے فیصلے مقرر کر دیے۔ میرا خیال ہے کہ کائنات کاروں کی سرکشی شمس الدین احمد خاں کی انجنت کا نتیجہ تھی۔

اس پہلی تجویز سرائے درو کوں بڑے۔ پیشانی تھی۔ کی جڈ فرانسس کننگھم رینڈینٹ بن کر آئے تو ان کے اخراجات فرانسس کننگھم نے ایک جڈ کی ہم جڈ اس میں کننگھم باوا اور پور شمس الدین احمد خاں پر بیان سے ظاہر ہے کہ ہمارے باوا کل دست تھے۔ ہمارے ہمارے تعلق جو فیصلہ کیا وہی ہے۔ امین الدین احمد خاں کی مرضی کے مطابق تھا اور پیش کے متعلق غالب کے دعوے کے باب میں جو رپورٹ پیش کی وہ بھی شمس الدین احمد خاں کے حق میں تھی۔

جو اس طریق سے لوہارو کی آمدنی کو کم ظاہر کرنے کے درپے تھا۔ کہ بھائیوں کے حصے کی رقم زیادہ سے زیادہ گھٹ جائے۔

حکومت نے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ لوہارو کو پرنسٹل اسسٹنٹ ریونیو حصار کے حوالے کر دیا جائے۔ اور مصارف انتظام وضع کرنے کے بعد تقیہ روپیہ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملتا ہے پھر شمس الدین احمد خاں کے اصرار پر لوہارو ان کے حوالے کر دیا۔

ولیم فریزر کا زمانہ ۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دہلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے۔ وہ ۱۸۰۵ء

میں دہلی میں ڈیوڈ اگٹر لونی کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ احمد بخش خاں کے نہایت گہرے دوست تھے۔ اور نواب مرحوم کے صاحبزادے انہیں ”چچا“ کہتے تھے بھائیوں کی کشمکش جاری تھی۔ فریزر صاحب نے تجویز پیش کی کہ نواب احمد بخش خاں کی تقسیم کے مطابق لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملنا چاہیے۔ اگر امین الدین احمد خاں بھائی کے حصے کا روپیہ دہلی کے خزانے میں جمع نہیں کرایا۔ تو اس پر اعتراض کا حق۔ یاد الدین احمد خاں کو ہے۔ جب اصل حقدار اس صورت حالات پر مطمئن ہے تو شمس الدین احمد خاں کے اعتراض کو کس بنا پر سمجھا جاسکتا ہے؟

صاحب نے یہ بھی لکھا کہ لوہارو کی آمدنی فی الحال چالیس ہزار ہے لیکن مزید اصلاح کے بعد توقع ہے کہ یہ ساٹھ ہزار ہو جائیگی۔ لہذا جاگیر کو ایک مقررہ رقم پرنسٹل امین الدین احمد خاں کے حوالے کر دینے سے چھوٹے بھائیوں کے حقوق کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن یہ تجویز منظور نہ ہوئی اور غالباً فریزر ہی کے مشورے کے مطابق امین الدین احمد خاں اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے نہ ہلکتے گئے۔ اس سفر کیلئے یہ بات بھی غور کی کہ سرپارس مشکات اس زمانے میں سو پریم کونسل کے ممبر تھے۔ وہ امین الدین احمد خاں کے خاندانی حالات واقف تھے۔ اور ان کے ذریعے سے مددکاری کی پوری امید تھی۔

۱۸۰۵ء ولیم فریزر ایک مرتبہ ۱۸۳۳ء میں تھوڑی سی مدت کے لئے ریڈینٹ رہے۔ اس کے بعد ریڈینٹ سی ایف سی

بن گئی۔ اور وہ ۱۸۳۲ء سے لے کر قتل تک ایجنٹ رہے۔

شمس الدین احمد خاں کلکتہ پہنچ کر امین الدین احمد خاں نے تمام معاملات حکام والا کے گوش گزار
کئے تو فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مقدمہ کے

دو گروں ہو جانے کی رپورٹ کلکتہ سے شمس الدین احمد خاں کے پاس پہنچی تو وہ مصاحبوں
کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سوچ میں پڑ گئے۔
کریم خاں نامی ایک روہیلہ سوار بہت مٹھ لگا تھا۔ بے تکلف بول اٹھا: سوچ میں کیوں
پڑ گئے ہیں۔ اور کھانا کس نے ٹھنڈا کر رہا ہے؟ نواب کے خلاف معمول خفا کی سبب جواب دیا
کریم خاں نے حالات معلوم کئے بغیر کہہ دیا کہ اگر دشمن سے آزار پہنچا ہے تو میں اس کا خاتمہ
کر دوں گا۔ شمس الدین احمد خاں بوسے بد شکم پرست لوگ یوں ہی باتیں بنایا کرتے ہیں۔
کریم خاں نے کہا: نواب صاحب! میں پٹمان ہوں، میرے ساتھ دوسروں کی طرح
طعن آمیز گفتگو نہ کیجئے۔ نواب خاموش رہا۔ کریم خاں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا
جہاں نواب کا دیوان اور ایک خدمت گزار (ایامیو) بیٹھے تھے۔ ان سے نواب کی
غیر معمولی پریشانی کا سبب معلوم ہوا۔

فریزر کا قتل کریم خاں اسی وقت "انیا" کو ساتھ کر فریزر پور چمک سے دہلی روانہ ہو گیا
تاکہ ولیم فریزر کا خاتمہ کر دے جو لوہارو کو شمس الدین احمد خاں سے چھینوانے کا حقیقی موجب تھا۔
بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کلکتہ سے فیصلے کی اطلاع پاتے ہی نواب نے خود فریزر کے قتل کی سکیم تیار
کر کے کریم خاں اور انیا کو دہلی بھیجا کہ ایجنٹ کو تنہا پاتے ہی قتل کر ڈالیں۔ وہ دونوں دہلی میں
تین ماہ تک فریزر کے پیچھے لگے رہے۔ لیکن وار کا موقع نہ ملا۔ آخر ناکام واپس چلے گئے۔ شمس الدین
احمد خاں اس ناکامی پر بہت خفا ہوئے تو دونوں دوبارہ دہلی پہنچے۔ کریم خاں نے ایک ہندو قریبی

۱۲۵ یہ واقعات مجھے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے معلوم ہوئے جن میں سے نواب امیر الدین احمد خاں مرحوم سابق
فرمانروائے لوہارو بلور خاص قابل ذکر ہیں۔

اس کی نالی چھوٹی کرائی تاکہ اسے بہ آسانی چھپایا جاسکے۔ دو ماہ تک فریڈرک کا تعاقب جاری رہا۔ لیکن حملے کا موقع نہ ملا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کی شب کو ایک جگہ صاحب کی دعوت پر تھی۔ جس سے فارغ ہو کر گھر واپس جا رہا تھا۔ کریم خاں نے راستے میں گولی مار کر کامیاب کر دیا۔ وہ خود بھی تنگابلیکین ٹھہرتے باہر نہ پاسکا۔

قتل کی اس سزا سننے ہی ٹھہر کے دروازے بند کر دینے لگے، اور قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ کریم خاں اور انیسے ہندوؤں، ایک کنوئیں میں چھپ چکے تھے۔ باقی سارے نشانات جو داخل کر ڈالے۔ نواب کی عزت سے اس دور میں جتنے نہ آتے تھے۔ وہ سب جلا ڈالے۔ چند روز کے بعد کریم خاں نے انیا کو تمام حالات کے متعلق ایک مفصل خط دیکر نواب کے پاس بھیجا۔ وہ کارگزاری کی تفصیلات سن کر بہت خوش ہوئے۔ انیا نواب سے مل کر بارگاہی رہا تھا۔ کہ کریم خاں کے ایک قریبی رشتہ دار نے رائے دی۔ کہ انیا جیسے فرومایہ آدمی کو جو تمام رازوں سے آگاہ ہے، زندہ چھوڑنا خلاف احتیاط ہے۔ اس کا بھی خاتمہ کر دینا چاہیے۔ انیا یہ بات سننے ہی فیروز پھر کہ سے بھاگ کر اپنے گھر پہنچا۔ پھر مختلف جہوں میں چھپتا چھپاتا اور جان بچاتا ہوا پڑھے آگرہ بعد ازاں بریلی چلا گیا۔ اس اثنا میں کریم خاں بعض شبہات کی بناء پر پکڑا گیا۔ اس کا سراغ مل جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شمس الدین احمد خاں اور درپڑ کی عداوت کا ہر شخص کو علم تھا۔ عام رائے یہی تھی کہ فریڈرک کا قتل شمس الدین احمد خاں کی انگلیخت پر ہوا ہے۔ اور اس کا ذمہ دار نواب ہی کا ملازم ہو گا۔ بد قسمتی یہ کہ جس کنوئیں میں ہندوؤں چھپ چکے تھے۔ اسی میں ایک شخص کا لوٹا گر گیا۔ اس نے ستھوں سے کھدوٹا نکھڑانا چاہا، تو ہندو قاتل نکل آئی۔ اور کریم خاں پر قتل کا جرم ثابت ہو گیا۔

معدلہ کا سہارا کیونکر ملے گا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نواب خلیفہ فرزانہ صاحب کی زبانی
بیان فرماتے ہیں۔۔۔

جب فرہاد کی لاش دیوان خانہ میں رکھی گئی۔ موصوفہ شہزادہ شہزادہ ویاں پہنچے تو اس نے اللہ
بیمہ نال بھی کہہ کر فرہاد کی لاش کو دیکھا۔ اس پر سر سے ایک خنجر اتر کر پڑا۔
اس نے یہ دیکھ کر کہ نہ جبر۔ نہ زور۔ نہ دھمکاؤں کی وجہ سے فرہاد کی لاش گری کرنا
چاہا مگر سود مند نہ ہوا۔

باسور تختہ سمندر کے بیان سے مراد یہ ہوتا ہے کہ معدلہ کا بنیادی سرائے جان لائس
بعد ازاں لاہور۔ درختیش و گمراہی سے بابت آیا تھا۔ اس زمانے میں پانی پت
میں مجسٹریٹ کے قید خانہ پر قائم کر کے رکھا۔ وہ ولیم فرہاد کے گھر سے دوست تھے
اور مل کی اصلاح پانے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر جلد سے جلد دہلی پہنچ گئے تھے۔
دہلی میں اس وقت دو بڑے انگریز فسر تھے۔ ولیم فرہاد کے بھائی سیمن فرہاد
اور اس کے مٹا کاٹ۔ اس اندین احمد خاں کے متعلق فتح اللہ علی خان کی زبان سے
جو الفاظ بے خدیا تھے۔ انہیں انامس منکاف نے تو اس وجہ سے چند اں
اہمیت نہ دی کہ فتح اللہ علی خان اور شمس الدین احمد خاں کی دشمنی کا خاص و عام کو علم تھا۔
لیکن جان لائس کے وہاں بیٹا لاہور سے ہو گئے اور انہوں نے اسی بہانہ پر تحقیقات

معدلہ نواب خلیفہ فرزانہ صاحب فرزانہ نواب صاحبہ الدین احمد خاں
سے فتح اللہ علی خان کی لاش کے بارے میں شرف الہ و قاسم جاس جیسے لارڈ لائس کے سوانح نگار باسور تختہ سمندر
نے فتح اللہ علی خان سے یہ شمس الدین احمد خاں کی دشمنی کا علم تھا کہ جانا ہے۔ کہ دونوں کے درمیان رنجش کی ابتدا
ایک گھوڑے کے متعلق ہوئی تھی۔ اس سے بعد دونوں نے ہاتھ پائی لگائی۔

سکھ لائیٹ آف لارڈ لائس مصنفہ باسور تختہ سمندر عبد اول صفحہ (۴۴-۴۵)

نہ نہ کر دی۔ جاگیر لوٹا دے۔ آتش و تہمت کے بارے میں ولیم فریئر اور شمس الدین احمد خاں کے اختلاف کا واقعہ سن کر شبہ اور بھی قوی ہو گیا۔ چنانچہ جان لانس سیمن فریئر کے ساتھ تلاش کے لیے اسے تہمتیں لادیں۔ احمد خاں کے دلی والے مکان پر پہنچے۔ فریئر تو مکان کے اندر داخل ہو گئے، لیکن لانس صحن ہی میں رہے۔ وہاں ایک سڑنگ گھوڑا بندھا ہوا تھا جو بڑا ہر تندہرست معلوم ہوتا تھا لیکن اردلی نے اسے بیمار ظاہر کیا۔ لانس کی نظر اس کے سموں پر پڑی تو نعلوں کی میخیں خلاف معمول معلوم ہوئیں۔ اس پر دفعۃً یاد آ گیا کہ انگلستان کی روایات قدیمہ کا ایک ڈاکو ڈک ٹرین اپنے گھوڑے کے نعل اٹے لگوا کر تاکتا تھا تاکہ لوٹ مار کے بعد اس کا سراغ نہ مل سکے۔ پھر دیکھا کہ گھوڑے کے پاس ہی زمین کے نیچے دالے کا تو بڑا پڑا ہے۔ اسے اٹھا کر گھوڑے کے منہ کو لگا دیا تو وہ تندہرست جی نوروزوں کی طرح دانتوں سے مر مر ہوا ساؤں نے گھوڑے کے منہ کی میخیں کیسے بتا دیا کہ یہی گھوڑا تھا جس پر ولیم فریئر کا قاتل سوار ہو کر بھاگا تھا۔

سیمن فریئر کو پانی کے ایک ڈول سے کاغذ کے پتہ پر زسے مل گئے جن کی سیاہی دھل چکی تھی۔ سیمن اسے باؤ کی جڑا دے۔ اس سے حروف روشن ہو گئے۔ ان پر زروں کو جوڑا لیا تو فریئر کی زبانیں یہ عبارت تھی:

محبوب جنت ہو کہیں نہ کہیں دہلی میں غریب بھی ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ یہ ہے بے گتے

غریب کس قدر ضروری ہے۔ محبوب تک کہتے نہیں خریدے تو بدتر قف یہ کام انجام دے دو۔

ان عبارت سے سمجھ گیا کہ "کتوں کی خرید" کا اشارہ ولیم فریئر کے قتل کی طرف

ہے۔ اس بنا پر لانس کے ملازم کو جس کا نام باسور محمد سمٹھ لے کے وسائل خزانہ

میں سے سوار کر کے لڑائی میں لایا۔ اس کا نام کریم خان تھا۔

وہاں پہنچ کر لانس نے دیکھا کہ وہاں ایک جگہ بچتے ہیں۔ فریئر کی سیوا کرتے ہیں۔

پھر لانس کو فریئر کی قبر پر لے کر گئے۔ وہاں لانس نے فریئر کی قبر دیکھی۔

بتایا ہے گرفتار کر لیا گیا اور نواب کو پیغام بھیج کر دہلی بلایا گیا۔

شمس الدین احمد خاں | نواب امیر الدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ جب دہلی سے
آ کر فستاری | شمس الدین احمد خاں کی طلبی ہوئی اور معلوم ہوا کہ ان کے خلاف

واقعہ قتل میں ان کی بیعت کا شبہ قوی ہو چکا ہے تو خاندان کے تمام آدمیوں نے دہلی جانے
کی مخالفت کی۔ ان کی رائے تھی کہ راتوں رات کلکڑ سگھڑی کے علاقہ میں پہنچ جائیں۔

نواب احمد بخش خاں کے زمانے کا ایک بوڑھا سائڈنی سوار بڑا وفادار تھا۔ وہ آیا اور کہنے لگا کہ
میری سائڈنی سو کیس سے ادھر دم پینے والی نہیں میرے کپڑے پہن لیجئے اور مہربانی کر کے
ماتھ کر نکال چلتے۔ فرنگیوں پر بھروسہ نہ کیجئے وہ کبھی نہ چھوڑیں گے۔

شمس الدین احمد خاں کو اپنے خاندان اور میرانہ علاقے کا سفر تھا۔ وہ سمجھتے
تھے کہ میرے خلاف کچھ ہونے والا نہیں۔ دس سوار ساتھ لے کر پالکی میں دہلی روانہ
ہو گئے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو ایک سوار کو آگے بھجوا دیا۔ ایجنٹ اور حکام
موقع پر موجود تھے۔ کرنل سکتر نے جس کی ان سے گہری دوستی تھی آگے بڑھ کر کہا کہ

نواب صاحب! آج کے دن کے لئے اور صاحب کلاں مہاراجہ ایجنٹ پر بھروسہ رکھئے۔
یہ آپ کے لئے جو کچھ کر سکیں گے کریں گے۔ نواب نے تلوار والے کر دیئے۔ اس کے بعد

محسوس کیا کہ بڑھاپا، سانس نہ لے کر آپ سرکار کے حکم سے گرفتار کئے جاتے ہیں
اس وقت سے اپنے کو قیدی تصور کیجئے۔ نواب نواب کی آنکھیں کھلیں اور اقارب و

متوسلین کے مشورے یاد آئے۔ یہاں وقت نکل چکا تھا اور رنج نکلنے کی سب راہیں بند
تھیں۔ جیسے موت سامنے آئی تو سہا تو رہا۔ وہ تھا جو فرزند اس کیستے تیار ہو گیا۔

پراساس کا بھائی | ایسا کو بریلی میں یہ اصرار ملی تو وہ سلطانی گواہ بن گیا اور اس نے
نواب کی شہرہ آفاق حالت کے متعلق گواہی دی کہ یہ خاں کو یا با سورتھ سمندر کے

بیان کے مطابق وسائل خان کو پہلے پھانسی مل گئی۔ بعد ازاں نواب کیلئے بھی پھانسی کا حکم ہو گیا۔

غالب کے مکاتیب موجود ہیں۔ ایک مکتوب نواب میرزا دین احمد خاں کے نام بھی ہے جو غالب کی وفات کے وقت غالباً اٹھ برس کے تھے۔ نصیب الدین احمد خاں اور علاء الدین احمد خاں دونوں فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اول الذکر فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص فرماتے تھے۔ آخر الذکر کا تخلص پہلے نسیمی تھا بعد ازاں علانی ہو گیا۔ غالب نے عارف کے مرثیہ میں فرمایا ہے۔

ہم سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھنا نہ تماشا کوئی دن اور

یہاں نیر سے مراد نواب نصیب الدین احمد خاں ہیں، ایک اور غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

ہم سے غالب یہ ملائی غزل کا صوائی
ایک بیداد گر رنج فزا دہ سہی

علانی سے مراد نواب علاء الدین احمد خاں ہیں۔ غالب نے نیر اور علانی کو اردو اور فارسی میں اپنی بانشینی کی سند عصا کی تھی۔ فارسی کلیات میں نواب نصیب الدین احمد خاں کے لئے ایک قصیدہ موجود ہے جس میں فرماتے ہیں:

منم خرمینہ راز و درخیزمینہ راز نصیب سے دین محمد کہیں برادر من
بہ دین و دانش دولت بگمانہ افاق بہ غم کہ تر و از رو سے رتبہ مہر من

بہ مہر دل بہ برادر دہسہ نہ بیعت و بے

کہ پور خویش بود دلستان و دلبر من

نواب مرحوم فرماتے تھے کہ اردو سے مجھے چھب رسی تھی کس نے پہلے نام بھی اپنے نام ایک خط لکھوا لیا۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا کہ داد مجاہد میرے نام بھی ایک خط لکھ دیجئے اس پر یہ خط لکھا گیا۔

خود اسیر شد۔ چوں میانہ من و دے دشمن الدین احمد خاں (ناسازگار ہی بود و مردم شہر لیں دے
وانستند بگی در من افتادند و گرفتاری آن کافر غمستند و کشت بگروان من بسند۔

یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے واقعی مخبری کی ہو۔ اور پرانی تحریر کے انداز سے صاف
ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شمس الدین احمد خاں کے حق میں نہ تھے، اور نواب کی گرفتاری
کے پورے ذمہ دار ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا دامن اس باب میں کٹا پاک نہ
تھا۔ خود واقعہ قتل کی نسبت لکھتے ہیں :

یہ انہ شکرین ناخدا ترس کہ بہ عذاب ابدی گرفتار باد و لیم فریبرز بہادر کہ ریڑھت ہی و
غائب مغرب راہری بود و شب تاریک بہ صرب تنگ کشت و مراغمہ مرک پد رازہ گشت۔

اسی زمانے کی ایک غزل کے منقطع میں فرماتے ہیں :

غائب ستم نگر کہ چو و لیم فریبرز سے

ز نیساں بہ پیرو دستی ادا شود ہلاک

نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر سن کر شمس الدین احمد خاں کی متوقع
بدش کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں :-

اگر کہ چوں غروشن ایں بود پس مرد و شبستان آند و تاثیرہ ذار شد۔۔۔ ناکساں بد ز بازو
خواہ بود و فرمایگان را گرمی ہنگامہ زد کہ دہمن از ہم باشد و پراکندہ چن گرد آید و بولت
روے گرداند و اسودگی بر خیزد۔

یہ ۱۸۲۷ء کی تحریر ہے جو ۱۸۳۵ء میں صرف اخیر فوالہ رکھی ہوئی ۔

ولیم فریبرز نے ۱۸۳۴ء میں نواب الدین احمد خاں کو کلکتہ بھیج دیا۔ تو
غالب نے اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھری سفارشی خط لکھے،
جو کلیات نثر فارسی کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہیں۔

نواب احمد بخش خاں مرحوم کے ایک عم زاد بھائی میرزا قدرت اللہ بیگ تھے۔ ان

کے ساتھ بھی غالب کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ میرزا قدرت بیگ کے دو بیٹے تھے۔ میرزا معین الدین حبیب خان اور میرزا محمد حسین خان۔ میرزا الحق سیاح کے نام کے دو نفلوں میں ان کا بڑا بیٹا تھا۔ ایک بڑا فرماستہ تھا۔

ماں صاحبہ! برادر بہ جان بڑا میرزا معین الدین حسین خان ہمارا کو میرزا سلام کوٹا اور کہنا کہ بھائی اچھی دیکھنے کو مست جا رہا ہے۔

دوسری بگہ لکھتے ہیں :-

میرزا معین الدین حسین خان اور میرزا محمد حسین خان یہ دو بیٹے ہیں۔ ان کی قدرت اللہ بیگ نے اور ان کی زندگی میں بہت کچھ ہوا۔ ان کے والدین اور ان کے والدین کے والدین کی بہت سی باتیں ہیں۔ ان کے والدین اور ان کے والدین کی بہت سی باتیں ہیں۔

میرزا معین الدین حسین خان کا مرتب کیا ہوا ایک درنا پختہ قدر خواجہ حسن نظامی صاحب کی کوشش سے شائع ہو چکا ہے۔

ان کی زندگی کے متعلق غالب کی تحریرات میں تاہل کی زندگی کے متعلق بعض ایسی چیزیں غالب کے بعض بیانات میں ہیں جو سے ممکن ہے کہ پیدا ہو کہ وہ اپنی بیگم سے خوش نہ تھے یا تاہل کو ناپسند کرتے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر انہوں نے شادی کو حکم دیا جس دوام سے تعبیر کیا ہے اور یہی "لو بیڑی" قرار دیا ہے۔ میرزا محمدی بخروج نے وبا کے متعلق پوچھا تو جواب دیا کہ یہ ایک چھپا سمٹہ برس کا بڑھا اور پونٹھ برس کی بڑھیا نہ مری تھی۔ یہ کہہ کر سمجھا ہوا ہے کہ دیا تھی "نقہ برس" وبا ہرگز سنا کہ کی دوسری بیوی کے انتقال پر غصہ کو جو خط لکھا ہے۔ اس میں کسی ایسے الفاظ ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کی قید سے نجات پانے کے بڑے آمز و مند تھے۔ اس خط کے آخر میں حکیم سنائی کے ہدایت میں سے بھی بعض اشعار نقل کئے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ کہ ایک قصہ ہے۔

گیر کہ در روزِ حشر چوں تو بختی
بر سرِ دوزخ نہ تیرہ نہیں
ایک باشد در آن مضمون مصیبت
در طلبِ نان و بیائے ملکین زرن
ایک نباشد در آن مقامِ مصوبت
شورِ تقاضاے نادر سے مہاسین
ان کی ایک ربا عی ہے :

اے آنکہ براہِ کعبہ روئے داری
وانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
نہیں گوئے کہ تندے خرامی و انم
در خانہ نے ستیزہ خوئے داری
ایک قطعہ میں فرماتے ہیں :

بہ آدمِ زن بہ شیطان طوقِ لعنت
سپر و نذرہ تکریم و تدبیر
ولیکن در اسیری طوقِ آہم
گہاں تر آمد از طوقِ غزاریل
ایک اور ربا عی میں لکھتے ہیں :-

اں مرد کہ زن گرفت وانا بدو
از غصہ فراغتش ہما نانا بدو
وارو بہ جہاں خانہ و زین بدو
نازم بخشہ اچسرا تو انا بدو

یہ تمام شوخ گفتاریاں اس خیال کے لئے تقویت کا باعث سمجھی جاسکتی ہیں کہ غالب تامل کی زندگی سے نفور تھا۔ بیگم کے ساتھ ناسازگاری کے باعث تامل ان کے لئے مصیبت بن گیا تھا اور اس مصیبت کا اظہار مختلف صورتوں میں کرتے ہیں لیکن یہ خیال حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ نظم و نثر کے تمام مندرجہ بالا کوششے غالب کی طبعی شوخی، فطری مزاج اور بذلہ بخئی کا نتیجہ ہیں جو کچھ ان کے جی میں آتا تھا بے تکلف کہہ دیتے تھے۔ بعض مذہبی امور کے متعلق بھی ان کے لطیفے مشہور ہیں حالانکہ اسے دل میں مذہب کا انتہائی احترام موجود تھا۔

بیگم سے محبت | واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ بیوی بھی شوخ و سحر کی راحت و آسائش پر اپنی جو قرباں کرتی تھی۔ اگرچہ دونوں کے طرز زندگی میں نمایاں

فرق بنما۔ غالب فسر یا زندہ تھے، سیم بہ حمد پر تہیہ اور سبادت گزرا تو نون تھیں۔
خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ یگانہ نے از رہ کمال اتفاق اپنے کھٹے پینے کے برتن، لنگ
کمرے تھے، اور معلوم ہے کہ غالب کم از کم شرب و نوش کے باب میں مستحق نہ تھے۔
اس سے باوجود طرغین میں گہری محبت انہری دم تک قائم رہی۔

فریض تامل ن | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت
محبت آمیز جاوڑی رہی وہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھر جاتے اس کی تصدیق غالب
کی مختلف کمریوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً میر محمدی مخرج کو ایک خط میں لکھتے ہیں،
”ظاہر ہے کہ ہند کر کر دی کو وہ دن ہمارے گھر عاؤں گا۔ وہاں ایک حالان میں دسوپ آتی
ہے۔ اس میں بیجوں کو، ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا میں
سے ہاتھ دھوؤں گا پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا کیا صحبت رہے گی۔“

نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں،

روٹی کھانے کو باہر کے گھر سے محل صریح میں کہ وہ بہت قریب ہے جب جاتا ہوں تو ہندوستانی
گھڑی بھر میں دم ٹھہرا ہے اور یہی حال دیوان خانہ میں آکر ہوتا ہے۔

ایک اور خط میں نواب صاحب ہی کو لکھتے ہیں،

نہیں جس وقت وہ کھانے کو گھر جاتا تھا شام امدید ہزار خط اور سدری کی قلیا
لے کر آیا میں اس کو لو کر گھر گیا

میر محمدی جبر و جبر کو لکھتے ہیں،

نوبی اب تم پنا ہو کہ میں اپنے گھر میں روٹی کھانے کو جاتا ہوں۔

یہ عام اقتباسات اس امر کا قاطع ثبوت ہیں کہ وہ دن کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے

تھے اور یہ دستور اس وقت بھی قائم رہا جبکہ ان کے لئے چلنا پھرنا خاصا مشکل ہو گیا

تھا اور یہ کہ ان کے گھر میں گریبا گھر سے واپس آکر ”ہندوستانی گھڑی بھر میں“ چم ٹھہراتھا

غالب کی تحریرات میں کوئی مواد ایسا نہیں جس سے تاہل کی زندگی پر پوری روشنی پڑ سکے۔ غالب اس لئے کہ شرف اس قسم کے تذکروں کو عام طور پر پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے فارسی اور اردو مکتوبات میں چند ایسے خطوط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب دہلی سے باہر جاتے تھے تو گھر کا پورا خیال رکھتے اور متواتر خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے فلکاتہ سے رائے جی مل کو جو خطوط بھیجے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

سہ قطعہ مکتوب ملفوف است۔ یکے بہ جناب مبارک اللہ ولہ نواب حسام الدین حیدر خاں دیکے بہ خدمت۔ تاب مولوی منشی حق صاحب دیکے بہ غم خانہ بدتریزہ ویرانہ غالب نام کام سائنڈ۔
دوسری جگہ لکھتے ہیں:

انیک مکتوب بے افافہ در لفافہ غم خانہ رسد۔

۱۸۶۱ء میں نواب یوسف علی خاں کے پاس رام پور گئے تھے تو اس زمانے میں خاندانی پنشن بند تھی اور حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ گورنر جنرل کے چیف سیکرٹری نے ان سے کسی خط کا جواب بھیجا جسے حکیم نے حکیم غلام نبھت خاں سے کہہ کر بند کا بند بلام پورہ بھیجا دیا۔ حکیم صاحب نے یہ بھی لکھا کہ گھر خط جلد بھیجتے رہا کریں جواب میں لکھتے ہیں:-

یہ تم کیا لکھتے ہو گھر میں خط جلد لکھا کر دیا تم کو جو لکھتا ہوں گویا تم ساری ہستی کو لکھتا ہوں یعنی مجھ نائب ایام سے نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ اب ان کو یعنی حکیم کو ہنیاں دینا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے تم یہ خط میرا لکھو میں نے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ کر سناؤ انگریزی خط میں گورنر جنرل کے چیف سیکرٹری نے لکھا تھا کہ:

حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا نواب گورنر جنرل بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔

حکیم غلام نجف خاں کو یہ بھی لگتے ہیں کہ لغافہ لکھول کر پڑھ کیوں نہ لیا تاکہ گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب بیرونی کی ہلکی سی تشویش کو بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔

رام پورہ ہی سے ایک اور خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

ظہیر الدین (ابن حکیم غلام نجف خاں) کی دوا دی (حکیم غالب) کا بہ عارضہ سر درد و سعال و سحر ہونا۔ کدور ناخن کا بچھ سے خفا ہونا۔ مطالب معلوم ہوئے۔ اس کی دوا دی۔

اس موسم میں ہمیشہ اسی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماہ الملحم کا ہے وہ کھنجراد و اور ذرا خیر لیتے رہو۔

نواب یوسف علی خاں دہلی رام پور کے انتقال اور نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی کے سلسلے میں غالب اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے تو غالباً حکیم کے کہنے کے مطابق حکیم غلام نجف خاں نے ایک خط میں تشویش ظاہر کی تھی کہ شاید مزاج کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں نہ ملتی ہوں۔ اس کے جواب میں رقمہ فرماتے ہیں :-

نہایت خط سے معلوم ہوا ہے کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں بہت خوش اور مستند رہتا ہوں۔ . . . یہ خط لے کر تم اپنی دوا دی (حکیم غالب) کے پاس جاؤ اور یہ خط لے کر مسافر اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات ہو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے بلکہ اس ہے۔

ایک اور مکتوب میں جو رام پور کے سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا فرماتے ہیں :

لڑکوں و باقر علی اور حسین علی ابنا نواب زین العابدین خاں عارف کے ہاتھ کے خط لکھے ہوئے ان کی دوا دی کو بھیجا دیتے ہیں۔ تم اس ایسے نام کے خط کو لے کر ڈیڑھ گھنٹہ پر جانا اور استانی جی کو سنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔

حکیم ظہیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

سنو میاں فہمید الدین: تم اپنی دای کمراس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور لڑکوں
کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ سہاب الدین خاں نے اکتوبر کی تنخواہ کئی پچاس روپے پہنچا
دیتے یا نہیں۔ پچہ میرا بیٹہ دواؤں میں اپنی دای سے پچہ کر بدھ کر لکھو۔ دیر نہ کچھو۔

یہ تمام اقتباسات اس امر کا ثبوت ہیں کہ غالب نے محض فرائض تامل کی سجاوڑی
اس میں مستعد تھے بلکہ ان فرائض کو دلی لگاؤ اور تعلق سے ادا کرتے تھے لیکن یہ صحیح
ہے کہ مالی مشکلات کے بوجھ میں وہ بعض اوقات بہت تنگدل ہو جاتے تھے۔ اس
حالت میں گھبرا کر ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے جن سے ان کے دلی خیالات احساس
یا حزن زندگی کے ادنیٰ عرصہ نہ تھا بلکہ انہیں وقتیہ پیشان خاطر می یا جیسا کہ غرض کیا
یا پکا ہے بعضی شوخی کا کرشمہ قرار دینا چاہیے۔ ایسی ہی ان کی یہ تحریر بھی ہے۔

بھائی! میرا کہ سنو ہر شخص کو یہ موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور
ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تامل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔
پتیاے جانے میں یہ کی شکلی، ذر ذلت تھی۔ اگر یہ مجھ کو دولت تنہائی مسر جاتی، لیکن اس تنہائی
چند روزہ اور تجرید مستحکم لیا خوشی بخلائے لادہ رکھا تھا، شکر بجا لاتا تھا، خدائے میرا شکر
منظور کیا۔ یہ بلا بھی قیید ساری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس کو ہے کا طوق (ہلیم)، اسی بوجھ کی
دوستکاریاں بھی پڑ گئیں یعنی ہلیم کے حقیقی بھائی نے، العابدین خاں کے پتے،

الطاف غالب کا رہنا کوئی بچہ نہ تھا۔ سات بچے پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی پندرہ مہینے سے
زیادہ زندہ نہ رہا۔ سبھی منشی میاں دادا خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

تم ہمارے لڑکے میرا بھائی دادا، اس کا مرجانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت
مجھ سے پوچھو کہ بہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوتے ہوتے کبھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کا
عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

جب اپنے تامل اور لڑائی کی طرف سے یا کسی ہو گئی تو غالب نے اپنی بیوی کے بھائی

یعنی بنیادی یکم کے صاحبزادے) میسرز انڈین انعام دین خاں عارف کو بیٹا بنالیا۔ ان سے
بے حد محبت کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ رشتے میں عارف بہت قریبی تھے اور اس لئے
بھی کہ بڑے خوش فہم و سناٹے تھے لیکن عارف بھی جوانی کے عالم میں مفارقت کا داغ دیکھتے
غائب۔ ان کی وفات پر دور و بھرا فوضہ لکھا جو ان کی بہترین اردو نظمیں میں سے ہے :

لڑم تھا کہ دیکھ مر رہا کوئی دن اور تنہا گئے کیوں بے ہوش کوئی دن اور
اُسے ہو گا اور آج ہی کہتے ہو کہ باؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں چھوڑا کوئی دن اور
جلائے ہوئے گئے ہو کیا مر رہا کیوں کیا خوب قیامت ٹالتے کو یہ سنی دن اور
ہاں اسے فلک پہ پہچاں تھا بھی عارف کیا تیرا بھرتا جو نہ مر تا کوئی دن اور
تو ماہ شب چاند وہم تھے مگر کھر کے پھر کیوں رہا تیرا کادو نہ تھا کوئی دن اور
تو ایسے کہاں گئے تھے عمرے اور خند کے کرتا ملک الموت تھا انا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت ہی نہ تھی لڑائی پتوں کا بھی دیکھا نہ تھا کوئی دن اور
گزدی نہ بہ ہر سال بہا تھا خوش و ناخوش گریہ تھا جوں مر گیا لڑائی کوئی دن اور

نادوں اور ہونہار ہو کہ کیوں جیتے ہیں غائب

تکسمت میں ہے میرے کی تھا کوئی دن اور

سے عارف کا انتقال ہوا۔ اٹھارہ سال پہلے سن ۱۹۳۷ء میں عارف نے شاعرانہ دنیا چھوڑ دی
اور دیگر مشیر لکھا تھا جس کا مصرعہ تاج ریت ہے۔ عارف پسند محبت تھی ہر جگہ ہے ان
”سرو اس“ نے تخریب سے تاج ریت نکلتی ہے۔

ایکگزینہ عارف کے ایک فرانسیسی شاعر شخص میسرز نے لکھا تھا یہ رہے ہیں مسلمان خاتون مسکوی
کر کے ہندوستانی معاشرہ اختیار کر لی تھی۔ اس سے ایکگزینہ نے اردو میں ”میسرز“ کے نام سے شکر کیا۔
اور انھیں نکالا بھی ایک بھی نہیں کرتے تھے۔ پہلے بھی یہ تھے پھر بوجھ گئے۔ جب بڑی ہمارے تھے اور
وطن مفت کرتے تھے تو یہی ہیں، اس میں کی غرض ذات پالی، غائب کی جنس نہ تین، بھائی بھائی ہمارے
نے چھوڑا تھا۔

غالب نے فارسی میں بھی عارف کی خوش فکری اور اپنی گہری اُلفت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی بات دہریہ ہے :-

آن پسندیدہ خوش عارف نام کہ خوش شمع و دودمان من است
آنکہ در زم قریب و خلوت انس غمگسار و مزاجدان من است
پھر عارف کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

ہم ز کھاک تو خوش دلم خوشدل کاں نہاں ثمر نشان من است
سو دسہ ماہ کمال منی سخت گنج شایگان من است
جائے دار کہ خویش را نازی کہ ظہور تو در زمان من است
جائے دار کہ خویش را نازم کہ فلاں نے ز پیرون من است
با و داں باش اسے کہ ور گیتی سخت عمر جاوداں من است
اسے کہ میراث خواری من باشی اندر اُردو کہ آں زبان من است
از معانی زمیر سد فیہ آتش با و آں تو برجہ آں من است

یہاں اتنا اور عرص کر دینا مناسب ہے کہ عارف کی والدہ بنیادی بیگم کے تعلقات اپنے شوہر نواب غلام حسین خاں سردار سے اچھے نہیں رہے تھے اور نواب نے بیگم کو سات ہزار روپے کی مالیت کا ایک مکان دے کر علیحدہ کر دیا تھا۔ فیروز پور جھر کہ سے انہیں سو روپے پنشن ملتی تھی۔ عارف کی پہلی شادی شمس الدین احمد خاں کی حقیقی بہن نواب بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب احمد بخش خاں ان کے ساتھ بیٹوں کا سا سلوک کرتے تھے۔

دوسری شادی میرزا محمد علی کی صاحبزادی بستی بیگم عارف نواب دہلن سے ہوئی عارف کو اس بیوی سے غایت درجہ محبت تھی۔ درد گردہ سے اچانک اس کا انتقال

رہے یہ حالات مجھ پنجاب گورنمنٹ کے اُن پرنس نے کائنات سے معلوم ہوئے جو ریاست لودھیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہو گیا۔ اس سلسلہ جانکاہ سے عارف کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اسی غم میں گم ہل گم ہل کر بیمار پڑ گئے اور ایک روایت کے مطابق چھ ہفتے کے اندر جہاں بحق ہو گئے۔ آخری دنوں میں زندگی سب بالکل مایوسی ہو گئی تو اپنے دو تین بچوں باقر علی خاں، حسین علی خاں کو غائب کے سپرد کر دیا۔

عارف کے بچے عارف کے انتقال کے بعد غائب اور ان کی بیوی حسین علی خاں کو بیٹا بنا کر اپنے گھر سے آئے۔ تربیب بنیادی بنیاد پر روز بروز وقت کا انتقال ہو گیا۔ تو باقر علی خاں بھی غالب ہی کے پاس چلے گئے۔ غائب کو ان دنوں سے بڑی محبت تھی۔ مزاجہ مالی نہ لے رہے ہیں۔ کہ ان کی کتنی آنکھ سے ادھار نہ ہو، سہہ، سہہ، اگرچہ خود ہیں۔ تناس مزاج تھے۔ لیکن حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے سارے ناز اٹھاتے۔ اور ان کی کسی بات پر شفا نہیں دیتے۔

فتنی ہر کو پاں تفتہ کو نکستے ہیں۔

سکھو صاحب ایہ قہار تیرے کہ زین، اسرار، مان، جو میرا فرزند تھا، اب اس کے انار، شے کو وہ میرے ہوتے ہوتے میرے پاس آئیں، اور دہم مجھ کو سستاتے ہیں۔ میں گم ہل کرتا ہوں۔ خدا کو دے کہ۔ کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں، میں تمہارے ناچ، بیچ، بیڑ، معنوی ہوتے ہوئے۔ جب اس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کمانے دیتے، مجھ کو دوہر کر سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں پانکس پر رکھتے ہیں، کہیں باقی لڑھکتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں تنگ نہیں آتا۔ تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں اور کیوں گھبراؤں گا۔

میرے یہ مجروح کو کہتے ہیں۔

اندر باہر سب روزار ہیں، یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ ایک میں اور میرا بیٹا حسین علی خاں روزہ تو ہیں، وہی حسین علی خاں جس کا روزہ سب سے اکلنے لگا اور

میں بھی بجا رہا ڈر گا یا

رام پور کے دونوں سفروں میں دونوں عاجز اور سہماتہ تھے۔ رام پور سے پہلے
 ہونے مکانیب میں جا بجا ان کو کرپٹہ مثلاً حکیم ظاہر شریف خاں کو لکھتے ہیں :-
 لڑکے وہ انوں اچھی طرح ہیں کبھی یہ دل بہلاتے ہیں کبھی مجھوتات سے ہیر بکریاں، کبوتر
 بیڑ میں تھل، کنکڑا سب سامان درست ہے فروری کے مہینے میں دو سو روپے دیئے، دس
 دن میں اٹھا ڈالے، پھر پڑوں چھوٹے صاحبائے حسین علی خاں، کو دوا جان کچھ ہم کو قرض
 حسد و ایک روپہ دونوں کو قرض حسد یا کیا، آج سہ ماہیہ دور سے نکلتے کے باقر علی ہیں گئے
 ایک اور خط میں جو راستے سے لکھا گیا تھا فرماتے ہیں :-

دونوں بڑا بھڑا درہم سراج دیتے ہیں چار گھڑی دان ستہ بڑا کی مراد میں پتہ ہوا۔
 دونوں بھائیوں کو میٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو پٹنے سے باز رکھیں ہمدون سے ڈالنا اور بدستور بنانا کہ
 ہر گئی داغ دینا ساری کنبہ اس میں ڈال دیئے رات گئی تھی شرب پزیر، کنبہ کھاٹا کوڑکے
 اسہر کی پھری بکوائی خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھاؤ اور سب دمیور کو بھی کھلائی۔ باتہ آہستہ۔
 دونوں سانوں میں مافقت نہ آئیں کی سہل شہ سے سے بلا تہ میں، اتنی بات زیادہ ہے۔
 کہ حسین علی نے اپنا رپہ درہم لے کر کھوئے، با اسات، دوا سہل کھلیتہ پڑے۔

ہا پوٹ ستہ آگے کے ستہ کی کیفیت کے سامنے ہیں فرماتے ہیں :-

دونوں گھوڑے کوئی آئے دونوں لڑکے رتہ میں سوار آتے ہیں، اب وہ آئے کھانا کھالیا اور چھڑا
 تم اپنی آستانی دیکھ غائب کے پاس یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دیتا۔

ایک اور خط میں رام پور سے نواب علیہ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں موجود ہیں۔ ہم جیسے آتھ جھٹے
 کے علی کو روانہ ہونے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ تھے۔

باقر علی خاں | باقر علی خاں غائب کی زندگی میں اور غالباً انہی کی سنا سنش سے نور

میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کی نشاویں تھا۔ خیار الدین احمد خاں کی صاحبزادی مغظمہ زانی بیگم
عرف ابجا بیگم سے ہوئی۔

اُردوئے معالیٰ میں ان کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط میں روزگار کی دوستی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تسلی دی ہے کہ ترقی جلد ہوگی۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

تمہاری دادی اچھی ہے۔ تمہارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمہارے گھر میں سب طرح خیر و مائیت۔

ہے۔ نہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دو مرتے تیسے میرے پاس آ جاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی اور ملازمت کے بعد باقر علی خاں علیحدہ مکان میں

چلے گئے تھے ”سبد چیں“ میں ایک قسط ہے جو باقر علی خاں کی بڑی بی بی کی محمد سلطان بیگم
عرف جند و بیگم کی پیدائش پر لکھا گیا تھا :-

بیمار از مقدمت زنده میرزا باقر
مروزش تهنیت زیده مطالب گفت

چو قصد شد تحقق یافتن تار و پود
طریق تعبیه و زید و جان غایت یافت

جانب غالب کے اعداد ہیں "قصہ کے اعداد شامل کئے جائیں تو ۱۲۸۱ء تا ۱۳۰۱ء تک

ہے۔ غالب جند و بیگم کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور انہیں "میرزا جیون بیگ" کے نام سے پکارتے تھے۔

بائزر علی خاں شاعر تھے۔ کامل تخلص تھا۔ اور سے صاحب روپے مایہ ناز تنخواہ ملتی تھی۔

ایکس دو تین برس کے بعد ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ اور گھوڑوں کی تجارت

مکتبہ اسلامیہ لاہور

کی عمر میں وفات پائی۔ زینبہ اولاد کوئی نہ تھی۔ صرف تین صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑی یعنی

محمد سلطان بیگم عرف چند بیگم کی شادی شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بڑے صاحبزادے

شجاع الدین احمد خاں تاجاں سے ہوئی۔ دوسری یعنی فاطمہ سلطان بیگم عورت

بند و یتیم کی شادی نواب علی والدین غاں کے صاحبزادے میرزا بشیر الدین احمد غاں سے ہوئی

تیسری صاحبزادی قیہ سلطان بیگم عرف مجسم بیگم کی شادی کرنیل فواد النور علی احمد سے ہوئی
 علی حسین خاں | مرزا حسین علی خاں باقر علی خاں سے تین برس چھوٹے تھے۔ غالب کی زندگی
 میں ان کی نسبت میرزا اکبر علی خاں کی صاحبزادی سے قرار پائی تھی۔ اپنی زندگی کے
 آخری دنوں میں غالب نواب کلب علی خاں مرحوم کو متواثر شادی کے مصارفہ
 کے لئے خط بھیجتے رہے۔ نیز حسین علی خاں کی ملازمت کے لئے درخواستیں
 کرتے رہے۔ جب قرض خواہوں نے انہیں بہت تنگ کرنا شروع کیا۔ تو شادی
 کے لئے عطیہ کی گذارش چھوڑ کر صرف ادائے قرض کے لئے روپیہ مانگتے رہے۔ لیکن
 قرض داری کے عالم وفات پا گئے۔ بعد میں حسین علی خاں کو رام پور میں پچیس روپے
 کا منصب مل گیا۔ وہ اردو، ورنقاری کے شاعر تھے۔ اردو میں شادان اور فارسی میں
 خیالی تخلص فرماتے تھے۔ ملازمت کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ حسین باقر علی خاں کی انتقال
 کا اتنا وقت صدر ہوا کہ ملازمت چھوڑ کر واپس آئے۔ اس وقت سترہ سالہ تھے۔ لگے
 اویس نوال شادان (۱۸۷۷ء) کو راہ گرانے عام بھاہوئے۔ وفات کے وقت صرف
 تیس برس کی عمر تھی۔

معلقین کا خیال | غالب کو آخری ایام میں اپنے متعلقین کا بہت خیال رہا تھا۔ ان کے
 پاس کوئی اند وخت نہ تھا، کوئی جائے رہنمائی۔ آمدنی کے تمام وسائل صرف زندگی

ساح مالک رام صاحب ایم۔ اے نے ذکر غالب میں لکھا ہے کہ مرزا اکبر علی خاں نواب احمد بخش خان کے
 ایک بھائی میراٹھی بخش خاں کے پوتے تھے۔ انہوں نے دیو دا اکبر کوئی لی رز کی سے نکاح کر لیا تھا۔ جو
 ایک مسلمان عورت مبارک بیگم کے بیٹن سے تھی۔ اس کا نام مالک۔ م صاحب کے قول کے مطابق
 خورشید بیگم اور صاحب کے قول کے مطابق حسن جہاں بیگم۔ مبارک بیگم کی بنائی ہوئی ایک مسجد حوض
 قاضی کے بازار سرکی دالان میں ہے۔

ملک کھلے تھے۔ وفات کے بعد خانہ انی پنشن کے جاری رہنے کا کوئی امکان تھا۔ نہ
 راجہ پورو والا وظیفہ قائم رہ سکتا تھا۔ نہ دوسری فتوحات مل سکتی تھیں۔ اس لئے وہ
 بہت پریشان رہتے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں، اصرار نہ ہوا۔ نہ تھے۔
 انہیں لکھتے ہیں :-

واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ
 سہی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی عدوت بھی نہ ہوگی۔ آج تم دو بھائی امین الدین
 احمد خاں اور غیاث الدین احمد خاں، اس خاندان میں شرف الدور اور فخر الدور کی جگہ ہوں
 میں لم بند و لم۔ لہجوں۔ میری زبان تمہاری بہن۔ میرے ہاتھ تمہارے ہاتھ ہیں۔ خود جو میری تھی
 ہتھی ہے۔ آؤ۔ لو۔ تمہاری بارگاہ۔ اس سے کہ کبھی کی شادی الہی بخش خاں معروف کے ہوتے
 میری بیٹی تھی۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ دوسرے کے واسطے تمہارا دُعا گوں اور تمہاری بیٹی
 پامتا ہوں۔ مناسبت ہے اور انشاء اللہ تمہاری ایسا ہی بیٹا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے
 سامنے مر جاؤں گا۔ اگر اس قافلے کو روکیں تو نہ ہو۔ نہ کوئی ترو دے۔ اگر پہنچے بھی نہ آئے اور انشاء
 اللہ کچھ گئے تو میری بیٹی سے۔ میری بیٹی سے۔ میری بیٹی سے۔ میری بیٹی سے۔ میری بیٹی سے۔ میری بیٹی سے۔

امراؤ بیگم کی وفات اب تحقیقی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ امراؤ بیگم غائب کے بعد
 پورا ایک سو برس زندہ رہیں اور انہوں نے غائب کی پہلی برسی کے دن (۲۵ ذی قعدہ
 ۱۲۸۵ھ) کو دس ہجرت کی۔ ان کی وفات کے وقت حساب آٹھ سو
 روپیہ کے مقرض تھے۔ قرض لو دو کرتے کے لئے بار بار نواب کلب علی خاں سے ناکام
 التجا ہیں کرتے تھے۔ امراؤ بیگم کے لئے پہلی تشویش یہ تھی کہ کسی طرح قرض ادا ہو جائے۔
 دوسری تشویش یہ تھی کہ حسین علی خاں کی شادی ہو جائے، نیز کسی سے جی ملازمت مل جائے
 غائب کی وفات پر امراؤ بیگم کی معاش کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے۔ نہ سرکاری نالہ

پیشن بانی تھی۔ نہ رام پور کو وظیفہ باقی تھا اور نہ کہیں سے قوت مل سکتی تھی۔ یہاں سے
سرکاری انگریزی ہیں۔ درخواست کی کہ غالب کی خاندانی پیشوائے متبعین حسین علی خاں
کے نامہ منتقل ہو جائے۔ لیکن یہ درخواست مسترد ہو گئی۔ بدلتے ہوئے گواہوں کے
انگریزی ہیں۔ یہ سافر ہو تو کسے جس روپے ماہوار گز سے کے لئے مل سکتے ہیں۔
نواب الہی خان خاں کی پیشوائے نواب کی پیشوائے دینا متبہ کی بیوی جس کے
لئے خود کچھری میں عمارت بنوانے کا کام کیا۔ گواہوں کو سبکدوش کر دیا۔ اور ان کے حکم خود اپنے
دیر سرکار نواب کلب علی خاں مرحوم پر ہیں فرماتی ہیں :-

جامانہ کچھری ہرگز نہ ہو گا۔ لگو خاتون سے مراد اس کا بیٹا اور بیٹا اور شوہر کا
رہائش کروں جو تڑپنے اور یہ سب سے چھپاؤ اور مستند میرے والدین اور شوہر کی
آگے خاص و عام کے تھی۔ حضور پرورش ہے۔

اس طرح انگریزی پیشوائے کا معاملہ ختم ہوا۔ نواب کلب علی خاں کی پیشوائے امر او بیگم
کی طرف سے کئی شرائط پیش ہوئے۔ جن کا مندرجہ ذیل تھا کہ اولاً یہ کہ قریب ۱۰
ہو جائے، دوم گز اسے کا اطمینان بخشا جائے کہ وہ یا جائے مان میں سے آخری عرفہ
پر جو ۲۳ جمادی الاول ۱۲۵۷ء میں دیکھ کر پورے ۱۲۵۷ء کی پیشوائے حکم نافذ ہوا کہ اس
باب میں نواب میرزا دلش کو ہدایت دیدی گئی ہیں۔ کیا ہدایت دی گئی تھیں؟ ان کا
کچھ علم نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ سرکار رام پور سے امر او بیگم کو حسین علی خاں کی
ملازمت کے سوا کچھ نہ ملا۔

۱۲۵۷ء کا قریب غائب محمود رام پور سے۔

۱۲۵۷ء نواب میرزا خاں داغ اس زمانے میں رام پور میں ملازم تھے۔ اور نواب شمس الدین احمد خاں کے ساتھ
تعلق کی وجہ سے وہ خاندان ہمارو میں محسوب ہوتے تھے۔

نواب سر امیر الدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے قرضخواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی تھی اور امیر ابوبکر کے لئے پچیس روپے یا پچاس روپے ماہوار روٹا روٹے سے مقرر ہو گئے جو تا دم وفات انہیں باقاعدہ ملتے رہے۔

غالب کے ملازم اس ضمن میں غالب کے ملازموں کا ذکر بھی مناسب ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور کو چھوڑ کر ان کی مالی حالت کبھی بھی اطمینان بخش نہ رہی۔ لیکن امیرانہ ٹھاٹھ آخر دم تک قائم رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ہر دور میں کم از کم تین چار ملازم ضرور رہے۔ خطوں میں کلیات نامی ایک ملازم کا ذکر بار بار آتا ہے۔ جو کہاں تھا۔ خط ڈاک میں ڈالنا ہو۔ پارسل بھیجنا ہو، چیزیں لانی ہو یا کسی کے پاس پیغام بھجوانا ہو۔ کلیات ہی ان تمام کاموں کا اتمم قرار آتا ہے۔ بعض خطوں میں ایاز نامی ایک ملازم کا ذکر آیا ہے۔ چند خطوں میں کلوداروند کا نام دکھائی دیتا ہے مثلاً قربان علی بیگ ساک کو لکھتے ہیں "کلوداروند کو رشتہ عرض کرتا ہے کہ کلوداروند پورے سفر میں بھی ساتھ تھا۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

میں بھی رشتہ، روٹے بھی خرش، کلو اچھا، گیا ہے سقا، شعلی، غلامکوب سرکار سے متعین ہیں۔ جہام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔

حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے نام کے خط میں جعفر بیگ اور وفادار ملازم کے نام آتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

کلنا تھ دیوڑھی پر اگر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا ہے یا نہیں۔

ایک ملازم عنایت اللہ کا تذکرہ حکیم غلام نجف خاں کے نام کے خطوں میں آیا ہے مثلاً :-

لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، لگراں ایک عنایت معین سے کچھ ہمارے غیر اچھا ہو جائیگا۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

میں نے لیٹے لیٹے یہ سطویں لکھیں۔ اب عنایت اللہ کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں وہ کچھ اونگھتا
ہوؤں کہ پتا وہاں کیا لکھا جاتا ہے۔

قالب علماء الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط میں نیاز علی ملازم کا نام آیا ہے
فرماتے ہیں :-

باقری خان احمد خاں علی خاں مع سہا مرغ چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ مجھے مدد ملی
میرے ہاں کے ساتھ گئے۔ کلوادر لڑکا نیاز علی یعنی ڈیرھ آدمی میرے پاس ہیں۔

وقت درجہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ملازمہ تھی۔ ایک خط میں لڑاب ملا الدین
احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

بی دفنار بن کو تم کچھ امداد بھائی (قالب امین الدین احمد خاں) خوب جانتے نہیں اب تمہاری پھوپھی
(امولہ بیگم) نے، نہیں دفنار بیگم بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور
ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں
کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن
نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول قلاتے چپا کے بیٹے کی
کائی کے ہیں یعنی یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیا رہی کہیں،

غدر میں غالب کی تنگ دستی حد سے گزر چکی تھی قلعہ کی تنخواہ بند تھی اور خانہ دانی
پیشن مسدود کوئی فدیہ معاش باقی نہ تھا۔ زیورٹ چکا تھا۔ کپڑے بیچ بیچ کر گزارا
کرتے تھے۔ بیگم اس حالت میں بھی بیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی
تھی۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

اب خاص، پناہ دے تا ہوں سوک بیوی دے چکے ہیں چار آدمی گھوڑے کلو، کلیا بی بی، باہر بی بی
کے جو روپیچے بہ دستور گو یا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے جہینے پھر سے آجئے، کہ بھوکا مارتا
ہوں، اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک بیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود

مداری کا ذکر ایک فلو سی خط میں بھی آیا ہے۔ غالب فرزند پور گئے تھے تو وہاں کچھ سامان چھوڑ گئے تھے۔ وہاں سے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :-

مداری خاں نے رسد و تارے رساندہ پنجہ از کلا گئے نار و سہ من و آنجا ہاشم و دے سپارندہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

باقری خاں اور حسین علی خاں اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب صاحب گئے ہوتے ہیں۔ ایسا نہ زیادہ علی ان کے ساتھ ہیں۔ وہ بندہ گیاں ایک و ماہر دو کتاب طوسی دو اکلور اور کلیان کی بندہ گیاں پہنچیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

قرض دینہ عالمی ایک مختار وہ سود ماہ پر ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔
 نانہ ٹیکس بندہ پور گیا رہو، سود بیا، مول بیا، بی بی جہا، پتہ جہا، شاکر و پیشہ جہا، آمد ہی ایک سو لاکھ۔

اس خط سے بھی ظاہر ہے کہ لوگروں کی خاصی فراوانی تھی۔

غالب بلوچہ قلعہ میں و فراوانی مصارف ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنے میں بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ یہ پور گئے تو پوچھتے ہیں کہ کدہر ناتھ نے فلان فلاں کی تنخواہ ادا کر دی یا نہیں جبکہ لکھنؤ بکھت خاں کو لکھتے ہیں :-

ہاں بھائی گھوڑیں پوچھ لینا کہ کدہر ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی ہیں نہ تو وفادار احمد سلطان پور کی تک کو بھی تنخواہ بھجوتی ہے۔

رندی و آزاد مشینیں | یہ عرض کرتا تحصیل حاصل ہے کہ غالب کی جوبانی طرح طرح کی رگینیوں اور آزاد مشینوں میں گزری بعض واقعات کے متعلق ان کے خطوط میں بھی اشارے ملتے ہیں :-

چوتھا باب

دہلی میں سکونت اور مسکان

دم از ریاست دہلی سے زخم غالب
منم ز خاک نشینان آں دیار یکے

غالب دہلی میں کب آئے | دہلی میں غالب کی آمد و رفت سات برس کی عمر سے شروع ہو گئی تھی۔

چنانچہ ۶ فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب علا الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

مے میری جان یہ وہ دہلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دہلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے

وہ دہلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دہلی نہیں جس میں

سات برس کی عمر سے آنا جاتا ہوں۔ وہ دہلی نہیں جس میں اکبادن برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ

ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دہلی میں اگر ابتدا میں شعبان بیگ کی حویلی میں رہے

تھے جہاں نواب علا الدین احمد خاں ان سے پڑھنے جاتے تھے۔ اگر اکبادن برس کی

مدت کو درست مانا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب نے ۱۸۱۱ء کے قریب جبکہ

ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگی، دہلی میں سکونت اختیار کی۔

لیکن وہ منشی شیونرائن نامیہ (گرہ) کو ان کے دانا منشی بنسی دھر کے حالات میں لکھتے ہیں :

شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہیں یا پھولے ہوں۔ انیس بیس کی میری معمولی سی بی عمر میں کی باہم طریق اور اختلاف اور محبت ادھی اور ہی ات گزر جاتی تھی چونکہ گھر میں کام بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے انیس بیس برس کی عمر تک اگر وہ کی سکونت مستقل ترک نہیں کی تھی۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو دہلی میں ان کی مستقل سکونت کو ۱۸۱۵ء کے بعد کا واقعہ سمجھنا چاہیے۔

میرزا عظیم علی صاحب سدس مدرسہ اکبر آباد کے نام ایک فارسی خط کلیات نثر میں موجود ہے۔ اس میں اپنی مالی پریشانیوں اور پنشن کے مسئلے میں چارہ جوئی کے لئے سفر کلکتہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

روزگار برگشت کار ساختہ شدہ صورت تباہی گراں۔ اکوئ ششیم سال است کہ نہاں

بہادر وارد دل بر مرگ ناہادہ نہادہ برکنے ششستہ ام و در آمیزش بر روی بیگانہ و آشنا بستہ۔

غالب نومبر ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس آئے۔ لہذا مندرجہ بالا خط ۱۸۳۵ء یا

۱۸۳۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں اپنے زمانہ مفارقت کی نسبت لکھتے ہیں کہ

دراندی زمان فراق کہ برگمان مندوم شانزدہ سال است بہ دانست مامہ نگار کم از بہت سال میرت۔

اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۶ء میں غالب کو اگر وہ چھوڑے ہوئے قریباً بیس برس

گزر چکے تھے۔ اس حساب سے دہلی میں مستقل سکونت ۱۸۱۶ء میں اختیار کی گئی جبکہ

غالب کی عمر قریباً انیس برس کی تھی۔

شیونرائن آرام کے نام کے بس خط کا حوالہ اور پرچکا ہے اسی میں غالب

اپنے مکالوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

ایک کڑھ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا، اس کڑھ کے ایک کونٹے پر میں پتنگ لٹاتا تھا اور صاحب بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔

صاحب بلوان سنگھ بنارس کے مہاراجہ چیت سنگھ کے ساتھ ہونے والے مہاراجہ موصوف جب دارن ہشتنگز کے مانی مطالبوں سے تنگ آکر بنارس چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو گوالیار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں انہیں ایک کٹاؤں کی جاگیر کے طور پر مل گئے تھے۔ وہیں انہیں ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں ان کی والدہ موندن کی رسم ادا کرنے کے لیے بنارس کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ اب انیس تھی کہ مہاراجہ چیت سنگھ کی وفات کی اطلاع ملی۔ سرکار نے رانی کے لئے دو ہزار روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا لیکن شرط یہ تھی کہ وہ اپنے بچے سمیت گوالیار یا اگر وہیں رہے۔ مانی کو اس شرط سے انکار تھا۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد ۱۸۹۳ء میں یہ شرط منظور کی گئی کہ رانی نے اگر وہ میں اقامت اختیار کی تو غالب نے راج کے ساتھ پتنگ لڑانے کا جواز دیا ہے وہ ۱۸۹۳ء یا اس کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے لہذا یہ یقینی ہے کہ ۱۸۹۳ء تک غالب اگر وہاں ہی میں مقیم تھے۔

کلمے میں کی چوٹی | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے وہلی میں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خرید لیا تھا۔

۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۶ء بنارس مولفہ سیدہ فہیمہ رضوی غازی صاحبہ طبع اسلام آباد میں صفحات ۵۰۵ و ۵۰۶ سالک دم صاحب ذکر غالب میں فرماتے ہیں کہ غالب نے ۱۸۹۲ء میں اگر وہ چھوٹے بلوان میں میرزا مظہر علی کے نام کے اس خط سے بھی استمد لال کیا گیا ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ فاضل موصوف کا خیال ہے کہ یہ خط ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا تھا۔ چونکہ غالب اس سے بیس برس پیشتر گھر چھوڑ چکے تھے لہذا ۱۸۹۲ء کا دعویٰ ثابت ہو گیا لیکن اس خط کو ۱۸۹۲ء لکھوں کی سوجھا جاسکتا ہے۔ جبکہ غالب خود کہتے ہیں کہ کلکتہ سے واپسی پر چھٹا سال گزر رہا ہے۔ لہذا یہ خط ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء میں لکھا گیا ہو گا۔

ہمیشہ کرایہ کے مکانات میں رات گئے۔ یہ ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں
 بغیر کرایہ کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے بیگناہ کیا، اسے چھوڑ کر دوسرے مکان لے لیا
 مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے قریب وچھار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر
 نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے یوان خانہ
 کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں :-

مسجد کے زیرِ مایہ اک گھر بنایا ہے

یہ بندہ کبیتہ ہمسایہ خدا ہے

لیکن غالب خود ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :-

سی سال است کہ خانہ کا شانہ فروخت کو بگڑے گرد و مقلات متعین نہ دارم، ہر جا کہ
 ردم و در سال یا گستر یا بیشتر، آسایم

اس سے ظاہر ہے کہ وہی میں غالب کا اپنا مکان بھی تھا جو ممکن ہے کسٹمرال
 والوں کی طرف سے ملا ہو۔ اسے فروخت کو ڈالنا بعد ازاں وہ ہمیشہ کرایہ کے
 مکانات میں رہے ۔

شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں بہادر شاہ کے پیر تھے۔ شیخ قطب الدین
 کے صاحبزادے اور مولانا فخر الدین فخر عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے جو دور آخر میں
 چشتی خاندان کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ کالے میاں کو غالب سے بڑی
 محبت تھی۔ انہوں نے گلی قاسم جان میں اپنی ایک حویلی کرایہ کے بغیر غالب کو
 رہنے کے لئے دی تھی۔ دربار شاہی میں حکیم حسن اللہ خاں کے علاوہ شیخ
 کالے میاں بھی غالب کی ملازمت کا ایک فدیہ تھے۔ شعبان بیگ کی حویلی کے

بعد سب سے پہلا مکان جس میں غالب کے قیام کا پتہ چلتا ہے وہ کالے میاں کی یہی حویلی تھی۔ یہ اب بھی موجود ہے اگرچہ اس کا نقشہ بدل گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ غالب اپنی قید (۱۸۴۷ء) کے بعد تک اسی حویلی میں رہے۔ مشہور ہے کہ رہا ہونے پر کسی دوست نے مبارک باد دی، تو فرمانے لگے:

کون کہتا ہے میں قید سے رہا ہوا ہوں۔ پہلے "گورے" کی قید میں تھا، اب "کالے"

کی قید میں ہوں،

حکیم محمد حسن غار کی حویلی | کالے میاں کی حویلی کو چھوڑ کر حکیم محمد حسن غار کی حویلی کراچی پر

۱۸۴۷ء میں اپنی سکونت خانہ سے بتاتے ہیں۔ غدار کے بعد دہلی میں جو حالات پیش آ رہے تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے میر محمد سی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

سب تعانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔

تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمہار میرے پاس بھی آیا میں نے کہا بھائی تو

مجھے نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھو یہ لکھو کہ اسدا اللہ غار نشین دار

خانہ سے حکیم پیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ ۱۸۴۷ء والی تاریخ درست نہیں وہ ۱۸۵۷ء

کے ایک مکتوب میں نقشہ کو لکھتے ہیں:

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور اپنی ماراں میں ایک حویلی کراچی پر

لے کر اس میں رہتا ہوں۔

غالب کے ساتھ نقشہ کی خط و کتابت مسلسل جاری تھی۔ یہ ظاہر ہے امر مستبعد

۱۸۵۷ء۔ حکیم محمود غار کے بھائی مبارک احمد پیالہ کے ملازم تھے۔ اس وجہ سے وہ پیالہ دار حکیم

مشہور تھے حکیم محمد حسن اسی خاندان سے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کو دوسرے تک تبدیل مکان کی اطلاع نہ ملی ہو۔ میرا خیال ہے کہ غالباً ۱۸۵۳ء یا ۱۸۵۲ء میں حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں آئے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ جولائی ۱۸۵۳ء تک اسی میں رہے۔ علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں: میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں اب وہ حویلی غلام اللہ خاں کے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خاں کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں وہ حویلیاں قریب محلہ گڑاں میں ہیں کہ ایک محلہ سرائے اور ایک دیوان خانہ ہو نہ ملیں۔ ناپا۔ یہ چاہا کہ بلیماراں میں ایک مکان ایسا ملے جس میں چار باغ، رات نہ ملتا، تھوڑی سی چھوٹی مسجد بھی ملے۔ یکس نواری کی، گڑاں کی حویلی بھی۔ کورنٹ کو نہ بہرچہ وہ رعایت مرعی نہ تھی کہ محلہ سرائے قریب ہو۔ مگر بہت دور بھی نہیں۔ کل پیرسوں وہاں چار سوں گا۔ ایک پاؤں زبیں پر ہند۔ ایک پاؤں رکاب میں۔ توشہ کا وہ حال۔ گوشہ کی یہ صورت۔

اسی مکان کی نسبت ایک خط میں غشی بہ گوپانی آفتاب کو لکھتے ہیں: دس گیارہ برس سے اس تنگنائے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ پیار روپے کرایہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سے دوہرا کیا۔ نشست دیا گیا۔ مالک مکان نے مکان سے چارواں جس نے لیا ہے (یعنی غلام اللہ خاں نے) پیسہ بلکہ ہرام کیا کہ مکان خاں کر دو۔ مکان کہیں سے تو اٹھوں۔ بے درد نے مجھے مجھے کو عاجز کیا اور مدد نہ دی وہ صحن ہاں تھانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا عمق ہے، اس میں پاڑھ بندھ گئی۔ رات کو نہ میں سویا۔ گولی کی شدت، پاڑھ کا قریب، گمان یہ کرتا تھا کہ یہ کٹکے ہے اور صبح کو مجھ کو بچا لے گی۔ تھیں راتیں اس طرح گزاریں۔ دقتیں نہ رہیں۔ درختوں کے وقت سے نہیں مانتا تھا کیا۔ وہاں چار باغ۔ جان بچ گئی۔

حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں اسباب راحت کی قلت تھی۔ ایک خط میں جو پیش کش کی بندہ شرا کے زمانے میں لکھا گیا۔ یعنی ۱۸۵۳ء یا ۱۸۵۴ء میں بہرہ بردی مجروح

کو تحریر فرماتے ہیں :-

برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے۔ تقاسم جان کی کلی سعادت غار کی زبردستی ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم ہیگ کے نڈر کی طریت کا دروازہ گر گیا۔ سید کی طرف کے دالان کے پائے بستے ہوئے۔ زہن کا گر گیا۔ میٹھیوں گرا چاہتی ہیں صبح کے بیٹھنے کا چہرہ چمک رہا ہے چھتیر چھلنی ہو گئی ہیں۔ بینہ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ کھٹکے ہوئے ہیں۔ کتا ہیں تھکان سہا تو تھکنا میں فرشتے پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلنی و مدنی ہوئی ہے تھکنا کہاں تھک کر کہیں باہر ہوتا ہے۔ یہ مکان اس وقت تک تھکنا چھوڑا۔ جب تک تھکنا مالک مکان نے انہیں کس جاننے کے تقاضوں سے عاجز نہ کر دیا۔

میکیم صاحب ڈائے مکان کا اسیہ چار روپے ماہانہ تنخواہ جب تک پیشین ہوئی تھی کہ وہ ماہ بہ ماہ ۱۱ ہوتا رہا۔ قدر میں پیشین بند ہو گئی تو یہ پورے ماہ کا چھوٹا سا مٹی کا ٹکڑا تھا۔ میں پھر بھی ہونی پیشین یکس نشست ملی۔ تو ماہ اکر یہ ادا کیا کہ ٹکڑا اٹھائی ہوئی رہا کہ جولائی سنہ ۱۸۷۵ء کے مکتوب میں سے غالباً کراہ پر نہیں لی تھی بلکہ نفرت رہنے کو مل گئی تھی معلوم نہیں ہونے کا کہ اس جیل میں وہ کیا ہو گیا رہا۔

نیا مکان امیر انشیاں ہے کہ بعد ازاں انہوں نے ایک اور مکان کراہ پر بنوایا۔ اس لئے کہ جولائی سنہ ۱۸۷۵ء کے ایک مکتوب میں مرزا اب غلام الدین احمد خاں نے کہا ہے کہ میں نے کہ یہ سات کی شدت کے باعث مکان میں انجانہ بہت سی مٹی بنی ہوئی تھی۔ مالک مکان مرمت کراوے:

میاں میں رٹی سعیدت ہوں۔ محل سرائی دیوار میں گر گئی ہے۔ پاخانہ اٹھ گیا پیشین ٹپک رہی ہیں تھوڑی دیر کی دیکھنا کہ بتی ہیں اسے دیلی ہائے مری دیوار انخانہ کا محل محل مراد سے سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے بھر گیا ہوں۔ پیست چھلنی ہو گئی ہے۔ ابرو دیکھنے پر سے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ وہاں کے مکان سے کہ مرمت کیے تو کیرنگ

کے مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ پھر اثناء مرمت میں بیٹھا۔ کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے۔ تو برسات تک بھائی (نواب امین الدین احمد خاں) سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاحاقہ مع دالان زیریں جو الہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائیگی۔ مرمت ہو جائیگی، پھر صاحب لوگ (غالب) اور سیم (بیگم) اور بابا لوگ (باقی علی خاں اور حسین علی خاں) اپنے قدیم مسکن میں آ رہے گے۔ تمہارے والد کے ایشاد و عطا کے جہاں مجھ پر اور احسان ہیں، ایک یہ مروت کا احسان میرے پایا بن عمر اور سہی۔

اگر یہ مکان وہی ہوتا۔ جو مفت رہنے کو ملا تھا۔ تو مالک مکان سے مرمت کرانے کا سوال درمیان نہ آتا۔

نواب امین الدین احمد خاں نے غالب کی خواہش پر یہی کر دی، یعنی مطلوبہ مکان ان کے حوالے کر دیئے۔ لیکن اس دوران میں مینہ کا زور ختم ہو گیا۔ اور جس نقدان راحت نے انہیں تبدیل مسکن پر آمادہ کیا تھا۔ وہ زائل ہو گیا۔ لہذا وہ پہلے ہی مکان میں رہنے لگے۔ چنانچہ اگست ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

تم نے میانجی گری کی بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے۔ ہر وہ سلامت رہیں۔ ہم اس حویلی میں تاقیاست رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ مینہ کی شدت سے چھوٹا رکا (حسین علی خاں) ڈرنے لگا۔ اس کی رادی (بیگم غالب) بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غریب رویہ اور اس کے آگے کا چھوٹا سا دروازہ، جہاں تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی تو اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محل سرا بنایا جاتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اخیل، اکا جھن، تیلن، تنبولن، کہری، بٹہ باری، ان فرقوں کا مرکز (گڑگڑ) دروازہ رہیگا۔ میری اور بچوں کی آمد و نواں خانہ جس سے پہلے۔ عبادت اللہ وہ لوگ دیوانہ ہیں سے آئیں، اپنے بیگانے کو ہر وقت پچھلپائیاں تھراتیں۔ مگر اس سردی کو اپنے آدمیوں کے لئے اور رکوں کے مکتب کیسے ہرگز کافی نہ جانا۔ موراد کبوتر اور

ذنب اور کبری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔ عرف ربی، نسیخ الغرام پڑھا۔ اور چپ ہو رہا۔ مگر
تہاری خاطر جمع ہے، اسبابِ حشت و خطرات نہ ہے۔ منہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد
شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے۔ نہ بی بی گھبراتی ہے، نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات،
ہوا سرد، تمام رات فلک پر امنیخ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا۔
ادھر مشرق سے زہرہ بجلی۔ بسوچی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جانے کو بہت یار
سمجھتے تھے۔ حکیم محمد حسن خاں صاحب والا مکان اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک
نئے مالک نے انہیں زیر دستی نہ اٹھایا۔ اور یہ مکان نئی قیام گاہ مفت مل جانے کے
باوجود نہ چھوڑا، اگرچہ وہاں آرام نہ تھا۔

پھر نکال دیا۔ | ستمبر ۱۸۵۵ء میں پھر نئے مکان کی تجویز ٹھہری۔ اور ساڑھے پانچ روپے
کرایہ پر ایک مکان روک لیا گیا۔ ایک مہینے کا کرایہ ادا کر دیا گیا۔ لیکن رام پور کے دوسرے
سفر تک اس میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو رام پور سے
۱۲ نومبر ۱۸۵۵ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

مکان کے روکنے کو وکس طرح نکھوں؟ شاید مدین خاں کو لکھا، شمشاد علی بیگ کو لکھا اب تم کو
لکھتا ہوں۔ ستمبر کے ساڑھے پانچ روپے دے آیا ہوں۔ مکتوب تو سب دسمبر پر۔ اٹھ سو روپے، اگر روزگ
بلکہ موقع بنے گا تو یہ سبایہ یہاں سے طریق بند دینی چھوڑ دینا۔ اس کا عیل خاں صاحب کو میری دعا ہو
اور یہ کہ ڈیڑھ مئی کی بیٹھری ہو ادیس اور حویلی کے پاخانے کی صورت درست کرادیں

۱۵۔ اردو سے معلوم ہے اس مکتوب پر تاریخ ۱۸۵۵ء کے بجائے سنہ ۱۲۷۵ درج ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ غالب
نے صرف دو مرتبہ رام پور کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۵۶ء میں گئے۔ اور ۱۷ ستمبر ۱۸۵۶ء میں واپس آئے۔ دوسری مرتبہ
نوبت عیل خاں کی سندھسی کے جشن میں شرکت کے لئے اکتوبر ۱۸۵۶ء میں گئے۔ اور جنوری ۱۸۵۷ء میں واپس
آئے۔ لہذا اس خط کی صحیح تاریخ ۱۲ نومبر ۱۸۵۶ء نہیں بلکہ ۱۲ نومبر ۱۸۵۵ء ہونی چاہیے۔ مطبوعہ اردو سے معلوم
ہے ایسی کئی غلطیاں ہیں - ۱۶

یہی مکان ہے جس میں غالب کا انتقال ہوا۔

برسات کی تکلیف اس مکان میں بھی باقی رہی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء کے ایک خط میں
فشی ہر کوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :-

برسات کا حال تمہیں ہی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایہ کی جوتی میں
رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کتنی صورت
دن میں دو چار بار برسے۔ اور بار بار اس قدر دھڑکیاں پڑیں کہ بال خانہ کا جودالان مہرے بیٹھنے اٹھنے
سوز جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے اگر جگہ اتنی ہے، لیکن چھت چھنی ہو گئی کہیں لگن، کہیں چھت چھنی ہو گئی کہیں لگن
رکھ دیا، قلمدان کتبیں، اٹھار تو شد خانہ کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے۔ مالک مرست کی طرف متوجہ نہیں
کشتی نوح میں تین مہینے پہنچنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات پائی۔

مکان اگرچہ اپنا کبھی نہ بنوایا اور معاوم ہوتا ہے۔ کہ کبھی اچھا مکان نہ ملا۔ لیکن مصیبت
اس بارے میں بھی بڑا بلند تھا۔ حکیم غلام نجف خاں نے غالباً ایک مکان تجویز کیا تھا۔
اس کے متعلق صاحب موصوف کو لکھتے ہیں :-

حضرت غور کی جگہ ہے باب مکان دکاتا، کوچے کی سیر بازار کا مناشا، دکرے، درکھڑیاں، آتشداں
صحن وسیع۔ اس کو چھڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے آخر ہے؛ دروازہ تاریک، کہ دن کو
بغیر چراغ کے راہ نہ ملے اور پیر پڑھی پر غلط خوردوں کا مجمع، گوہ کے ٹھیکر کہیں حلال خوری کا پتہ
ہمسرا ہے، کہیں بیل بندھا ہوا ہے کہیں کوڑا پڑا ہے۔ عیاذ اللہ! خدا نہ لے جائے
ایسے مکان میں :-

۱۰ کوچہ بلیاں میں سے گلی تاسم جان میں ٹریں تو میں موٹر پر بائیں ہاتھ مسجد ہے۔ اس مسجد کے سامنے کا مکان
جو ہندوستانی دواخانہ کی موجودہ عمارت کا ایک حصہ ہے، غالب کا مکان تھا۔ نظر کا ہر س کی ہیئت اب بدل گئی ہے
حضرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ اسے ہندوستانی دواخانہ نے اپنے گودام کے لئے لے لیا۔ اور کئی تبدیلیاں
کرائیں۔ تاہم ایک کمرہ جو سرراہ تھا غالباً بچھلی ہیئت پر باقی ہے۔ اسی میں شب و روز مرزا کی نشست ہوتی تھی :-

پانچواں باب

سفر کلکتہ

اگر یہ دل نہ تملد ہر چہ از نظر گزرد

نہ ہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

سیاحت کے متعلق غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں دو مفاد درائیں

منشی ہیں۔ فارسی کے ایک مکتوب میں رائے چیمچل کو لکھتے ہیں :-

جلاوطن اعزہ سفر و آدم غربت مصیبت است کہ نصیب هیچ آفریدہ مباد!

اردو کے ایک خط میں مہیاں داؤد خاں سیاح کو تحریر فرماتے ہیں :-

ہیں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت

لکھی ہے۔ اسی طرح زندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں میری سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں:

اگر یہ دل نہ تملد ہر چہ از نظر گزرد

نہ ہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

خیر اگر سیر و سیاحت میرزا سہی ذکر العیش پر قناعت کی۔ میاں داد خاں سیاح کی سرگزشت
سیر و سفر ہی سہی۔

ان دو لوگوں رایوں میں تطبیق مشکل نہیں صرف اتنا جان لینا کافی ہے۔ کہ پہلی
رائے اس وقت کی ہے جبکہ غالب خود سفر میں تھے۔ دوسری رائے حالت حفر
کی ہے۔ وہ سیر و سیاحت کو واقعی دوست رکھتے تھے۔ لیکن نازک مزاجی کے باعث
ان شدائد کے تحمل اور ان تکالیف کی برداشت کے اہل نہ تھے جو لازماً سفر ہیں۔
اس لئے جب خود سفر میں تھے۔ اور قدم قدم پر مختلف تکلیفیں پیش آرہی تھیں یا
دورانِ سفر کی بے نگرانی اور فراغت بال میرزا تھی تو پکار اٹھے کہ غربت کے آلام
خدا کرے کسی کو نصیب نہ ہوں۔ لیکن جب حالت حفر میں دوسرے شخص کے
سفر کے دلچسپ حالات پڑے تو آرزو پیدا ہوئی کہ ایسے حالات کے مطالعہ سے
لطف اندوزی کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔

سفر کاکہ کی تاریخ غالب نے صرف ایک لیا سفر کیا ہے۔ جب وہ خانہ اتی پیش کے متعلق
قانونی چارہ جوئی کے لئے کھلتے گئے تھے۔ اور کچھ کم تین برس دہلی سے باہر رہے۔
اس کی تاریخ کے متعلق غلط فہمی چلی آتی ہے۔ جو خود غالب کی ایک تحریر سے پیدا
ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ سن ۱۸۳۱ء میں کھلتے گیا تھا۔ سوارخ نگاروں نے اس
بیان کو بلا تحقیق درست تسلیم کر لیا۔ حالانکہ غالب کی فارسی تثر میں بعض مفصل
بیانات موجود ہیں۔ جو اس تاریخ کو غلط ثابت کر رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ خواجہ حاتمی
مرحوم بھی اس بارے میں سہو سے محفوظ نہ رہے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق کو پیش نظر رکھئے، حقیقت حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

(۱) غالب دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو فخرالاولہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروزپور چھوڑ کر زندہ تھے۔ کلکتہ کے راستے میں نواب موصوف کے انتقال کی خبر ملی میرزا علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں،

میر فضل مولے خاں نام یار سے داشتہم اور ناگزیر ذلت در عرض راہ خبر شد در نورو گفتگو باو پس دجو با کہ رفت از جامہ نرا شن فخرالدوار نواب احمد بخش خاں، بمن خبر داد۔ باز بہ کلکتہ میرزا افضل بیگ و دیگران برگشتند۔ آدخ کہ چرخ روشن این دو دواں مرد۔

نواب احمد بخش خاں کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۴ء (مطابق ربیع الاول ۱۲۴۳ء) میں ہوا۔ تاریخ وفات "میںو مقام فخرالدولہ" ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب اکتوبر ۱۸۲۴ء سے چند ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔

(۲) کلکتہ جاتے ہوئے وہ لکھنؤ میں بھی ٹھہرے تھے۔ ان کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں معتمد الدولہ آغا میراودھ کے نائب السلطنت اور وزیراعظم تھے۔ اور غازی الدین حیدر کی وفات تک (۱۹ اکتوبر ۱۸۲۴ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ء) مختار کل رہے۔

۱۔ میرزا افضل بیگ، بن مرزا جیون بیگ کبیران بدخشی، جو دربار دہلی کی طرف سے کلکتہ میں وکیل تھے۔

۲۔ کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵ و صفحہ ۱۵۷

اس کے بعد نصیر الدین حیدر کا عہد شروع ہوا چند ماہ کے اندر اندر آغا میر
برطرف ہو گئے اور ان کی جگہ اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت بنے۔
غالب بہر حال آغا میر کے زمانہ اقتدار میں لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ اور
یہ واقعہ اکتوبر ۱۸۲۷ء سے پہلے کا ہونا چاہیے۔

(۳) کلکتہ پہنچ کر غالب نے اپنا مقدمہ کونسل میں پیش کیا تھا تو اس کے ممبروں میں
ایک شخص ولیم ہیلی تھے۔ غالب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ولیم ہیلی سیاست
کے لئے برآمد ہوئے تھے۔ یہ مقدمہ پیش ہو جانے کے بعد غالب کہ وہ بیش دو
برس کلکتہ میں رہے اور ولیم ہیلی ۱۸۳۰ء میں پنشن لے کر تمام کاروبار
سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ غرض کہ ولیم ہیلی کے پنشن لینے سے کم از کم
دو برس قبل غالب ضرور کلکتہ پہنچ گئے تھے۔

(۴) مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تھا تو اس وقت حکومت ہند کے چیف سکرٹری
ایڈیوایٹ اسٹرننگ تھے۔ جو غالب کے خاص ہمدرد بن گئے تھے۔ ان کی مدد میں
غالب نے کچھ شعر کا ایک قصیدہ کہا تھا۔ اسٹرننگ نے ۱۸۳۰ء کو وفات
پائی جیسا کہ غالب ان کے قطعہ وفات میں فرماتے ہیں،
بہ سند نشاطی و پنج سالہ از دنیا جریدہ رفت و جواناں چنان و زینیں

۱۔ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۹

۲۔ ڈکشنری آف انڈین لٹریچر صفحہ ۳۱

۳۔ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷

۴۔ کلیات نظم فارسی صفحہ ۲۸۲

۵۔ ڈکشنری آف انڈین لٹریچر صفحہ ۲۱۵

بہ روز بست و سیم از مٹی بہ ہنگامے کہ بود خسرو انجم بہ برج ثور میکس

ہزار و ہشت صد و سی زر عید عیسے بود

کہ جست برق جہاں سوزاں الم ز کیس

اینڈریو اسٹرلنگ کی وفات کے وقت غالب دہلی واپس آچکے تھے۔ لہذا اس کے

سفر کلکتہ کی تاریخ اس واقعہ سے کم و بیش تین برس قبل مانتی چاہیے۔

۵) غالب کے اپنے بیان سے ثابت ہے کہ وہ دو برس کلکتہ میں گزار کر ہرجاؤں

۱۲۴۵ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی پہنچے۔ خواہہ سلام غوث خاں بے خبر کے

نام کے ایک خط میں ۱۸۲۹ء کی واپسی کی تصریح بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں،

حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا ہے۔ ۱۸۲۹ء میں نہایت طبع، سادہ کے واسطے کہ نہ

اور مغان لایا ہوں صحیح یوں ہے،

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سوئے نہیں

قبلہ بندہ رات بھر میں غم سے کچھ کھائے نہیں

بہ ہر حال ۱۸۳۰ء میں کلکتہ جانے کا بیان کسی حالت میں بھی قابل تفسیر نہیں

میراجیال ہے کہ یہ باتوں باعث کی غلطی ہے یا مانتا پڑیگا کہ غالب کو سہو ہوا اور

چونکہ یہ خط سفر کلکتہ سے کم و بیش چالیس برس بعد لکھا گیا۔ اس لئے تاریخ

کے باب میں ۳۰ و مستقبل نہ تھا۔

دہلی سے روانگی | اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب دہلی سے کب روانہ ہوئے؟ ایک فارسی مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ۲۶ رذی قعدہ کو لکھنؤ سے چل کر ۲۹ رذی قعدہ کو کانپور پہنچا۔ اس میں سال درج نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ مشکل نہیں۔ نواب احمد بخش خاں کی وفات ربیع الاول ۱۲۴۳ھ میں ہوئی اور اس وقت غالب کلکتہ کے قریب پہنچے ہوئے تھے۔ لہذا ماننا چاہیے کہ وہ رذی قعدہ ۱۲۴۲ھ (مطابق مئی ۱۸۲۷ء) میں لکھنؤ میں تھے۔ اس زمانے میں غازی الدین حیدر بادشاہ اور وہ تھے۔ میرے نزدیک اغلب ہے کہ وہ عید شوال ۱۲۴۲ھ کے بعد یعنی اپریل ۱۸۲۷ء میں روانہ ہوئے ہوں گے۔

خواجہ حالی بیان | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے تو نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ یہ خواجہ مرحوم کا کہنا ہے

۱۔ کلیات شرفا سی صفحہ ۱۵۰

۲۔ غالب کے کلیات شرفا سی میں ایک شریعت تعطیل میں ہے جو فتح الدولہ عامبر کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس پر مرحوم الحرم کی تاریخ درج ہے سال درج نہیں۔ مگر فرض کیا جائے کہ سال ۱۲۴۲ھ تھا تو ماننا پڑے گا کہ غالب محرم ۱۲۴۲ھ میں آگست ۱۸۲۷ء سے پہلے لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ بعد وہ رذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق جون ۱۸۲۷ء تک وہیں مقیم رہے مگر ترکی تاریخ ۲ محرم ۱۲۴۳ھ (۶ جولائی ۱۸۲۷ء) تک وہیں ہی رہے اور رذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ سے چلنے کے متعلق غالب کے بیان کو درست سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے بیس میل مرام چلے گئے کانپور پہنچے تو اکھنڈ کے دستوں نے انہیں دوبارہ بلایا۔ واپس جا کر وہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ ٹھہرے۔ پھر حصول مقصد کی طرف تشریف لے گئے۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت میں ماننا پڑے گا کہ وہ ۲۸ رجب دس مہینے لکھنؤ میں ٹھہرے۔ مجھے یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ وہ عید شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۲۷ء) میں دہلی سے نکلے مہینہ بھر لکھنؤ میں رہے پھر سفر فرما کر روانہ ہو گئے۔ کانپور سے دوستوں نے واپس بلایا۔ غالباً امید دلائی ہوگی کہ حالات رد براہ ہو گئے ہیں۔ لہذا دوبارہ رحمت سفر وارا کی مہینہ بھر پڑیاں کھڑے جب کوئی صورت امید کے مطابق نظر نہ آئی تو کلکتہ روانہ ہو گئے۔

۳۔ دھما غالب صفحہ ۲۵

غالب کی متعدد تحریرات میں صراحت مرقوم ہے کہ ان کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت تھے۔ معتمد الدولہ کے بعد اعتماد الدولہ میر علی نائب السلطنت بنے۔ ان کے بعد منتظم الدولہ حکیم ہمدی علی خاں کو نیابت کا منصب عطا ہوا۔ حکیم صاحب کے بعد نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ نائب السلطنت اور وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت غالب کو سفر کلکتہ سے واپس آئے ہوئے کم و بیش دو برس گزر چکے تھے۔ خواجہ مرحوم کو یہ سہو غالباً اس وجہ سے ہوا کہ نصیر الدین حیدر کے قصیدہ میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے۔

خواجہ صاحب کا یہ ارشاد بھی درست نہیں کہ کلکتہ جانے کے وقت غالب کی عمر ”کچھ کم چالیس برس“ کی تھی۔ دہلی سے روانگی کے وقت غالب کی عمر سن قمری کے اعتبار سے چند ماہ اور تیس برس کی ہوگی۔ سنین شمسی کے اعتبار سے چند ماہ کم تیس برس کی ہوگی۔ اگر خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق ۱۸۳۱ء والے بیان ہی کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں بھی غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس کی مانتی چاہیے تھی اور میر سوانح کی کتاب میں تینتیس برس کی مدت کو ”کچھ کم چالیس برس“ سے تعبیر کرنا محتاط طریق بیان نہیں۔

سفر کلکتہ کی عرض اور عرض کیا جا چکا ہے کہ سفر کلکتہ خاندانی پنشن کے مقدمہ میں قانونی چارہ جوئی کے لئے اختیار کیا گیا تھا جس کے تفصیلی حالات ایک علیحدہ باب میں بیان ہوں گے۔ یہاں اختصاراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ غالب کے خیال کے مطابق جو پنشن انہیں فیروز پور بھر کے سے ملتی تھی، وہ مقررہ رقم سے کم تھی۔ دوسرے یہ تھا کہ انہیں اور دوسرے اہل خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ ملنے چاہئیں۔ فیروز پور بھر کے والے تین ہزار روپے سالانہ دیتے تھے۔ جب تک اس ریاست کی عنان نظام نواب احمد بخش خاں کے ہاتھ میں رہی، غالب خاموش بیٹھے رہے اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ نواب موصوف پنشن کے علاوہ بھی غالب کی امداد فرمائے رہتے تھے لیکن جب

احمد بخش خاں نے ۱۸۲۶ء میں ریاست اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر کے خود گوشہ نشینی اختیار فرمائی، تو جھگڑا پیدا ہو گیا اور غالب کو پوری پنشن کے لئے چارہ جوئی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لودھارہ فرماتے تھے کہ شمس الدین احمد خاں نے پنشن بالکل بند کر دی تھی۔ بہر حال پنشن ہی کے متعلق چارہ جوئی کے سلسلے میں کلمکتہ کا سفر اختیار کیا تھا۔

منازل سفر | دہلی سے لے کر لکھنؤ تک کے منازل سفر کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدا میں لکھنؤ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا،

مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا (غالب) ایک بار لکھنؤ آئیں اس لئے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔

قیام لکھنؤ | بہر حال غالب ماہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ میں تھے۔ اکابر لکھنؤ لے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ امید تھی کہ پادشاہ لکھنؤ سے انہیں اچھی رقم مل جائے گی۔ اس وجہ سے وہ کافی دن ٹھہرے رہے یا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کانپور جا کر دوبارہ لکھنؤ آئے۔ انہوں نے پادشاہ یا نائب السلطنت کے لئے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا۔ آخر الذکر کے ساتھ ملاقات کی صورت سامنے آئی تو جلدی میں ایک نثریہ صنعت تعطیل لکھ لی، جو ان کے کلیات نثر میں موجود ہے۔ خود فرماتے ہیں،

مہربان! گرد آمدند و بزرگان! بھمن شدند در فتنہ رفتہ ذکر خاکسار یہاں سے مراد بزم آغا میر نامی از سادات عامہ آل دیار کہ در آل روز یاب آہنگ معتدل و گلی بلند آوازہ بود بہ ترخانی فرمانرواے آل کشور و ملازم نامی آل سلطنت اشتہار داشت رسا بندہ تا از ان بجانب ایما کششے رفت و ازیں سوئز آشوب سے گل کرد چون ملازمت قرار یافت خواستم دشمایہ عقیدتے سر انجام دہن و رہ آورد عالم عبودیتے

عرضہ داشتیں۔ طبع از فکر قصیدہ شکی کرد و بیمنہ بریں آرزوئی جنون شوقم بہ بیدارے کسرا پیدا
نثر انداخت و سواد عبارتے ہم در صنعت تعطیل روشن ساخت۔

لیکن معتدالہ دولہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ غالب لکھتے ہیں :

اگرچہ وقت انتضاء ویدن آن جاوید نہ کرد و آن بوس از سینہ بدر رفت اما آن مسودہ در
سفینہ ماند۔

غالب نے ملاقات نہ ہو سکنے کی وجہ محض یہ لکھی ہے :

آنچہ در باب لازمست قرار یافت، خلاف آئین خویشین دارمی و ننگ شیوہ خاکساری بود تفصیل
ایں بحال و توشیح ایں بومام جز بہ تخریر ادا نتوان کرد۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے ملاقات کی دو شرطیں پیش کی تھیں۔

(۱) نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں۔

(۲) نذر پیش کرنے سے انہیں معاف رکھا جائے۔

یہ شرطیں منظور نہ ہوئیں اور ملاقات کی صورت بن کر بگڑ گئی۔

آغا میر کے متعلق غالب کی رائے | غالب رائے چھبوں کو معتدالہ دولہ کے متعلق لکھتے ہیں :

ہرچہ در آن بلد ز کرم پیشانی و فیض سانی میں رز طبع سلطان صورت ہی معتدالہ دولہ آقا میر شفیہ مہر شد
بخدا کہ حال بیکس است و ابتدا دوست بہ کز آلت حصول مددے خود دید بپیشہ مجید، جرم یک دو کین ہر گز متنع گشتند
و اکنون کہ نامستحکم اساس دولت خود و طریش جمع است در بند تخریر افتادہ است بملکہ فائدہ نامے قدیم لکھنؤ از
بیدادیں ہر جم بہ سیلاب قناریہ و ناز پرور و گلابیں یار آوارہ جہات گیتی گریز و خود از قہر سی و اسرف خود پشیمان
شدہ و انیس شیوہ برگشتہ بالجملہ بازار بیداد کرم است مہاجران ساہوکاران تاجران نہاں نہاں رومال خود بہ
کاپنور سے رسانند و ایمین غیندہ ہر کہ بود گزشت و ہر کہ ہست در بند بختن سند چون عالی یار بدیں رنگ
است آن خوشتر کہ منحن از خود نہ گویم بتاریخ بست و ششم ذی قعدہ و در جہد زان ستم آباد بیداد و بتاریخ
بست و نیم در دار اسر کاپنور رسیدم میں جادو سے مقام گزیدہ رہ کر اسے باندھے شوم۔

معتمد الدولہ آغا میر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ذاتی ناکامی پر دل تنگی کا نتیجہ قرار نہ دیا جائے بلکہ یہ حرفِ فحش اور سست ہے۔

غالب کے اردو دیوان میں ایک غزل کے آخر میں قتل ہے :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر و تماشا سودہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر و بخت و طوف حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جاوہرہ کشش کاف کرم ہے ہم کو
اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل لکھنؤ میں لکھی گئی۔ اغلب ہے اس زمانے کے کسی مشاعرہ کی طرح ہر کسی گئی ہو اور مشاعرہ میں پڑھی گئی ہو۔

سید غلام محمد کا مہم سید محمد اور غلام محمد : وہ مختار الدین شہر جب تھوڑا سا کشمیری تھا اور غازی الدین حیدر کی ولایت کے زمانے میں غلام محمد کے عہد پر مامور تھا۔ مسند نشینی کے سلسلے میں اس نے غازی الدین حیدر کی عانت میں سرگرم حصہ لیا۔ غلام محمد کے بعد میں وزارت کا فرائض بایا سکھ میں برس کے بعد وہ معزول ہو گیا جب سربراہی میں مصلحت نے وہ کو شاہانہ بی کے حلقہ حاکمیت آزاد کرنا چاہا تو غلام میر پور بھرتی کر دیا گیا۔ اسی کی وجہ سے مختار الدین حیدر نے پادشاہ شاہ شاہ اور خود اسے نائب سلطنت کا عہدہ مل گیا۔ اس وقت سے لیکر غازی الدین حیدر کی وفات تک غلام میر پور مختار بادشاہ کی طرح کام کرتا رہا۔ اسے پانچ گنے بڑھایا جسے پانچ گنا نکالا۔ جسے مختار دیکھا۔ غازی الدین حیدر نے بہ سہولت کھانڈی بنا کر سارے صوبہ رات خود سنہال لے گئے۔ اس کے زمانہ اقتدار کے غریب واقعات سننے گئے ہیں مثلاً ایک سو چار سو لاکھ روپے کا ٹوناٹاری مرید صاحب اس نے روپیہ مانگا تو غلام میر نے مشورہ دیا کہ تم پادشاہ سے ملاقات کرو۔ قرائن و اشاروں میں تمہارا اعتبار بڑھ جائے گا۔ وہ غریب رہی ہوگی۔ سو اتفاق سے اس کا ہم بہت فریب اور رنگ بہت سیاہ تھا۔ بارہا بی کے لئے شاہی محل میں بھی پادشاہ باہر آئے تو دور سے اسے دیکھتے ہی گھبرا کر پکارا اٹھتا ہے کون ہے یہ کہوں ہے غلام نے آغا میر کی ہدایت کے مطابق عرض کیا : دیو باجن معلوم ہوتا ہے پادشاہ نے شور مچایا "ا" سے پکڑو "ا" سے پکڑو "ا" اندر دھک دے گئے۔ غریب سا ہو گیا پکڑا۔ جب اس نے دیکھا کہ دولت انتہا کو پہنچے والی ہے تو آغا میر کے قدموں پر گری پڑا اور وہیں لاکھ روپے کی فارغ حلقی لکھ دی۔

ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ پادشاہ کا ایک منہ چڑھا صاحب تھا۔ آغا میر نے اسے حکم اٹھ بٹھوایا۔ پادشاہ نے اس کے متعلق بار بار پوچھا لیکن ہم روزہ جواب ملا کہ وہ مر چکا ہے۔ ایک روز پادشاہ باہر سیر کر رہے تھے تو وہ صاحب فاصلے پر نظر آیا۔ غازی الدین حیدر نے کہا دیکھو وہ فلاں شخص ہے۔ آغا میر اور اس کے رفیقوں نے متعجب ہو کر عرض کیا غلام بارگاہ کو تو نظر نہیں آتا، حضور کی آنکھوں پر کچھ دھس ہے اس لئے امداد و اح کی شوق بھی عمارت نظر آتی ہے پادشاہ بر حیدر کتار دیا کہ اسے بلاؤ کیس غلام میر نے نفیس دہا کہ وہ شخص مر چکا ہے اور پادشاہ کو شخص اس کی طرح مجسمہ درت میں نظر آتی ہے۔

غرض آغا میر نے آٹھ دس برس تک دوا دھ کو بہت بڑی مہرج مراد کیا۔ غرض پادشاہ سے انگریزوں کو قرض لاکر اس کا سود اپنے نام لکھوایا۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر پادشاہ ہوئے، انہوں نے چند ماہ کے بعد آغا میر کو معزول کیا اور اس سے حساب لینے کی کوشش کی لیکن غلام میر کے تعاون بن گئے۔ وہ دوسری نگرینوں کی حفاظت کے بھروسے پر لکھنؤ میں خانہ نشین رہا۔ آخر سنہ ۱۳۳۷ میں انگریزوں کی حفاظت میں لکھنؤ سے نکل کر اپنے اس و متاع سمیت کانپور گیا۔ وہیں دو سال کے بعد وفات پائی اس کی اولاد غالباً اب تک کانپور میں ہے ۱۲ -

دیوان غالب کے ایک قلمی نسخہ میں جو دیوان سفر کلکتہ میں لکھا گیا تھا، آخری شعر یوں مرقوم ہے:

لائی یاں معتد الدولہ بہادر کی اُمید

جادہ رکشش کاف کرم ہے ہم کو

یہ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہے کہ غزل لکھنؤ میں کہی گئی "یاں" سے مقصود لکھنؤ ہے اور غالب کسی ایسی مجلس کے لئے کہی گئی جس میں ختم الہولہ کے شمول کا یقین تھا۔

لکھنؤ سے باندہ لکھنؤ سے چل کر غالب کا پورا جوتے ہوئے باندہ پہنچے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ان کے رشتہ دار بھی ملتے مولوی محمد علی تھان صدر امین باندو کے نام انہوں نے کلکتہ کے راستے سے کسی خط بھیجے جو کلیاتِ نثر میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات آگے آتے ہیں۔

دیوان غالب کے جس قلمی نسخہ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اس کے ہاشم پر بعض غزلیں مرقوم ہیں۔ اور ان پر لکھا ہوا ہے از باندہ فرستادہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزلیں باندہ میں ہی لکھی گئی تھیں۔ انہی میں سے دو غزلوں کے مقطع یہ ہیں:

تھی وطن میں نشان کیا غالب کہ ادغریت میں قد

بے لطف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

۱۷ اردوئے معلّے میں ایک خط میں نواب ادور بہادر شفق کو لکھتے ہیں:-

"میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار نادر کی حقیقتی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا۔ اور مستند نشین مال

کا چچا تھا۔ وہ باعثِ شوا تھا۔ میرے باندہ بوندیل کھنڈ گئے کا:-

بہ خط اگرچہ سفر کھارتے سے بیس پکیں برس بعد کا ہے لیکن جو رشتہ نامیہ بیان کیا ہے وہ یقیناً بیس پکیں برس پہلے کا ہوگا

۱۸ دیوان غالب کا یہ قلمی نسخہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے پاس تھا اب سجادتِ نوری شریف علی صاحب نے حافظ مرحوم کی کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ خرید لیا تھا۔

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں؟

باندہ سے بنارس تک | باندہ سے نکلتے کے بعد مولوی محمد علی خاں صدر امین کو جو خطوط بھیجے

ان سے بعد کی چند منزلوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً باندہ سے روانہ ہو کر ڈوڈھ

موڈہ میں قیام کیا۔ ایک رات دوستایں بسر کی۔ پھر چلے تارا پہنچ گئے۔

فرماتے ہیں:-

روز پنج شنبہ در موڈہ رسیدہ تا یک شنبہ بہ آرائش گراں بدوشنبہ کوس جیں کو فتنہ شبے بدوستا بسر بردہ

سہ شنبہ در چلتہ تارا رسیدہ باداد اداں اگر حیات باقی است بیسج راہ فتح پور کردہ خواہ شد۔

موڈہ سے غالب نے سامان کے لئے ایک گاڑی کرایہ پر لے لی تھی جو بڑی سست

رفتار تھی۔ اس کے انتظار میں رات دوستایں بسر کی تھی۔ دوسرے روز غالب

چلتہ تارا پہنچ گئے۔ لیکن گاڑی وہاں بھی دیر سے پہنچی۔ موڈہ اور چلتہ تارا کا درمیانی فاصلہ

اگرچہ صرف بارہ کوس کا تھا۔ لیکن گاڑی کی سستی رفتار کے باعث دو روز میں

یہ مشکل طے ہوا۔ فرماتے ہیں:

دو شنبہ از موڈہ بر آدم گردونکے کہ دیں ملک بہ لڑخاموسوم است برائے بار کشیدن یا فتم

چوں از من نہ عیفت الخلق ترائق تادہ بود آں آہستہ خرام بلکہ مخرام دوازہ کردہ رات ترائق

برید و آہستہ تار تار رسید ناچار شبے بہ دیہے دروستا اتفاق اقامت افتاد۔ سہ شنبہ از شب

رواں شدم۔ من خود دوپہر روز برآمدہ بہ سرائے چلتہ آرا رسیدم دآں ہیچ خرام بلکہ مخرام تا

ساعتنے از شب نہ گزشت۔ بہ من نہ پیوست۔

میرزا مغل نے باندہ میں کہہ دیا تھا کہ اگر مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجنا ہو تو چلتہ تارا

کے تھانہ دار کو دے دینا۔ غالب نے چلتہ تارا پہنچ کر خط لکھا۔ تھانہ دار سرائے میں

آیا۔ اور ادھر ادھر پھرنے لگا۔ تو غالب نے ارسال خط کے باب میں اعانت چاہی تھانہ دار

نے خط بھیجنے کی ہامی بھری، لیکن انداز گفتار غالباً تاخوشگوار تھا۔ غالب اس سے اتنے مکدر ہوئے کہ خط تھانہ دار کے حوالے کرنے کے بجائے ایک مسافر کو دے دیا جو باندہ جا رہا تھا۔ لکھتے ہیں:

میرزا مغل صاحب در باندہ فرمودہ بودند کہ عریفہ مولوی صاحب بہ تھانہ دار چلے تار حوالہ بیاہ کرد و دو
خواہر رساند اتفاقاً آخر روز بلکہ اول شب بہ کارواں سرانے چلے تار اور انتظار گرد و نک و امانگان
راہ نشسته بودم کہ ناگاہ تھانہ دار بہ کارواں سر رسید ہر سو خرامیدن آغاز کرد۔ و رہا بہ ارسال
نامہ عانت حستہم، اگرچہ پذیرفت، اما پذیرفتن سخت سنبہانہ بود چنانکہ لمیع ابا کرد و گوارانہ شد
مکتوب بہ سے دادن۔ رہروے مجھوں لالہ احوال چوں نام جناب از من شنو و نامہ بہ مجھ از من طلب کرد
پہلے خط میں غالب نے لکھا تھا کہ وہ چلے تار اسے فتحپور جانیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ گاڑی کی سستی رفتار سے تنگ اگر مجبوراً فیصلہ کر لیا کہ کشتی میں سوار ہو کر دریا کے
راستے الہ آباد پہنچیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

آخر از بیدار کردن دہل متوہ آمدہ خود را بہ دریا انداختم یعنی ہم ازیں مقام کشتی بہ کر یہ گرفتہ و آدم و
متاع ہمدرد و گنجیہ و لیسیم اللہ مجربا و مرہبا بر خواندہ سفینہ در رود ہمیں اندہ ام منظور اس کہ الہ آباد
رسیدہ توقف کرد بنارس میں خواہم کرد ہم دیں بقو کار بندم و رونے چند آسائشہ کردہ مایحتاج بہامضا
رساندہ رہگراشوم و دیگرہ جزم شد آباد بہ بنگا در میج جا توقف نہ کریم، حال سفر دیانیزدیں دوسرے روز
پہنہاں نخواہد ماند۔ کشتی باناں گویند کہ در عرضہ سہ روز بہ الہ آباد رسیدہ خواہ شد۔ میں تو اس دیدہ ایک
روز چہا شنبہ قریب نیم روز در کشتی نشسته دل بہ خدا تہ نہ نا خدا، البتہ ام۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب الہ آباد میں کتنے روز ٹھہرے اور وہاں سے بنارس
پہنچ کر کتنی مدت قیام کیا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ بنارس میں بھی کافی مدت ٹھہرے
رہے۔ اس شہر کی تعریف میں ان کی ایک مثنوی موسوم بہ چراغ دیدہ ہے، جو فارسی
کلیات نظم میں موجود ہے۔

ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ باندہ میں وہ دروہ اور بخار سے علیل ہو گئے تھے۔
مولوی محمد علی ناں صاحب سندراہین باندہ کو چلتا رہا اسے لکھتے ہیں:
لہذا الحمد کہ زحمت صداع و غمی از ساحت طبع رخت بر بست۔
پھر لکھتے ہیں:

لہذا الحمد کہ زحمت صداع و غمی ہم از باندہ اٹھ در طبع نہ گزاشتہ، ضعف اگر باقی است ترورے
نیست، کہ اس رفیق است کہ از وطن کریم ہی بستا است۔

قیام بنارس | بنارس سے رستے چھپل کو لکھتے ہیں،

چند نوہم کہ از متاع نوشینہ پرتیبہ است افتادہ، مگر از انہیات گفتہ آید ہاں رنج معدودہ است
وہاں برودت بگرد حرارت قلب، ضعف توے، اگر از عارضیات سخن آندہ شود بیش ازین نیست۔
مغلوب سلوک غم دل غالب حزیں کا نہ تنش، ضعف توں گفت جاں بود
گویند زندہ تاب بنارس رسیدہ است "ما ازین گبی و ضعیف اس گاہ نہ بود
بنارس میں قیام کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غالب خود ایک خط میں مولوی محمد علی خاں کو لکھتے ہیں:
علو نامہ درایام خاک نشینی ہائے بنارس چشم بخت را توے و بخت چشم را عروہ چہ بخشیدہ بود۔
مناسبت مقام کا اقتضای یہ ہے کہ قشوی چراغ دیر کے بعض اہم حصے یہاں پیش
کر دیئے جائیں۔ اس کا آغاز یوں ہوا ہے:

نفس با صور و مساز است امروز خموشی محشر را ز است امروز
رگ سنگم شرارے مے نویسم کف خاکم غبارے مے نویسم
احباب دہلی کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ز دہلی تا یروں آوروں بختسم بہ طوفان لغافل وادہ ختم
کس از اہل وطن غمخوار من نیست مراد و ہر نپنداری وطن نیست
زار باب وطن جویم سہ تن را کہ رنگ و رونق انداں نہ چمن را

چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم ہم از حق فضل حق را باز خواہم
 چو حرز بازوے ایماں نویسم حسام الدین حیدر خاں نویسم
 چو پیوند قباے جاں طرازم امین الدین احمد خاں طرازم
 گزتم گز جہاں آباد رستم مرایتاں را چرا از یاد رستم
 گودایغ فراق بوستان سوخت غم بے مہری ایں دوستان سوخت
 جہاں آباد گر نبود الم نیست جہاں آباد باد جاے کم نیست
 ان تمہیدات کے بعد بنارس کا ذکر فرماتے ہیں :

لعاے اللہ بنارس چشم بدو بہشت خرم و فردوس معمور
 بنارس راکت گفتا کہ چین است ہنوز از گنگ جنیش بر چین است
 بہ خوش پرکاری طرہ جودش زدہلی مے رسد ہر دم درودش
 بنارس کے متعلق ہندوؤں کے عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :
 تناسخ مشرباں چوں لب کشاید بیکیش خویش کاشی راستایند
 کہ ہر کس کا اندراں گلشن پیرو دگر پیوند جسمانی تنگی برد
 چمن سرمایہ امید گردد بہ مردن زندہ جاوید گردد
 اس کے بعد حسن بنارس کے کیت و جوش کو غالب کی میناے سخن میں ملاحظہ فرمائیے :

۱۰ سورہی فضل حق خیر آبادی آخری دور میں معقول کے امام تھے غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ غدر کے بعد انڈیا میں بھیجے گئے۔ یہیں وفات پائی۔

۱۱ مبارزالہ و ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ فرما کر وایان اودھ کے اقربا میں سے تھے لیکن لکھنؤ سے دہلی پہلے آئے وہ بارشاہی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے غالباً شہداء میں قالج سے انتقال ہوا شاعر بھی تھے نامی تخلص فرماتے تھے غالب نے ان کے دیوان کو دیباچہ فارسی میں لکھا ہے جو کلیات شریں موجود ہے انکی جوہلی بلی ماراں میں تھی
 تحف قلی خاں آخری دور کے ایک مشہور میر تھے جو بہار سے سہمان ہوئے۔ ان کی صاحبزادی سے حسام الدین حیدر خاں کی شادی ہوئی تھی۔ اور چہیز میں کافی جاگیر ملی تھی۔

۱۲ نواب امین الدین احمد خاں جو بعد میں بہار کے فرمانروا بنے۔

بیائے فاقل از کیفیت ناز نگاہے پر پریر از آتش انداز
 ہمہ جانہاے بے تن کن تماشا ندارد آب و خاک این جلوہ ماشا
 نہادشاں چوئے گل گراں نیست ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست
 خس و خارش گلستان است کوئی غبارش جو ہر جان است کوئی

کف ہر خاکش از مستی کشتے سبر ہر خارش از سیزی ہشتے
 سوادش پایے تخت بت پرستان سراپایش زیارت گاہستان
 عبادت خانہ ناقوسیان است ہمانا کعبہ ہندوستان است
 بنائش را ہیوئے اشعار طور سراپا نور ایزد چشم بد دور
 میانہا نازک دولہا توانا ز نادانی بہ کاہ خویش دانا
 تبسم بیکہ در لبہا طبعی است دمنہا شک گہاے ربعی است

بہ لطف از موج گوہر زم روز بہ ناز از خون عاشق گرم دور
 بہ سامان دو عالم گلستان رنگ ز تاب رخ چراغان لب گنگ
 قیامت قامتیاں مژگان ازاں زمزگان صفیل نیزہ بازاں

پھر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات ایک روشن بیان سے جو زمانہ کی گردش کے اسرار
 سے آگاہ تھا۔ سوال کیا کہ جہان سے نیکی، وفا اور محبت رخصت ہو چکی ہے۔ ایمان کا
 محض نام باقی رہ گیا ہے۔ باب بیٹوں کی خوریزی کے درپے ہیں بیٹے آبا کے دشمن
 جاں ہیں، بھائی بھائی سے سرگرم جنگ ہے۔ موافقت اٹھ گئی ہے۔ گویا قیامت کی
 تمام علامتیں نمودار ہو چکی ہیں، لیکن قیامت کیوں نہیں آتی؟
 یہ نفیج صور تعویق از پٹے چیت؟ قیامت را عتائنگیر جنوں کیست؟

سوے کاشی بہ انداز و اشارت تبسم کرد و گفتا! ایں عمارت
کہ حقانیت صانع را گوارا کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنارا
آخر میں اپنی درد انگیز حالت نہایت موثر و دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں:

الا سے غالب کا راقیادہ ز چشم یار و اغیار اوقیادہ
چو بونے گل ز پیراہن بروں آسے یہ آزادی ز بند تن بروں آسے
مدہ از کف طریق معرفت را سرت گردم بہ گرد ایں شش جہت
فروماندن بہ کاشی نارسائی است خدا را ایں چہ کافر جرائی است
بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر دریں جنت از ان دیرانہ یاد آر
در یغادر وطن و اماندہ چند بخون ویدہ ز ورق راندہ چند
ہوس را پلے در دامن شکستہ یہ امید تو چشم از خویش بستہ
بہ شہر از یہ کسی صحرائی نہاں بروے آتش دل جاگزیناں
مگر کاں قوم را دہر آفریدہ ز سیلاب یہ آتش آرمیدہ
ہمہ در خاک و خوں انگندہ تو یہ حکم بیکسیہا بستہ تو
چو شمع از دلغہ دل آزد فشانان یہ بزم عرض و غوغا بی زبانان
سر و سرمایہ غارت کردہ تو ز تو نالان وے در پردہ تو
از آنانت تغافل خوشنمانیت بدائع شاں ہوائے گل روانیت

غالب کے اہل و عیال کی کیفیت اور اس کیفیت کے لئے غالب کی ذمہ داری اس سے
بہتر کیا بیان ہو سکتی ہے؛ اپنے پیش نظر کام کی نسبت لکھتے ہیں:

ترائے بے خبر کار است در پیش بیابانے و کہسار است در پیش

.....

ترا زاندوہ مجستوں بود باید خراب کوہ و ہاموں بود باید

تن آسانی بہ تاراج بلا وہ چویشی رنج خود را رونما دہ
 شرر آسا فنا آمادہ بر خیزد بینشاں دامن و آزادہ بر خیز
 اس واقعے سے تینتیس برس بعد میاں داد خاں سیاح کے ایک مکتوب کے جواب میں
 جو سیاح نے بنارس سے لکھا تھا، فرماتے ہیں :

بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے، ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے
 اور چنانچہ دیر اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اس کو دیکھنا۔
 غالباً بنارس کے کوئی صاحب اشرف حسین خاں تھے جن کا ذکر سیاح نے اپنے خط میں
 کیا تھا۔ غالب لکھتے ہیں :

اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد (غدا) کے زمانے سے پہلے ان کا خط
 اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ ان کو میرا سلام کہنا۔
 بنارس سے روانگی | بنارس سے روانگی ہفتے کے دن عمل میں آئی۔ چاند کی نویں یا دسویں تاریخ
 تھی۔ مہینے کی تصریح موجود نہیں۔ غالب لکھتے ہیں :-

امروز کہ آدینہ بقول جسے نہم ماہ دیہ اظہار گرتہ ہم، ست در بند بستان رخت سفرم
 فردا یہ روز شنبہ از بنارس شہ پریم۔

معلوم ہوتا ہے کہ کشتی کی سواری میں بہت آرام ملا تھا لہذا چاہتے تھے کہ کلکتہ تک
 کشتی ہی میں سفر کیا جائے۔ لیکن کشتی والے کرایہ بہت زیادہ مانگتے تھے اس لئے مجبوراً
 پلٹہ تک گھوڑے پر جانا پڑا۔ لکھتے ہیں :

ناخدا یان ناخدا ترس در باب کشتی مضائقہ کردند چو بہر کہ بر خوردم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید و
 تا پلٹہ افزودن از لیست روپیہ خواست۔ تا چارہاں اسپ سوار تا بدار بقعہ صحر اخواہم پیرو +

سلہ تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۳ھ میں چاند کی نویں تاریخ اور جمہور کا دن جمادی الثانی کے مہینے میں تھا۔
 گویا بنارس سے غالب ۲۹ دسمبر ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے +

فرد آمدن جات کشادہ البستہ و شعلہ بار کہ آں را در درو و درو ہماں ہنگام درو و بے نہ حمت جسور یا فتم۔

راے چھل کو اپنا پتہ اس طور پر لکھتے ہیں :

در کلکتہ قریب حسین پور بازار در شعلہ بازار نزدیک تالاب و در حویلی میرزا علی سوداگر ہر سدا ہر سدا۔

مکان بڑا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ اور اس کا کرایہ صرف دس روپے ماہانہ تھا۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو تحریر فرماتے ہیں :

غریب نواز یہاں سے دہلی کے منت رنارم کہ در حین دیار خانہ پناہ باید وہ گرگہ آسائش ابہ کار آید۔

ہم درابہ اندازہ فراغ خاطر فضلہ ہم اندون فہ مانند دین دنیا طمان بیت الخلاء کے درگشتہ صحن

ہر از آب شیشویں چاہے و ہر طرف ہام و در خود اسل تنہا۔ اسکا جے بہ نہ نکہ جسورے شود یا لنگوٹ درو

بے نہ حمت و بے مست بہ کہ بہ درو ہماں ہر سدا ہر سدا۔

بھکائی کی تعریف | شہر کلکتہ اور بنگالی کی آب جو غالب کو بہت پسند آتی تھی۔ فرماتے ہیں :

گھوٹی آثار و حمت ابی مست کہ آب و ہوا سے کلکتہ ہامس بک در ساخت دیں ہر سدا سودہ تراز ہم

کہ در و در و در و در۔

حالت بہرہ و در و در و در۔ بہرہ و در و در و در۔

بہرہ و در و در و در۔ بہرہ و در و در و در۔

علی بخش خاں رنجورہ کو کلکتہ کی تعریف میں لکھتے ہیں :

پہ کلکتہ ہماں نے از بہرہ و در و در و در۔ بہرہ و در و در و در۔

فراہی بہ بازار و در و در۔

مولوی سراج الدین احمد کلکتہ میں غالب کے ایک نہایت عزیز دوست تھے۔ پہلی واپس

آکر مولوی صاحب موصوف کو جو خط لکھے ان میں سے ایک میں فرماتے ہیں :-

شاہستانہ بدیش تازگی رگیتی کجاست، حاک نشینی آں دیار از اورنگ آبادی مرزا بوم دیو خوشتر بہن و خدا

کہ گر سابل نہ در دست و ملوک ناموس عیال بر گردان نہ داشتے دامن بہرہ و در و در و در۔

راور ان بقعہ رساں دے تازیستے دریاں مینو کہہ بودے و اندر نہج ہوا مے ناخوس آسودے۔ زبے

دوامے مسرود خوش آب مے گو را فرخا بادہ مے باب و خرماتر مے شیریں ۔

غالب کو آم ویسے ہی بہت مرغوب تھے۔ بنگالہ کے آم بہ طور خاص پسند آئے۔ خود فرماتے ہیں :

ہمہ گر میوہ فردوس بہ خوانست باشد

غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد

کلیات نظم فارسی میں ایک قطعہ ہے جس میں سفر کلکتہ کی غرض و غایت، دھلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی کیفیت "ساتی بزم آگہی" کی زبان سے بیان کی ہے۔ وہ یہ امر کو بطور سوال "ساتی کے" و ہر دہیڑ کرتے ہیں۔ اور "ساتی" جواب دیتا ہے۔ یہ سوال و جواب بھی ملاحظہ فرمائیے :

گفت "جو روحیہ اس اہل وطن"

گفت "جان است میں جہانش تن"

شایدے مست محو گل چیدن

گفت "میں تر از فضا سے چمن"

گفت خوشتر نہ باشد از سوین

"بایدا قسیم بستمش گفتن"

گفت "از ہر دیار و از ہر فن"

اس کے بعد انگریزوں کی فزرد روش کو ان نظموں میں بیان فرماتے ہیں :-

گفت "از ہر کہ بہت تر سیدن"

گفت "قطع نظر شعر و سخن"

گفت "خوبان کشور لندن"

گفتش "چیت منشاء سفرم"

گفتم "کنوں بلو کہ دہلی چیت"

گفتش "چیت میں بنارس گفت"

"گفتش "پوں بود غلیم آباد"

گفتش "سبیل خوش باشد"

حال کلکتہ باز جب تم گفت

گفتم "آدم بہم رسد دروے"

اس کے بعد انگریزوں کی فزرد روش کو ان نظموں میں بیان فرماتے ہیں :-

گفتم "ایں جاچہ شغل سود و ہد"

گفتم "ایں جاچہ کار باید کرد"

گفتم "ایں ماہ پیکراں چہ کس اند"

نائب جس مخلص کے لئے کلکتہ گئے تھے وہ پورہ ہوا یا اس کے عالم میں وہاں شور
لندن کے متعلق مزید فرماتے ہیں :

”نقشہ ایناں لکھو لے دارند“ ”گفت دارند بیک از اہمن“
”نقشہ از پرچہ و دو آمدہ ام“ ”گفت بگرید و سر پر سنگ من“

کلکتہ کی تعریف میں نائب نے اردو میں بھی چند شعر کہے تھے :-

کلکتہ کا تو ذکر کیا تو نے نہ نسبت میں اک تیر پیر سے سینے میں مار کے ٹائے ٹائے
وہ سبز و زار ٹائے منظر کہ بہت غضب وہ نازین بتاں خود آکا ٹائے ٹائے
مہر از مادہ ان کی گاہیں کہ بہت نظر طاقت ربا وہ ان کا اشار کہ ٹائے ٹائے
وہ تیز و سست تازہ و شیریں کہ وادہا وہ باد و بارے تاب گوار کہ ٹائے ٹائے
فارسی کی ایک غزل یہ مقدمے میں فرماتے ہیں :-

نائب سیدہ ایم بہ کلکتہ فرمے

از سیدہ ذات دوری احباب شستہ ایم

نائب و کلکتہ کی رحمت سزا حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :-

”بنگال کی سرزمین غموں اور کلکتہ مخصوصاً ہندوستان کا سب سے زیادہ نشیبی حصہ ہے

آب و ہوا درجہ متوسط“ اور بالائی ہند کی تمام صحت افزا خصوصیات سے محروم و قحطی
اور غیر آبائی کوالٹنس کے مصالح نے یورپین اقوام کو مجبور کیا کہ بنگال کا رخ کریں۔
اور انگریز بھی مجبور ہوئے کہ کلکتہ کو اپنے لئے جائے پناہ تصور کریں۔ ہند سے
اس کا قرب اور دریا بے مہنگی کا بہار رانی کے قابل ہونا ان کے مصالح کے لئے
نہایت قیمتی بات تھی۔

لیکن اس شہر کی آب و ہوا کی رات ہمیشہ شمالی ہند کے باشندوں کے لئے ایک ناقابل

علاج آفت رہی، ٹھہار ہوئی اور اندیسوں کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں، کلکتہ کو آب ہوا

انگریزی حکومت کا بنیاداً غارتخانہ طبیعت پر نہ فطرۃً رحم و تدبیر کی بندشوں سے آزاد تھی اور عام راجوں سے اپنی راہ الگ نکالنا چاہتی تھی۔ اس لئے مذہبی اور ملکی تعصب ان کے لئے سدِ راہ نہ ہو سکا اور وہ انگریزوں کے فضائل و محاسن سے شناسا ہو کر ہلار و دک گر ویدہ ہو گئے۔ ہندوستانی زندگی کے تمام سانچے ٹوٹ رہے تھے۔ اور انگریزی اوضاع و اطوار اور ذہن و دماغ کا غلو و غلبہ ایک غیر متعصب دماغ کو صاف صاف محسوس ہو رہا تھا۔ کلکتہ کے قیام اور میکنائٹن جیسے فارسی دان انگریزوں کے تعلقات نے یقیناً ان کی غیر متعصب طبیعت کو اور زیادہ متاثر کیا ہوگا۔ وہ قدیم آئین و فنون کی بے یارگی اور یورپ کی جدید ترقیات و انکشافات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے اور اس بارے میں ہندوستانیوں کی عام تعصبانہ ذہنیت کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ آئین اکبری کی تقریر میں انہوں نے کتاب کی اہمیت سے جو انکار کیا ہے اگرچہ وہ صحیح نہیں کیوں کہ تاریخی لحاظ سے اس کی حیثیت واضح اور معلوم ہے۔ لیکن ان کے استدلال سے جدید فنون کے علم و اعتراف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آئین اکبری کی تقریر کے وہ اشعار نقل فرمانے کے بعد جن میں جدید فنون کا ذکر ہے حضرت مولانا فرماتے ہیں،

مہرِ غالب کے ذہن کے اسی گوشہ میں ان کے افکار و امیال کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔ کلکتہ انگریزی دار الحکومت ہے اور انگریزوں کا ایک پسندیدہ مرکز اس لئے عام ہندوستانیوں کی مخالفت نہ راجوں کا وہ ساتھ نہیں دینگے جو کلکتہ کی مذہبت کرتے ہیں، بلکہ کلکتہ کی تعریف کریں گے۔ کلکتہ میں انگریزی عہد کے نئے کارخانے دیکھے جاسکتے ہیں وہ دوسری جگہ معدوم ہیں، اس لئے وہ کلکتہ کو تمام شہروں پر فضیلت دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دو نثر نویس کا جو اسلوب بے اختیار

ان کے قلم سے نکلنے لگا، اس کی تہ میں بھی انگریزوں کے ذوق و مشرب اور پسندیدگی کا اثر مضمر ہو گا۔

فورٹ ولیم کالج کی بنیاد سے لے کر غالب کے جہد تک انگریزی سررشتہ تعلیم کے ارکان کی برابر کوشش رہی کہ سہل اور رواں اردو نثر کی برائے افزائی کی بجائے اور فارسی انشاپردازیوں کے تکلفات سے اجتناب کیا جائے۔ یہ چیزیں غالب کی نظر سے گزری ہوں گی اور اس کا اثر اندر ہی اندر کام کر رہا ہو گا بخط و کتابت میں قدیم اسلوب، انقباض و مخاطب سے بھلی مسترز اور محض کسی ایک نام و لقب سے یا امر کے برادر است صرف غلبہ نہ آتا، جو اس جہد میں ایک پیرامون کی بات تھی، یقیناً انگریزی اسلوب کے تاثر سے سامنے آئی ہو گی، خاتمہ پرستہ طریقے سے اپنا نام لکھنا اور الفاظ پر عام اسلوب عنوان کی جگہ صاف و سادہ طریقہ اختیار کرنا، اس نثر کے امیال کی یہی اسی روشنی میں لاکر دیکھنا پائیتے، غالب کی ذہنیت کی یہ تحصیل اگر سامنے رکھ لی جائے تو بہت سے سواؤں کا جواب مل سکتا ہے۔

اگرچہ اس کا، ان ثبوت ہیں کہ غالب نے انگریزی ناولوں کو سنا ہوا لیکن یہ واقعہ یاد آگیا چاہیے کہ اب وہ چنانچہ صنف میں رجمہ ہو کر حد بپا نہیں، ایک مجتہد ذوق رکھنے والی طبیعت ان سے نتائج نفاذ کر سکتی تھی، مثلاً اولاً اسمتہ کا قصہ دیہاتی زندگی والا (دیگر آف ویفیلڈ) ایک صدمہ سب نے تہہ کیے کے ساتھ میں چھاپا تھا۔

ایک اور شہادت [حضرت مولانا کا یہ ارشاد بالکل سچا ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی تمام تحریرات میں کلکتہ کو بہ اعتبار آب و ہوا خوشگوار مقام قرار دیا گیا ہے بلکہ بعض لوگ اب دیہات گزر کر خود اہل کلکتہ کی مذمت میں یہی متاعل نہ ہوئے، مثلاً شعری کشمیری غالب کے برسوں بعد کلکتہ کے تھے، وہ فرماتے ہیں،

نہ دیدم مردی در دیہہ اعیان کلکتہ زینیش زلف بے ہودہ زوہ کوہ ان کلکتہ

بہ شتاب اور ذرا سہولت سے نجات دلاؤں دین متاع پیش و موافقت در انہاں کلکتہ
 اگر شرف بہ پرسی بانب مغرب نمایندت فریب صلاخواہی خود داز غولان کلکتہ
 غائب کے مدد درست اور عرض کیا جا چکا ہے کہ غائب صرف پیش کے مقدمہ کیلئے کلکتہ تھے
 تھے اور وہ زیادہ تر اسی سلسلے میں سکامہ سے ملتے رہے۔ اس مقدمے کے پورے حالات
 ایک غلطی و باب میں بیان ہوں گے جو اصحاب کلکتہ میں غائب کی مدد طلبی اور مجموعی
 میں سرگرمی سے معاون رہے۔ ان میں سے نواب اکبر علی خاں طباطبائی، مولوی
 سراج الدین احمد اور منشی محمد حسن بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔

نواب اکبر علی خاں طباطبائی امام باڑہ ہونے کے متولی تھے مولوی محمد علی خاں صدر
 الدین باڑہ نے ان کے نام تعارفی خط لایا تھا۔ غائب کلکتہ پہنچ کر دور و زار کے بعد ہو گئی بندر
 گئے۔ نواب صاحب سے ملے اور ان کے سپاکہ نجف، ہمدانی اور حسین خاں سے
 بے حد متاثر ہوئے۔ خود فرماتے ہیں کہ ایسا مالی پایہ اور حد صاحب دل امیر بنگال میں
 وہ سہرا نہ ہو گا۔ ملاقات کے ساتھ ہی نواب اور غائب کے درمیان نجف و داد کا
 مستحکم رشتہ پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں نواب خود امام باڑہ کے مقدمے میں آجھے
 ہوئے تھے۔ غائب لکھتے ہیں :-

”روح کے دربار میں تاج و تاجہ ہم ہو گئی بدر در حضور زینت کہ وقف نامہ باڑہ ست
 معارفہ ملک مجبور در ہیں دول سرگرم کسر خوش ست لند و قائل :-

بمہر رمانی سہ بند و سادیدہ

ہجوں بہ عشرت کہہ گبر و مسلمان رفتہ

مولوی سراج الدین احمد غالباً مولان کے باشندے تھے اور کاروبار کے سلسلے میں

کھکتے پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ گہرے رابطہ مودت کی کیفیت خود غالب کی زبان سے سنئے۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو لکھتے ہیں :-

مستزاد آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرہ خواص میں سے اعوام کا شمار نہیں۔ وہ
مخلص صادق الولادیکھے، ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دسرا فتنی غلام غوث خاں
سلا اللہ تعالیٰ۔ لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں لکھتا تھا۔ خواص خاں دہلوی کا خاص چہرہ تھا۔
ایک فارسی غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :-

بہ سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگ غزل خوانی مرا

غالب نے اپنے منتخب اردو اور فارسی اشعار کا جو مجموعہ ”گلِ یونا“ کے نام
سے مرتب کیا تھا۔ وہ مولوی سراج الدین احمد ہی کی فرمائش کا نتیجہ تھا جس زمانے
میں ”دستبنو“ چھپی۔ مولوی صاحب موصوف لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ چپتا پنہ
”دستبنو“ کا ایک نسخہ انہیں بھیجنے کی تاکید کرتے ہوئے فتنی شہنشاہ کو ان کا ہتہ
یہ بتاتے ہیں :-

در لکھنؤ بہ احاطہ خانہ ان نسخہ بنی شیر علی شاہ بہر نامت مولوی بہدائیکریم مرحوم
بخدمت مولوی سراج الدین احمد رسد۔

فتنی محمد حسن غالب گورنر جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ فتنوی ”بادِ مخالفت“ فتنی
صاحب موصوف اور نواب اکبر علی خاں ہی کے ایما پر لکھی گئی تھی۔
احمد بیگ ناں تپان | غالب کے قیام کھکتے کے سلسلہ میں تپان اور قاسم کا ذکر بھی
اور ابوالقاسم قاسم | ضروری ہے۔ مرزا احمد بیگ ناں تپان غالب کے رشتہ داروں

میں سے تھے کھلتے ہیں وہ صد دیوانی میں مختار تھے۔ ابوالقاسم قاسم کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی وہ فارسی کے شاعر تھے۔ غالب کی مہارت فن طب کی ستائش میں انہوں نے ایک قطعہ لکھا تھا جس کے جواب میں غالب نے دو قطعے لکھے۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان دونوں کی مدح میں غالب نے ایک غزل بھی کہی تھی۔ جو آج تک ان کے مجموعہ کلام اُردو میں شامل نہیں ہو سکی۔ غزل یہ ہے :-

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو پرہیز و نوریا ایک	وضع میں گورہونی دوسری تیغ ہے و انفاق ایک
ہم سخن و سہزباں حضرت قاسم و نیاں	ایک پیش کا بالہ شبنم در کا یادگار ایک
نقد سخن کے واسطے ایک غیار آگہی	شعر کے فن کے واسطے مایہ اعتبار ایک
ایک وقاد مہر میں ناز کی بساط و ہر	لطف و کرم کے باب میں نہایت وزگار ایک
گامگاہ تلاش کو ایک ہے رنگ ایک بو	ریختہ کے قماش کو ایک ہے پودہ تار ایک
مملکت کہاں ہیں ایک امیر نامور	عزمہ قہر و قال میں خسرو نامدار ایک
گھٹن عشاق میں ایک بہار بے خزاں	میکدہ وفاق میں بادہ بے خمار ایک
زندہ شوق شعر کو ایک پرانہ انجمن	کشتہ ذوق شعر کو شمع۔ مرزار ایک

سید غالب خود لکھتے ہیں "مرزا احمد بیگ خاں بن مرزا ہادی بیگ خاں بلند زمان مبین بدو از اباحہ بخش خاں مرحوم بود و کلیات نثر و رسمی صفوہ ۱۱ اس کے خاندان غبار کے ساتھ احمد بیگ خاں کی شہسوار کی بالکل آشکارا ہے عبدالغفور خاں نساخ نے خدا جانتے کس بنا پر اسے "دلہ عطار اللہ خاں" لکھی (سخن شہر صفوہ ۲) بن نساخ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ وہ لغت بخش خاں والی دشت قبیاق کے اخلاف میں سے تھا۔ ۱۳۱۲ء میں وفات پائی ۱۳۱۵ء پر وفیر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے کے پاس ایک قلمی بیاض ہے جس میں غالب کے قریباً پچاس غیر مطبوعہ خطوط اور چھ نظمیں ہیں۔ ان کے چند اقتباسات اور قاسم اور تیان کے مدحیہ شعراء رسالہ انظر، لکھنؤ (دسمبر ۱۹۳۳ء) میں چھپے تھے ۱۳۱۵ء مرزا جان پیش احمد بیگ ان کے شاعر تھے۔ ۱۳۱۶ء میرزا و ہادی قاسم کا سلسلہ تلمذ غالباً میرزا و تک پہنچتا تھا۔

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں سول پرند
 ایک محب چارباغ عاشق بہشت و چار ایک
 جان و فاپرست کو ایک نیم نوبہار

فرق ستیزہ مست کو ابر تگرگ بار ایک
 لایا ہے کہہ کے یہ عزل شاہدہ ریا سے دور

کر کے دل و زبان کو غالب ناکسار ایک

ادبی ہنگامہ | سفر کلکتہ کی صرف ایک ضروری چیز باقی رہ گئی ہے یعنی وہ ادبی ہنگامہ
 جس کے نتیجے میں غالب کو قنوتی یا د مخالف، مکھن پڑی۔

انہیں فارسی زبان سے طبعی مناسبت تھی۔ ادبی مذاق نہایت سلجھا ہوا اور اسلوب
 نکر باکل اچھوتا تھا۔ بلا عید الصمد کی دو سالہ تربیت نے ان کے مادہ طبعی جوہروں کو یکجا نہ جلا دے
 دی تھی۔ عنفوان شباب ہی میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا اسے بے تحاشہ فارسی زبان کے بہترین
 و مشہور ترین اساتذہ کے کلام کے برابر رکھا جاسکتا تھا۔ وہ ہندوستان کے ان فارسی گو شعرا کو
 کہ خاطر میں لاسکتے تھے جن کی زبان اسلوب بیان انڈو ختمہ فکر غرض ہر چیز فرومایہ تھی، اس
 زمانے میں قلیل اور واقف کو اساتذہ فن مانا جاتا تھا۔ انہی کی سندیں مجاہد شعروادب میں معیار
 نے طور پر پیش ہوتی تھیں غائب خود غری، انوری، نظیری اور حلی کی ہم پائی کے دعویدار
 تھے اور یہ دعویٰ بے جا نہ تھا۔ ان کی شان کمال قلیل و واقف جیسے شاعروں کے سامنے
 کیونکر سراغرات خم کر سکتی تھی۔

جس زمانے میں وہ کلکتہ پہنچے۔ برٹنریری مینے کے پہلے آثار کو مدرسہ کلکتہ میں مشاء
 ہوتا تھا، جس میں فارسی اور اردو کے اکثر شعرا شریک ہوتے تھے۔ غالب کے اعزاز میں
 ایک خاص مشاء منعقد کیا گیا۔ اتفاق سے اس زمانے میں حاکم ہرات کی طرف سے ایک
 سفارت کلکتہ آئی ہوئی تھی جس کے رئیس کفایت خاں نام ایک خوش ذوق اہل علم تھے۔

وہ مشاعرے میں شریک ہوئے۔ شعرا کلمتہ نے اپنی غزلیں سنائیں، تو کفایت خاں ان کے
 بوجھ کلام پر زریں لب تسلیم فرماتے رہے۔ لیکن جب غالب نے غزل پڑھنی تو خان مدوح نے
 دل کھول دیا وہی۔ عام مجلس خاں شعرا کے ضبط و صبر کی فرو پائی اور جذبہ حسد و رقابت کی
 ذکاوت معلوم ہے۔ وہ ایک غریب الدیار کے لوگ اور لگانا کی فن کی قدر شناسی کے بجائے
 اس کے دشمن بن گئے۔ اور جیسا کہ فرومایہ اور تنگ حوصلہ شعرا کا شیوہ ہے۔ غالب کے کلام
 میں عیب تلاش کرنے لگے۔ اس شاعرہ میں غالب نے اپنی مشہور غزل ”گماں بر خیزد“ میں
 بر خیزد پڑھی تھی۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں:-

بچہ گیرند عیار ہوس و عشق و گر رسم بیداد و مباد از جہاں بر خیزد
 زینہار از تعب دوزخ یا وید ترس خوش بہاریت کز وہیم خزاں بر خیزد
 عمر با چرخ بگردد کہ جگر سوختہ چوں مہن از دودہ آتش نفساں بر خیزد
 گرد ہم شرح ستمہاے عزیزاں غائب رسم امید مہا ناز جہاں بر خیزد
 اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے:-

جزوے از عالم و از ہر عالم بیشم ہم چوموے کہ بتاں راز میاں بر خیزد
 اس پر اسی مشاعرے میں یا کسی دوسری مجلس میں اعتراض کیا گیا کہ ”ہر عالم کی
 ترکیب درست نہیں، اس لئے کہ عالم مفرد ہے ہمہ کے ساتھ اس کا ربط حسب اجتماع قیاس
 جائز نہیں۔ نیز یہ اعتراض کیا گیا کہ ”موسے ز میاں بر خیزد“ غیر صحیح ہے۔ بعض اور ایرادات
 بھی پیش ہوئے۔ نواب اکبر علی خاں اور فشتی محمد حسن نے ان سب کے جواب دیئے۔

۱۔ کلیات نثر فارسی صفر، اسلہ منوی ادنیٰ مخالف سے معلوم ہوتا ہے کہ ”زودہ“ کے کسر پر بھی اعتراض ہوا تھا یہ فی الحقیقت بڑے
 وحدت کا بدل تھا۔ کسرہ اضافت نہ تھا غالب اس کے متعلق تبدل کے کلام سے متاثر دی تھی عارضیہ یہ دونوں زودہ
 قدر آرزو بخون زودہ۔ غالب نامہ کے فاضل مولف نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعر غالب سے منسوب کیا ہے جس پر اعتراض
 ہوا تھا۔ شورائیکے ہفتاب میں مرثاں ارم۔ طعنہ بربے سرو سامانی طوفاں زودہ۔ مجھے غالب کا یہ شعر نہیں مل سکا۔ اس
 میں ”زودہ“ غالب کی ایک غزل موجود ہے۔ لیکن اس میں منقولہ شعر موجود نہیں۔ قطع برآں ان کے قوالیستہ معلوم ہونا
 ہے۔ کہ ”کہہ“ کے استعمال پر بھی اختلاف ہوا تھا۔

کفایت خاں نے ہمہ عالم کو سند میں اساتذہ کے متعدد اشعار پیش کئے۔ مثلاً۔

گر من آلودہ دامنم چه عجب

ہمہ عالم گراہ عسکت از دست (حافظ)

اور :- ہر جہاں خروہ از اقم کہ جہاں خرم از دست

عاشقم بڑہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست (سعدی)

کلکتہ کے شہر کی دستاویز سند و دلیل قلیل کا کلام تھا۔ خواجہ عالی فرماتے ہیں کہ غالب نے قلیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں فرید آباد کے کھتری نیچے کے قول کو نہیں مانتا۔ اس پر کلکتہ کے شعرا اور محبی بگڑ گئے۔ تقلید جب جسور کی انتہا پر پہنچ جائے تو مدح و عیب یا سیاسیات یا معاشرت یا ادب کے مجتہدین طریق اور مجید دین فن کو جن اہم مقامات پر گفتگو سے سابقہ پڑتا ہے، وہ سب غالب کے گرد و پیش کھڑی ہو گئیں۔ وہ کسی بی ہنگام یا علمی جہاد کے لئے کلکتہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ اپنی دانش کے متعلق چارہ چوٹی کے لئے اس لئے سفر کی رحمت برداشت کی تھی۔ جب ان کے خدات شعرائے ہنگامہ بیابان تو بہت گہراٹے انجام کار لو اب اکبر علی خاں اور غشی محمد حسن صاحب کی فرمائش پر معذرتیں باد مغالفت کے نام سے ایک ٹنڈی لکھی جس میں اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا، آمد کی غرض بتائی، اعتراضات کے جواب دیئے اور فارسی زبان میں اپنے مسلک و شریعت کی وضاحت کی۔

میرے نزدیک اس ہنگامہ کو غالب کی ادبی و علمی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۱۱۷ کجیات نثر ناری صفحہ ۱۰۷ قیل آملہ گھڑی تھی۔ بعد ازاں مسلمان ہو گئے اور لکھنؤ جا کر بیٹے عروج پایا۔ میرزا آفتاب کھانہ ۱۱۸۳ ہجری کو ان کے بیٹے وراثت پائی۔ بعض ہاں تحقیق کو فرید آباد سے قلیل ہے۔ تناسب میں کلام ہے۔ میرے پاس اس کے ثبوت کی کوئی مثبت دلیل نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ میرزا بن قاطع کے سلسلے میں غالب کے خدات اعتراضات کا جو طوفان اٹھا۔ اس میں ہڑائی اور بغض چیز پیش کر دی گئی۔ لیکن اس تناسب میں تقلید کسی سے نہ تھی۔ اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ تناسب صفا غلط نہیں تھا۔ البتہ اس کی کیفیت بالتحقیق معلوم نہیں ہے۔

وہ شروع ہی سے قلیل، واقف اور اس قماش کے دوسرے شعر کو خاطر میں نہیں لیتے تھے لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ تعریضات گرم ہوا۔ اس نے غالب کے جذبہ مخالفت میں بہت تندی، تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبہ مخالفت انجام کار "قائم برہان" کی شکل میں ظاہر ہوا جو غالب کی طرف سے فارسی دانان ہند کے درجہ استناد و اعتماد کے خلاف ایک بڑا جہاد تھا۔ ان کے ملام نظم و نثر میں جا بجا قلیل، واقف، عبد الواسع، غیاث الدین رام پوری اور اس قبیل کے دوسرے فرد مایگان ذوق ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں، ان سب کی تیزی اور تندی کا سرچشمہ یہی کلکتہ والا ہند گامہ تھا۔

شعری "باد مخالفت" | شعری "باد مخالفت" میں پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نظم اور فریاد کے لئے اس شہر میں آیا ہوں۔ مجھے چند روز آرام سے گزارنے دیجئے اور مہمان نوازی کا حق ادا کیجئے۔ پھر اپنی سعیدتوں کی داستان لکھتے ہیں :-

چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر	کہ بدیں جا رسیدہ ام آخر
بہ سیر روز غرتہم بنید	تیرہ شبہا سے زحمتہم بنید
اندہ ویری وطن نگرید	نغمہ بھراں انجمن نگرید
نہ ہمیں نالہ و فغاں یہ لیم	من و جاں آفریں کہ جاں یہ لیم
وہ چون مئے کردہ استرا	غصہ بہ خوسے کردہ استرا

پھر کہتے ہیں کہ مخالفت کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا بلکہ خود مجھ پر بلا وجہ نارست اعتراض کئے گئے :-

"ہمہ عالم غلط کہ گفت نخست؛ پارہ زیں نمط کہ گفت نخست؛
موسے را بر کر کہ گفت غلط؛ شعرا سر لیسر کہ گفت غلط؛

اور حیب اعتراضات کا جواب ملنے پر ثابت ہو گیا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا بالکل درست تھا۔ تو کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات نے میری تائید نہ کی۔ اور میری شہرت پر جو

دائع محتافین نے لگائے تھے۔ انہیں دھو ڈالنے کی طرف توجہ نہ فرمائی؟ اس حق
ناشناسی کی وجہ سے میری گفتگو کا انداز کھمندانہ ہو گیا۔ لیکن حجب معلوم ہوا کہ قدرداں
اصحاب اس پر ناراض ہو گئے ہیں تو مجھے بڑی پشیمانی لاحق ہوئی۔ کاش میں چپ رہتا۔

نہ اُمیدم ز شاعریت نہ بیم بود شایستہ مر مرا تسلیم

کاش با اعتراض ساختے نالہ در زیر لب گداختے

زانکہ آنہم رخصتے یاراں بود رنگے از جو شمش بہاراں بود

خار و امان دوستاناں بودن خوشتر از بانع و پوستاں بودن

بعد ازاں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ادبی بحث سے
نہیں ڈرتا، صرف یہ خوف دامن گیر ہے کہ میرے جانے کے بعد لوگ کہیں گے۔ کہ دہلی
سے ایک "سفید" آیا تھا، اور بزرگوں کے ساتھ معرکہ ستیز گرم کر کے چلتا بنا۔ اس طرح
میرؔ وطن کی عزت و آبرو، بلند نامی، وراثتِ تربیت کا خون، ناحق میری گردن پر
ڈالا جائے گا:

نہ ز آویزشیں بیاں ترسم من و ایمان من کزاں ترسم

کہ پس از من یہ ساہلے دراز بہ زباں مانداں حکایت باز

کہ سفید رسیدہ بوداں جا چند روز آرمیدہ بوداں جا

بابزرگاں ستیزہ پیش گرفت ز جنتے داد و راہ خویش گرفت

ہم سفیدمانہ گفتگوے داشت ہم خرابایتانہ ہمے داشت

برگِ دنیا نہ سازد نیش بود ننگِ دہلی و سرزمینش بود

آہ ناں دم کہ بعد رفتن من خون دہلی بود بہ گردن من

کلکتہ والے اس بات پر بہت بگڑے تھے کہ غالب نے قلیل کا ذکر تحقیر آمیز انداز
میں کیوں کیا۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔۔۔

وینکہ در پیش گاہ بزم سخن بہ زبانہا قنادہ است از من

کہ فلاں با قلیل نیکو نیست مگس بخوان نہ مت او نیست

ز تہ برادر کس چرا باشم من بہایم مگس چرا باشم

پھر کہتے ہیں کہ نہ میں نے قلیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا، نہ اس کی شہرت پر شک ہے، نہ میں اسے برا کہتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ فارسی دان جانتے ہیں کہ قلیل اہل زبان نہ تھا۔ لہذا وہ شاید نہ اعتماد نہیں اور اس کے کلام کو سند نہیں مانا جاسکتا اس لئے کہ فارسی اہل زبان کی زبان ہے اور سند وہی مقبول ہوگی جو اہل زبان کے کلام سے مستفاد ہوگی۔ اگر دوستوں کو مجھ پر یہ شکوہ ہے کہ میں قلیل کی پیروی کیوں نہیں کرتا تو خدا را مجھے بتایا جائے کہ خزین، امیر طالب عرفی نظیری اور ظہری کو چھوڑ کر قلیل کے پیچھے چلنا کیوں کر گوارا کروں :-

آنکہ ملے کردہ این موافق را چہ شناسد قلیل و واقف را

آخر میں قلیل کی مدح لکھی ہے جو حقیقتہً سچوٹ ہے۔ فرماتے ہیں :-

مے شوم خویش را بہ صلح دلیل مے سراہم تو اسے مدح قلیل

گر چہ ایرانی شخواب ہم گفت سعدی ثانی شخواب ہم گفت

لیک از من ہزار بار بہ است از من وہ چوں ہزار بار بہ است

نقش آب حیات را ماند در روانی فرات را ماند

تیرا و نقش بال طاؤس است انتخاب مراح و قاموس است

جامد مقلدین اور حقیقت ناشناس رہو معذرتوں اور مصاحبت کشیوں سے

حق بات کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ اور غالب کی تو عذر خواہی بھی باوجود

ادعائے مصاحبت اپنے اندر کئی تیر فشر رکھتی تھی۔ لہذا اس سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا

وہ جب تک کلکتہ میں رہے، یہ معرکہ جاری رہا۔

اردو مکاتیب غالب میں میری تحقیق کے مطابق صرف دو جگہ اس ہنگامہ کا ذکر آیا ہے۔ ایک خط میں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں کہ پانچ ہزار کے مجمع میں اعتراض کئے گئے تھے۔ دوسرے خط میں شاگر کو لکھتے ہیں،

فقیر ہمیشہ مورد اعتراضات رہا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعد دو چار دن کے معترض صاحب کا خط آیا ہے۔ لغت و ترکیب معترض فیہ کی سند سے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کئے ہیں۔ اللہ اللہ کلکتہ میں بوشور نشور اٹھا تھا میرا شعر۔

جزو سے از عالم و از ہمہ عالم بیشم امچو موے کہ بتاں راز میاں بر خیزد
خستہ جرات تھا سے اعتراض ہوا ہے تنشا اعتراض یہ کہ "عالم" مفرد ہے اس کا ربط "ہم" کے ساتھ بہ حسب اجتہاد قلیل ممنوع ہے۔ قصداً اس زمانے میں شاہزادہ کلبران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خواں اس کا نام تھا اس تک یہ قصہ نہ تھا، اس نے اساتذہ کے اشعار پان صاف ایسے چمکے تھے کہ ہمہ روز "تہہ ہا" سرودہ تھا اور وہ اشعار قاطع جربان میں مندرج ہیں۔

حفتہ بیت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں،

کلکتہ میں یہ ہنگامہ جن لوگوں نے بپا کیا تھا۔ میں ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا مگر بجز دو تین کے معلوم نہ ہو سکے۔ ایک صاحب احمد علی گوپاٹو کے پرنس غلام محمد (میسوری) کے میرمنشی تھے "کارنامہ حیدری" کا انہوں نے اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام "حکمت حیدری" ہے۔ دوسرے صاحب انہوں کے ہم نام مولوی احمد علی مدرس عالیہ میں مدرس اور ایشیائنگ سوسائٹی کی فارسی و عربی مطبوعات کے مصنف تھے میسر ایک صاحب مولوی

۱۔ ملاحظہ ہو "قاطع جربان" صفحہ ۳۸ سہ غالبیہ وہی مولوی احمد علی تھے جنہوں نے آگے چل کر "قاطع جربان" کے

مباحث میں حصہ لیا اور مولد برہان "ملکھی" جس کے جواب میں غالب نے اپنا مشہور قطعہ لکھا۔

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ در خصوص گفتگو سے پارس انشا کردہ است

وجاہت علی لکھنوی گورنر کے دفتر انشاء میں ملازم تھے۔ ان لوگوں نے صرف اعتراض ہی نہیں کئے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات ”جام جہاں نما“ نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا چھاپ دی تھیں۔

وجاہت علی قلیل کے شاگرد اور وجاہت تخلص کرتے تھے۔
 واپسی کب ہوئی | کلکتہ سے واپسی کی تاریخ کا تعین چنداں مشکل نہیں۔ اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ مسٹر اینڈریو اسٹرننگ غالب کے خاص ہمدرد تھے ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۸۳۳ء کو ہوا۔ اس واقعہ سے پیشتر غالب دہلی آچکے تھے۔ اس مقدمہ کے بعد اب غالب کے بیان پر نظر ڈالئے۔ ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں :-

یک شنبہ دوم جمادی الثانی بختی سخی آوارگی در زاد یہ دہلی پلے ہوا من کشیدہ نازم غنچوری
 وجان پردہ سی نگویانے راکد دیں سفر دیدہ روشناس کھنڈے آناں گشتہ کہ وطن را بہ مذاق من
 آشفتنہ مشرب تلخ تو ز غریب ساختہ رسیدن بہ دہلی تلافی اندوہ ہجران کلکتہ نہ کرتا ہر شادی
 چہرہ صد ہر کہ از دہلی نظر مرا نگرد۔ سرگزندانہ کہ رہد پھنزل رسیدہ وہ وطن آرمیدہ ایست بلکہ
 پندار کہ در دمند نیست از روشن دور افتادہ ہزارہ بہ دہلی غریبیت مہبتا۔

جب یہ مسئلہ یہ کہ مئی ۱۸۳۳ء میں غالب دہلی میں تھے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ کو دہلی پہنچے یعنی ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو۔
 آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ غالب واپسی میں مرشد آباد اور باندہ ضرور ٹھہرے۔

کلکتہ سے واپسی کے سفر میں لکھتے ہیں :-

۱۔ غالب نامہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ مولوی عبد القادر امپڈی مولوی کریم حسین علی اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی نے اعتراضات کئے تھے۔ مجھے اس بیان کا ناخذ معلوم نہیں ہو سکا لیکن مولوی کریم حسین خاں کو حضرت خیر میں شمار کرنا غالباً درست نہیں ہو سکتا۔
 ۲۔ دہلی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر غالب کے عزیز دوست تھے چکشی ائی والا قطعہ انہی کے کہنے پر لکھا تھا جیسا کہ غالب نے خود بھی تصریح کی ہے۔

ہر روز کہ روزِ شنبہ است و در شنبہ آدم کشتی ہے جو یہ ہے کہ ہیں یک عدد و زبیرہ و ریاضاں گروہم (رضوی صاحب قلمی ہستی)

ایک خط میں مولوی سراج الدین احمد کو رقم فرماتے ہیں :-

نامہ نامی کدربانہ برمن رسیدہ و جوابش ہم ان دنوں منزل مرقوم گزیدہ سطر سے زہنت نوائے جس کشتی گزری اشت

ایک اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکم جمادی الاول ۱۲۶۵ھ (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء) کو ہاتھ میں تھے! غالب کے اواخر ستمبر یا اواخر اکتوبر میں کلکتہ سے روانہ ہوئے ہوں۔

کلکتہ ہی میں غالب نے چکنی ڈلی کی تعریف میں ارتجالا وہ قطعہ لکھا تھا جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں :-

میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا تقریب یہ کہ مولوی کریم حسین میرے ایک دست

تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ پنہ گف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اسکی

کچھ تشبیہات نظم کیجئے میں نے وہاں بیٹھ بیٹھ نودس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا۔ وہ سلیس ڈلی سے ٹی

ٹھولانا، بوا کلام کے پاس عبد الغفور خاں نسخہ کالیوں کا ایک نسخہ ہے جسے مصنف نے سادہ اور فن کے اضافہ

سے تہ عبثہ کر لیا تھا۔ اس میں وہ اپنا کلام بھی لکھتے تھے کہیں کہیں یادداشتیں بھی قلمبند کی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ

اپنے موضوع پر کرسے کے لئے مزید مواد جمع کر رہے تھے! یادداشتیں لکھتے ہیں عجیب نائب کلکتہ میں قیامت تھے

شاہ احمد کے کیل نے کئی مشاعرے اپنے یہاں منعقد کئے تھے اور کلکتہ کے ایرانیوں کی بڑی تعداد میں شہر آگ

ہوتی تھی۔ ایک مشاعرہ کی طرح یہ تھی، جانو نشہ ایم مانو نشہ ایم۔ غالب نے غزل پڑھی،

تافصلے از حقیقت اشیا نوشہ ایم آفاق را مراد و عنقا نوشہ ایم

حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کو چکنا نامہ قلم تھے

جنہوں نے مجلس میں کھڑے ہو کر کہا۔ اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔

نسخ لکھتے ہیں کلکتہ میں مرزا کا بلنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے رہا اور انہوں نے پوشش لباس میں بھی ایرانی

وضع اختیار کر لی۔ ایرانی وضع سے مقصود غالباً ایرانی پیانچ کا استعمال ہوگا۔ ورنہ ہر طاہر غالب نے در کوئی وضع مخصوص

ایران میں سے اختیار نہیں کی تھی۔

چھٹا باب

رام پور اور میرٹھ کے سفر

اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالب

آنچہ از پاسے نیامد ز عصاے آید

سفر کلکتہ کے بعد غالب کی تحریرات سے صرف تین سفروں کا علم ہو سکتا ہے۔ وہ دو مرتبہ رام پور گئے اور ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے لئے میرٹھ پہنچے۔ البتہ سفر کلکتہ سے پیشتر وہ فیروز پور جھڑک یا لوہارو آتے جاتے رہے۔ ۱۸۲۵ء میں انگریزی فوج نے بھرت پور پر حملہ کیا تھا تو اس موقع پر نواب احمد بخش خاں کے لشکر کے ساتھ گئے تھے، اگرچہ انہیں فوجی خدمات سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خود بیچ آہنگ میں لکھتے ہیں۔

در سال یکہزار و صد و چہل و یک ہجری کہ گیتی ستانان انگلشیہ بر بھرت پور شکر
کشیدہ دآں روئیں دژ راں دہ میان گرفتہ اند، من دریں یورشش بہ جناب مستطاب عم
عالی مقدار فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ ام اقبالہ و زار و فضالہ
رفیقہم و بہ گرامی برادر ستودہ خود سے میرزا علی بخش خاں بہادر ہم سفر است

رام پور کا پہلا سفر | وہ پہلی مرتبہ اواخر جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور مارچ میں واپس آئے۔ قفۃ کو لکھتے ہیں :-

میاں میں جو آخر جنوری میں رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔

قاضی عبدالجلیل بریلوی اور خواجہ غلام غوث خاں بختر کے خطوں میں بھی یہ ذکر آیا ہے غدر میں غالب کی پنشن بند ہو گئی تھی اس لئے کہ ان کے خلاف بھی باغیوں کی اعانت کا شبہ تھا جب گورنر جنرل دہلی آئے اور غالب چیف سکریٹری سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ تو اس نے پہلے روز بے فرصتی کا عذر کیا دوسرے روز ملا تو کہنے لگا کہ تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے، اب گورنمنٹ سے کیوں ملتے ہو؟

جب تک پنشن کے کھل جانے کی امید تھی۔ غالب اس وجہ سے رام پور جانے میں متوقف تھے کہ روپیہ ملے اور قرض ادا کریں تو باہر نکلیں سکریٹری کے جواب نے انہیں بالکل مایوس کر دیا تو اس خیال سے رام پور کے لئے تیار ہوئے کہ نواب سیف علی خاں کے ذریعہ سے صفائی کی کوشش کریں۔ نواب صاحب کئی مرتبہ بلا بھی چکے تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں کہ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔

منازل سفر | دہلی سے ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو روانگی ہوئی۔ رات مرادنگر میں بسر کی۔ ۲۰ کو میرٹھ پہنچ کر ایک روز قیام کیا۔ وہاں سے ۲۲ کو شاہ جہان پور، ۲۳ کو گڑھ مکتیشہر بعد ازاں مراد آباد ہوتے ہوئے رام پور فائز ہوئے

ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

بھائی میں نے دہلی کو چھوڑا پنجشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو مکھ کر روانہ کیا۔ کل شاہ جہان پور اور پرسوں گڑھ مکتیشہر ہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

تم سے رخصت ہو کر اس دن مرادنگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۲ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے، خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ کل شاہ جہان پور، پرسوں گڑھ مکتیشہر رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔

اس سفر میں عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادے باقر علی خاں اور حسین علی خاں بھی ہمراہ تھے۔ فرماتے ہیں :

دہلیوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو خطان کی دادی دیگم غالب کو بھجوا دیئے ہیں تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور راستانی جی دیگم غالب کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر و عافیت کہنا۔

دہلی سے روانگی کے وقت غالب نے منزل مقصود کو اخفا میں رکھا تھا۔ وہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں ۔

بھائی میں اردوئے مصلحت اپنے کو مختلف مقالات کا عازم کہہ آیا ہوں، اب جو شخص تم سے پوچھا کرے اس سے پردہ نہ کرنا۔ صاف کہہ دینا کہ رام پور کو گیا ہے۔ یعنی سب

کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔

رام پور کی کیفیت | رام پور کی کیفیت ان نفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

اب میرا حال سنو، عظیم توقیر بہت ہے، ملاقاتیں بین ہوتی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے یہاں پھر تو دو کو بھی میسر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں کچی دیواریں اور کچھریں۔ سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے مجھ کو جو مکان ملے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیاں نہیں آئی میں خود ان سے ابتداء کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ

۱۲۷ غائب نے اس صحت کی تفصیل بیان کی کہ ناضل محترم مولانا امتیاز علی صاحب عرشی جامع مکاتیب غائب فرماتے ہیں :-

”اس وقت تک گورنمنٹ نے میرزا صاحب کی بریت تسلیم نہیں کی تھی اور انہیں قدر کے بعد سفر کا پہلا اتفاق

تھا اسلئے یہ نظریہ لاحق ہوا کہ انہیں رام پور جانے سے روک نہ جاؤں۔ یا کوئی حاسد سرکار کو یہ نہ ماکھ دے کہ میرزا

صاحب گورنمنٹ کی نظریں بھی مشتعل ہیں، یہیں اپنی ریاست میں نہانے دیجئے میرے نزدیک یہ ارشاد نظر ثانی

کا نتیجہ ہے۔ اول اس لئے کہ غدر کے بعد سفر کا پہلا اتفاق نہ تھا بلکہ غائب اس سے پیشتر میرٹھ کا سفر فرما چکے

تھے۔ دوم چند معلوم آدمیوں کے سوا جس کو غدر کے بعد ہی باہر جانے سے یا باہر سے دلی آنے سے روک دیا گیا تھا۔

عام آدمیوں کو سفر سے روکنے کی دلی مشل نہیں ملتی بلکہ معلوم ہے کہ خود غائب کے عزیز دوستوں میں کئی سیاح

۱۲۸ اور چلے گئے تھے مثلاً نواب حسین مرزا، ہونڈل شاہی، مہینہ گئے اعتبار سے غائب کے مشابہ میں زیادہ مورد الزم ہو سکتے تھے

اور جن کے بھائی کو بہ الزم شرکت غدر کوئی مادی گئی تھی۔ نسوم غائب کے عدم برأت کا معاملہ صرف پنشن کی بندش اور خلعت

کی موافقت تک محدود تھا۔ سکہ گوئی کا الزام ابتدا ہی میں رفع ہو گیا تھا۔ بہارم نواب یوسف علی خان جو غائب کے تمام حالات واقف تھے

کہ انکی پنشن اور خلعت مسدود ہے خود اس باب میں ہر ممکن اعانت کیئے سرگرم کوششیں فرماتے تھے۔ دوسرا چمکاتیب غائب صفحہ ۵۲

اقتباس کنندہ نے اب یوسف علی خان جویم، دسمبر ۱۸۵۹ء تک وہ باہر ملا ہے تھے ان حالات میں کہ علی سد کی غازی کے موثر ہر یکا کیا اندیشہ تھا

۱۲۹ ۱۲۷ مکاتیب غائب سے معلوم ہوا کہ نواب یوسف علی خان نے انہد میں چار دن تک غائب کو اپنی کوٹھی میں رکھا۔ بعد کو غائب بس مکان

میں فروکش ہوئے وہ محلہ راج دوارہ کی، اس شہرہ پر جو خاص باغ پیس کو جاتی ہے مولوی محمد یحییٰ صاحب دکن کے مکان کے

متصل واقع تھا۔ آجکل وہاں ایک ہنگر مقیم ہے وزیر عظیم رام پور کے حکم کے مطابق وہاں دیکار کے طور پر ایک پتھر لگا دیا گیا ہے :-

دیکھیں گے مگر بواسطہ کلر پرندہ زہن سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا قدر کرتے ہیں کھانا دونوں
وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غلام میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کاشکر کس
منہ سے ادا کروں، ایک دریا ہے کسی سبحان اللہ اتنا میٹھا کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھبکا شربت
ہے صاف سبک گرا، سریع النفور۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ
ہوں۔ صبح کو خوب بھول گئی ہے لڑکے بھی تندرست آدمی بھی تو انا مگر ہاں ایک عنایت
وہ دن سے کچھ بیمار ہے۔

یہ خط ۳ فروری ۱۸۶۰ء کا لکھا ہوا ہے اس وقت غالب کو رام پور پہنچے ہوئے آٹھ روز ہو
چکے تھے۔ لہذا سمجھنا چاہیے کہ وہ ۲۶ مارچ، ۱۸۶۰ء کو دارو رام پور ہوئے تھے۔
دریائے کوئی | دریائے کوئی کی تعریف غالب نے میر ہمدانی مجروح کو بھی لکھی تھی،

پیشویر رام پور دارا مسطور ہے جو اظہارِ حال ہے وہ اور کہاں ہے پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو
قدیم کے فاصلے پر ایک دریا ہے۔ کوئی اس کا نام ہے، بے شبہ چشتیہ حیاتنی کوئی سوت اس میں ہے
نیر اریوں بھی ہے تو بہانی آب میات عمر بڑھاتا ہے۔ مگر تا شیریں کہاں ہوگا۔

پنشن کے متعلق سفارش کا نتیجہ | ۳۱ فروری ۱۸۶۰ء کے خط میں حکیم غلام نجف غلّ کو لکھتے ہیں۔

نواب لغات گورنر اترمت مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ وہاں سب
دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے۔ تو میں بھی ساتھ جاؤں گا۔
اگرچہ گورنر غرب و شمال رصوبہ متحدہ اگر وہ داد دھ (کوئی بے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں کیا
گفتگو درمیان میں آتی ہے۔ جو واقع ہوگا نہیں لکھوں گا۔

اس سے غالب کا مدد غلطی تھا کہ پنشن کے باب میں جو بات چیت ہوگی اس کی
کیفیت لکھوں گا۔ اگرچہ صوبہ جات متحدہ کے گورنر کو دہلی سے کوئی علاقہ نہیں تھا لیکن
وہ سمجھتے تھے کہ شاید نواب صاحب کی سفارش سے کوئی راستہ نکل آئے۔

میں حسبِ لطف نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بندریاں کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں۔

دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب اور عرضی اور اسطہ ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں کیا ہوں چھ مہینے میں جہان پہنچتا ہے یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

واپسی اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب آخر مارچ ۱۸۶۲ء میں رام پور سے واپس آگئے۔ دہلی میں ان کی واپسی پر چھ میگوٹیاں شروع ہو گئیں۔ خود فرماتے ہیں:

یہاں ہیں جو آخر جنوری کو رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گردہ کا قول ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا استاد تھا۔ وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا۔ تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے۔ مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے۔ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا دوسرا یہ مبینا کر دیا تھا۔ نواب لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا دہاں ہونا معلوم ہوا۔ تو انہوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو۔ تو اسے جواب دے دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔

اس کے بعد خرد اصل حقیقت بیان کرتے ہیں :-

اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی شاہ تیس برس کے میرے دوست اور پانچ برس سے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے اب جولائی ۱۸۶۱ء سے سمرہ پیر مہینہ ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر علائقہ بہترہ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں۔

ہر گویاں نفقہ نے قیام رام پور کے دوران میں لکھا تھا۔ کہ مجھے بھی وہیں بلا لیجئے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر الہ آباد میں ہیں اور وہاں سے رام پور آئیں گے بعد ان کے جانے کے کوئی طوع یا امتناع قائم نہ ہوگا۔ ہر گویا منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہو تو تم کو بلا لوں گا۔ میری مجروح نے غالباً جلد واپس آ جانے کا سبب پوچھا تھا۔ لکھتے ہیں :-

میر مہدی تم میری عادت کو ٹھوکی گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی سحر جاسم کی ترامیچ ناغہ ہوتی ہے؟
 میں اس مہینے میں رام پور کیوں رہتا؟ نواب صاحب مانع ہیں اور بہت منع کرتے ہیں۔ برسات کے
 آس کا لالچ دیتا ہے مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کر چاند رات کے دن یہاں پہنچا۔
 ایک شنبہ کو غزوہ ماہ مدرسہ ہوا۔ اسی دن صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی
 جعفر علی صاحب قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع میں نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتا
 تو وقت صوم مہتاب نماز جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔
 لیکن یہ سب مشاغل محض افسانہ تھے، شوقی طبع کے کرشمے تھے، اصل کیفیت بتاؤں
 بیان کرتے ہیں:-

لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھج دینے میں وہم
 آیا کہ خدا جانے اگر کوئی حادثہ ہو تو بدنامی عمر بھر کی رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا
 ورنہ گرمی برسات کے دن، ہاں، ہاں، بے شرط جیانت جریدہ بعد برسات کے جاؤں گا۔
 اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔

یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:-

میں ۲۳ شعبان ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۸۷۹ء کو رام پور سے چلا اور ۳۰ شعبان
 مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۷۹ء کو دہلی پہنچا۔ اسی دن چاند بڑا۔
 اپنی تنخواہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

نواب صاحب دوستانہ و شاکردانہ دیتے ہیں مجھ کو زکوٰۃ نہیں سمجھتے۔ مدانات بھی دوستانہ ہی معافہ و عظیم
 جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے، لڑکوں سے میں نے نذر و لولائی بھی لیں
 بہر حال قیمت ہے۔ رزق کے لیے طرے بننے کا شکر ہے اور کناچا بیٹے کی کا شکر ہے۔

نادر شاہ خاں شوخی کا بیان | غالب کے آخری عہد کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی
 رام پور کے باشندہ تھے۔ جو کھانا میں جا بے تھے۔ اور وہیں وفات پائی۔ حضرت

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ وہ غالب کے قیام رام پور کے حالات بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ صرف تذکرہ پھیڑ دینے کی دیر تھی۔ پھر ایک پوری داستان شروع ہو جاتی۔ غدر کے حالات بیان کرنے کا بھی انہیں بڑا شوق تھا۔ مرزلی کے معرکوں کے چشم دید شاہد تھے۔ افسوس کہ پھیلی نسل کے ساتھ غدر کے یہ تمام افسانے بھی مہ فون ہو گئے۔ اگر قلمبند ہرگز نہ فوت تار پیرج کے یہ قیمتی سرمایہ ہوتا۔

کہنے لگے تھے جب مرزا غالب پہلی دفعہ رام پور آئے تو میں بڑے جوش و شہادت سے خدمت میں حاضر ہو کر تلذذ کے لئے خواستگار ہوا۔ لیکن مرزا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ فرمایا:-

”تم جانتے ہو میں نواب صاحب کا بلایا ہوا وارث ہوں۔ میں نے اصلان شہر کی خدمت میں رہ کر ان کے علم و ادب کے بہانے کسی کے کلام پر اصرار نہیں دے سکتا۔“

بڑی مایوسی ہوئی، لیکن صبح و شام یہاں حاضری دینا رام پور میں ان کا رہتی تھا۔ کمال معمول تھا۔ کہ جس دن نواب صاحب کے یہاں جاتے۔ سہ پہر کا دیوان حسانہ ملتوی رہتا۔ ورنہ سہ پہر کو عام طور پر لوگوں سے ملاقات کرنے پر ریاست میں جس قدر اہل علم و فن تھے، مرزا کی موجودگی کو مستعمل تصور کرتے اور بالکل آرام آیا کرتے۔ شب کی صحبت خاص ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ ان کے کیف و سرور کا وقت ہوتا تھا۔ عروسیابی لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے، جس سے کسی طرح کا تکلف نہ ہوتا۔

اتفاق سے ایک معاملہ ایسا پیش آگیا جس نے مجاہدہ مست کراری کا ایک خاص موقع دیا۔ مرزا صاحب وہلی سے جب چلے تو انہوں نے اپنے ساتھ عرق نوشی کا تان سامان لے لیا تھا۔ کہ مہینے بھر کے لئے کفایت کرتا۔ انہیں خیال تھا کہ اس سے زیادہ قیام نہ ہوگا۔ لیکن قیام زیادہ ممتد ہوا۔ جب آخری بوتل کی نوبت آگئی تو بہت متزدد

ہوئے۔ رام پور میں انگریزی شراب کی کوئی دکان نہ تھی۔ بریلی اور مراد آباد سے مل سکتی تھی لیکن جو نوکر ساتھ تھے۔ انہیں اس متاع کے شناسا نہیں سمجھتے تھے حیران تھے کہ کس شخص سے کام لیں۔ میں ایک دن حاضر ہوا۔ تو مجھ سے یہ حال بیان فرمایا۔ میں نے عرض کیا: آپ کا حکم ہو۔ تو شراب اپنے حلق میں اندیل لوں، خرید کر لانا کون سی بڑی بات ہے۔ مجھے نام، قسم اور قیمت بتا دیجئے، ابھی جا کر بریلی کے ایک ایک شراب خانہ پر دستک دوں گا۔ فرمایا: نہیں میاں۔ ایک قطرہ بھی نہ پینا ساگر پینے پر آ جاؤ گے۔ تو مجھے کیا لا کر دو گے۔ ہاں جس طرح بتلا دوں، اسی طرح کام پورا کر دوں۔

یہ ہر حال انہوں نے مجھے شراب کا نام بتلایا۔ اس کی خالی بوتل دکھائی۔ زیر استعمال بوتل دکھا کر رنگ و شکل سے آشنا کیا۔ پھر صرف ایک بوتل لانے کا حکم ہوا۔ اگر حسب منشا آئی تو دوبارہ بھیج کر مزید سگوائیں گے قیمت کے علاوہ مجھے دو روپے اور مرحمت فرماتے تھے۔ کہ خرچ کے لئے رکھ لو بیکن میں نے یہ ہزار سنت اسماح اس سے باز رکھا اور عرض کیا، مجھے پہلے وہاں سے ہوائے دیجئے پھر جو کچھ مطلوب ہو کا عرض کر دوں گا۔

میرے والد فوج میں سردار تھے۔ غنیمتیں کر کے ان سے روپیہ لیا اور بریلی روانہ ہو گیا۔ مرزا صاحب نے صرف ایک بوتل کے لئے فرمایا تھا۔ میں نے پانچ بوتلیں خریدیں۔ اور لا کر سامنے رکھ دیں یہ ٹھیک اُن کی فرمائش کے مطابق تھیں۔ نہایت درجہ خوش ہوئے فرماتے لگے: میاں! کہتے ہیں شراب پینے والے کی دُعا مستجاب نہیں ہوتی اب میں تمہیں دُعا نہ دوں تو اور کیا دوں؟ میں نے عرض کیا: حضور! انہی بوتلوں کی شراب نوش جاں فرما کر میرے لئے دُعا کیجئے۔ میرا ایمان ہے کہ انہی دُعاؤں سے میرا عقدہ حل ہو گا۔

بہت اصرار فرمایا کہ روپے لے لو، میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہ لوں گا۔ دو روپے

دن حاضر ہوا تو فرمایا: وہ تمہاری غزل کہاں ہے جو اس دن لائے تھے؟ وہ تو ہر وقت میری جیب میں رہتی تھی۔ میں نے پیش کر دی۔ اسے دیکھ کر جا بجا اصلاح دی۔ اصلاح

دیتے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ مدایات و افادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بس اس دن سے ان کی شاگردی کی سعادت ہاتھ آگئی۔ پھر وہی گیا اور کئی ماہ تک خدمت میں رہا۔ دہلی میں ایک دن کہنے لگے ”تمہارے رام پور کے تعلق نے مجھے موت سے بچا لیا مگر زندگی بھی اجیرن ہو گئی۔ اس حال خلقت کو معلوم نہیں۔ اتنی بات سن لی ہے کہ رئیس رام پور کے استاد ہیں۔ بس ہر شخص اپنے اپنے قیاس کے مطابق میری دولت مندوں کا حساب لگاتا ہے اور چرچے پھیلاتا ہے۔ عزیز و اقارب تک باور نہیں کرتے کہ وہاں سے صرف سو روپیوں پر جی رہا ہوں۔ اہل حاجت آتے ہیں اور اپنی اپنی بربادوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ ایسا دل کہاں سے لاؤں کہ خشک جواب دے دوں! قرض وام لے کر بھی ان کی حاجت روائی کرنی پڑتی ہے۔“

حضرت مولانا فرماتے ہیں:۔ نادر شاہ خاں نے مجھے اپنا ایک قطعہ بھی دکھایا تھا۔ جس پر مرزا غالب کے قلم کی اصلاح تھی۔ ایک موٹے مفتوے پر لگا کر وصلی کی طرح اسے محفوظ رکھا تھا۔ میں آدیشہ ان سے کہتا تھا کہ مجھے دیدیجے۔ مگر ہاں ہاں کر کے مال دیتے تھے۔ نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا۔ میں پھر بمبئی چلا گیا۔ واپس آیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

دوسرا سفر رام پور | غالب نے رام پور کا دوسرا سفر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کیا۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں نے ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۸۶۵ء کو وناٹ پائی۔ اُن کی جگہ نواب کلب علی خاں بہادر سندھ نشین ہوئے۔ اس تقریب کے جشن پر غالب دوسری مرتبہ رام پور گئے تھے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کو تحریر فرماتے ہیں:۔

فقیر باد رکاب ہے سہ شنبہ چار شنبہ ان دونوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہوگا۔

تقریب وہاں کے جلنے کی رئیس مرحوم (نواب یوسف علی خاں) کی تعزیت اور رئیس حال (نواب کلب علی خاں)

کی تنہایت دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔

راستہ اور مناظر | یہ سفر غازی آباد، پلکھوے، ہاپوڑ اور مراد آباد کے رستے ہوا تھا۔
 باقر علی خاں اور حسین علی خاں اس سفر میں بھی ساتھ تھے۔ نواب شہاب الدین احمد خاں
 شاقب کو لکھتے ہیں:

غازی آباد کا حال ششاد علی دشت اور علی بیگ رضاں سے سنا ہوگا ہفتے کے دن، الگبر
 ششاد دتین گھڑی دن چڑھے اجاب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ منہ صد یہ تھا کہ
 پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلہ کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دو تو پر خوردار گھوڑوں
 پر سوار پہلے چل دیئے۔ چار گھڑی دن رہے ہیں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں
 کو بیٹھے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔

ہمراہی پہلے سفر میں بھی کافی تھی اور دوسرے سفر میں بھی اس کی تعداد خاصی معلوم
 ہوتی ہے۔ کھانے کی کیفیت ان نفلوں میں لکھتے ہیں:

میں نے چٹانک بھر گھی دانغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہر گھڑی تھی۔
 شرب بن لی۔ کباب کھا لے۔ لڑکوں نے اہر کی کچڑی پکوائی۔ اور خوب گھی ڈال
 کر آج بھی کھائی۔ اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن
 پکرایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔

ساحفرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:

اگر کہتے گھی ڈال کر تو گھی کے ڈالنے کا تذکرہ نہ ہو جاتا۔ مگر اس گھی کا نہ ہوتا۔ جو کچھڑی کا ذائقہ
 شناس کچڑی میں ڈال کر بنا ہے۔ اس لئے مقداد کا پہلو اُبھارنے کی غرض سے جو گھی ڈال کر
 قلم سے نکلا۔ کیا قدرت تحریر تھی اور کیا اسلوب، و تعبیر کی جزئیات و دقیق کا احاطہ تھا!

پھر فرماتے ہیں :-

چار پانچ بجے صبح کے عمل میں باپڑ سے پہلے دیوار سورج نکلے باہر گر لھکی سرائے میں پہنچا۔

جا پانی کھائی۔ اس پر کچھونا بچھا کر حقیقی رہا ہوں۔ اور خط لکھ رہا ہوں۔ دو گھوڑے

کو لے آ رہے ہیں۔ دونوں لڑکے تختہ میں سوایاتے ہیں وہ آئے، اور کئی لکھاپ اور چلے۔

اس سے معاذم ہوتا ہے کہ سواری کے لئے دو گھوڑے ایک رتھ اور دو گاڑیں تھیں۔

خود غالب یا لکی میں سفر کرتے تھے۔ حکیم تھاکر نجف خاں کہتے ہیں :-

بدھ کا دن ہے پیر ہمدردں جڑھا ہو گا۔ فقط میں یا لکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۲۸ جولائی ۱۸۸۲ء

کی اور ۱۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کی ہے، دونوں کے دونوں کاٹیاں اور رتھ اور آدمی پیچھے ہیں۔ اب

آئے جاتے ہیں۔ رات بھر گزرے کل رام پور پہنچے باؤں کا ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو گھبرا

ہوا ہمدرد بقدر ان سے پاتا نہ بھرتے کہ لڑکے بھیر و عاقبت ہیں۔

واپسی رام پور ۱۲ اکتوبر کو پہنچے تھے۔ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ۔ اکتوبر کو

دلی سے چلے تھے۔ اس لحاظ سے پانچ روز سفر میں صرف ہوئے۔

رام پور کی سرکار نے فیر کبیر دار و زر بنہ خوار نہیں کیا۔ یہ منہ نشینی، مشن کیا، وہاں گوت

دولت کو رد و منت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتہ اکتوبر کو دلی سے رام پور روانہ ہوا۔ اور

قطع منازل رسد وہاں پہنچا۔ بعد غلام جشن عازمہ وطن ہوا۔ ہشتم جنوری ۱۸۸۴ء کو دلی

پہنچا۔ عرض راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحب خراش رہا۔

یا قر علی خاں اور حسین علی خاں ۲۲ دسمبر کو رام پور سے چلے گئے۔ غالب ۲۵ دسمبر

کو روانہ ہوئے۔ ویسا پچہ مکاتیب غالب سے واضح ہوتا ہے کہ ان دنوں

دریائے رام گنگا میں سرمائی بارش کے سبب سیلاب تھا۔ غالب کی پانکی دریا سے

گزر گئی۔ تو پانی کے زور سے پل ٹوٹ گیا۔ اسباب کی گٹیاں اور عظام دریا کے دوسری

طرف رہ گئے۔ غالب مراد آباد کی سرائے میں پہنچے۔ تو ان کے پاس صرف ایک کمبل

تھا۔ رات اسی میں بسر کی۔ بڑھاپے کی کمزوری اور دسمبر کی تیز سردی کی تاب نہ لا سکی اور وہ بیمار ہو گئے۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کو معلوم ہوا تو انہوں نے دو آدمی بھیجے اور سرائے سے اٹھا کر سعید الدین خاں کے ہاں لے گئے۔ مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور کو معلوم ہوا تو وہ اپنے گھر لے گئے اور پانچ روز انتہائی اہتمام سے ان کی تیمارداری کی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی وہیں غالب سے ملاقات کی اور رام پور پہنچ کر سارے حالات نواب کھب علی خاں کے گوش گزار کئے۔ نواب مرحوم نے فوراً ایک سوار مراد آباد بھیجا اور فرمایا کہ اگر طبیعت مائل بہ اعتدال نہ ہو تو رام پور آجائے تاکہ بخوبی علاج ہو سکے۔ لیکن غالب اس سے پیشتر دہلی روانہ ہو گئے تھے جہاں وہ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو پہنچ گئے۔

حالات زمانہ قیام | ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں نہ
کا کھانا ایسے وقت میں آتا ہے کہ پہر دن چڑھتے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکے ہیں شام کا
کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کا سالن پلاؤ متبخن پسندے دو نو وقت روٹیاں نمیری ،
دہانیاں، مربے، اچار ہیں یہی خوش لڑکے بھی خوش لگتا اچھا ہو گیا ہے۔ منقا، مشعلی، خاکرب
سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی رکھ دیا ہے۔ آج تک دو ملا تائیں ہوئی ہیں۔ فطیم،
نواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔

پھر لکھتے ہیں :

نواب صاحب کا اخلاص و انتفاع روز افزوں ہے۔ آج منگل کا دن ۲۴ جمادی الثانی کی اور
۲۴ اکتوبر کی ہے۔ کھانے اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس
میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جسر شروع ہو گا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی
مدت اس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔

میرزا شمس علی بیگ رضویوں کو تحریر فرماتے ہیں:

آج ۴ نومبر کی ہے پرسوں نواب صاحب دہلی آئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ دو ہفتے میں
اؤں کا اگر بار وزیر ہیں۔ میں گھبراتا ہوں، برائی ہو جائیں گے وہاں پہلے کر رہا ہونے
تو اسب کشتریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ انچ و میر تکس بائیسے تین سو تیس رہیگا۔ اس کے
دو ہاںہ و ذل بعد غالب رعیت ہوگا۔ نہ اکرے تو اسب زندہ پہنچ جائے۔

کیفیت جشن ۱۸۶۶ء ستمبر ۱۸۶۶ء کے مکتوب میں نواب، نواز الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

جہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ بے تہیہ کر لیں تو میں نہ جانتا۔ اس سے دو کوس یا غاپور
نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں کیا ہوا ہے۔ پر موں صاحب کائنات چاہے ہوں
اور صاحب کے لئے اور خیموں پر نہ۔ اس میں سب سہارا ہوئے۔ سب رکھ رہا ہوں
کے جہاں رکھ رہے ہیں۔ یہ سب سہارا ہے۔ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب
دو بجے گئے۔ اس نام کو پانچ شبہ تاح ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس میں
خواس میں سے وہ پہلے پھیلتا ہے۔ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں
۱۸۶۶ء آج سامان عاوض کے ہوئے۔ چنانچہ اس میں اس کا سبب
وہاں شہر کی وہ افراتفری ہے۔ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں
اس مجلس کو جو عطف الملک کہنا چاہیے۔

نواب کلب علی شاہ مرحوم نواب صاحب دہلی کے فرزند تھے۔ ان کی زندگی میں:

تدارک کے سبب ان کی طبیعت میں بڑا فرق آیا۔ وہ بڑے کچھ چہرہ اور عجیب متفاوت
طبیعت تھے۔ ان کی یہ قدر تھی کہ وہ سب سے زیادہ شہر میں شہر کی طرف تھے
نہیں تشریف لے جاتے۔ ان کی طبیعت میں بڑا فرق تھا۔ ان کی طبیعت میں
ایک کہ ان کو دیکھتے تھے کہ ان کو سب سے زیادہ شہر میں شہر کی طرف تھے
ایک اور نئی روح غالب میں آئے۔

جاکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

نواب صاحب ہاں یہ مفتضائے اولاد سر لاجپتہ حسن اخلاق میں نواب قردوس آرامگاہ کے برابر بلکہ بعض شیوہ و روش میں ان سے بہتر ہیں۔ یہ مجرد سند شیشی کے غلام کا محصول ایک قلم معاف کر دیا۔ علی بخش خاں سامان کو طیس ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا۔ مفصل حالات بذل و نواں عند اللغات زبانی کہوں گا۔ سنبو صاحب میں فقیر آزادہ کیش ہوں، دنیا دار نہیں، مکان نہیں جس میں جو صفات دیکھتا ہوں بیان کرتا ہوں۔

منتفردی عادات | اس جشن میں غالب کے نہایت عزیز دوست نواب مصطفیٰ خاں شیفقتہ بھی شریک ہوئے تھے نیز فشتی نو لکشور مالک مطیع نو لکشور نے اپنی صاحبزادی کی شادی کے سلسلے میں مالی سادگی عرضداشت پیش کر رکھی تھی۔ غالب ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں ہر گوبال لفتہ کو لکھتے ہیں :-

میں شرکی داد اور نظم کا صلہ مانگتے نہیں آیا، مہیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گروہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت نواب صاحب از روئے عورت دست مجتہم و باعتبار اخلاق ابرہمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تھویدار ہیں۔ جو شخص و فرزند۔ جو کچھ لکھوا دیا ہے اس کے بیٹے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کٹی ہزار۔ پ ہاں کا غلام کا محصول معاف کر دیا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار کا مجاہدہ معاف کیا اور

سلہ دیباچہ سکاتیب عالیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب کاب علی خاں نے ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپے کی رقم دی تھی۔ روانگی کے وقت دوسو روپے کی مزید رقم بوجہ زاد راہ مرحمت فرمائی۔ قیام کے لئے جرنیلی کوٹھی دی جو اس زمانے میں قلعہ معلیٰ کے مشرقی دروازہ کے باہر واقع تھی۔ نواب سید حامد علی خاں مرحوم نے قدیم عمارتوں کو گرا کر نئی عمارتیں تعمیر کرائیں تو یہ کوٹھی قلعہ معلیٰ کے اندر آئی۔ یہیں یہ عمارت مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ فتنی نو لکھ روپے کی عرصی پیش ہوئی۔ تھلا صد عرصی سن زیادہ واسنے
 فتنی صاحب کے کچھ خطیبہ بہ تقریب شادی صبیہ تجرید ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں چلی
 بجائی۔ صفت خاں بہ تقریب رستہ نشینی و شمول جشن آئینا ہے میں اس وقت تک نہیں آئے
 واپسی کے بعد دہلی سے سندھ کو لکھتے ہیں :-

۸ جنوری ساں حال رستہ نشینی دو شنبہ کے دن غضب الہی کی طرف اپنے کھڑپا لٹا دیا
 مراد آباد پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ روز صدر الصدوس کے ہاں پڑا رہا۔ انہوں نے بیمار دروں
 اور مختاری بہت کی۔

غالب نے سفر کلکتہ کے سلسلے میں بتا رہے ہیں کہ ایک قطعہ لکھا تھا:
 مغلوب سلطنت غم دل غالب حزیں کا نہ تفتش نہ شعوت توں گفت ہاں نہ بود
 لویہ زندہ تابہ بنائیں۔ سببہ است "مارا ازیں گیا ہنم عیفت ایس گماں نہ بود"
 سفر رام پور سے واپسی پر اس قطعہ کو بوں بنا دیا:

مغلوب غلبہ غم دل غالب حزیں کا نہ تفتش نہ شعوت توں گفت ہاں نہ بود
 اذرام پور زندہ بہ دہلی رسیده است "مارا ازیں گیا ہنم عیفت ایس گماں نہ بود"
 بس زمانے میں و درام پور میں تھے تناقضی عبد الجبیل صاحب بریلوی نے لکھا تھا۔
 کہ بریلی میں نمائش ہو رہی ہے۔ تشریف لائیے اور نمائش کی سیر بھی کیجئے۔ جواب
 میں لکھتے ہیں:

مر نہ نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں بریلی کہاں۔ ۲۰ اکتوبر کو یہاں پہنچا
 یہ شرط جہانگیر دہلی جاؤں گا۔ نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں، خود اس نمائش گاہ کی سیر
 سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔

سفر سرٹھ | میر ٹھہ کے سفر کی تقریب یہ تھی کہ غدر میں دوسرے اکابر کے علاوہ نو ارب
 مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور سات سال قید کی سزا ہوئی۔

بعد ازاں بے گنہ بنی ثابت ہوئی۔ رہائی کی خبر سن کر غالب اُن سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے تھے یہ سفر او آخر جنوری ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ تین روز میرٹھ ٹھہرے اور ۲۵ جنوری کو دہلی واپس آئے۔ ہر گوپال قفٹہ کو لکھتے ہیں:

میں سمجھتا تھا کہ ملاقات کو پہلے میرٹھ میں آنا پڑتا تھا۔ مگر وہاں رہا۔ مگر وہاں سے واپس آیا۔ آج تم یہ خط بھجوا دیا۔ محروم رہا۔ چہاں شفیقہ اور جنوری ۱۸۵۹ء۔ پھر لکھتے ہیں:-

معاذ میرٹھ سے آکر تم کو خدا کا حبیب شاید پہنچا ہو۔ میں اسے اندر سے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب صاحب سے غارتگی کو پہلے ڈاک میرٹھ گیا تھا اور پھر شفیقہ کے ذریعے آکر صبح ایک شنبہ سی اور جنوری ۱۸۵۹ء۔

مارہرہ جانے کا ارادہ غالب کے اور کسی سفر کا نام نہیں ہوتا۔ البتہ بعض سفروں کے ارادوں در بعض دعووں کا ذکر ان کے خطوط میں آیا۔ بجا ملتا ہے، لیکن نظر یہ ظاہر نہ یہ ارادے پورے ہوئے اور نہ غالب نے دعوتیں قبول کیں۔ مثلاً ایک موقع پر مارہرہ کے ایک صاحب سے یہ طریق تمنا ذکر کیا تھا کہ مارہرہ جانے اور پیٹ بھر کر آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ صاحب عالم مارہرہ نے جو غالب کے خاص معتقدین میں سے تھے۔ یہ سننا فوراً لکھا کہ جلد مارہرہ آئیے اور دہلی سے روانگی کا دن لکھئے۔ جواب میں فرماتے ہیں:-

حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے؟ میں نے مرشد زادے کے خط میں کب اپنا عزم لکھایا۔ کس نے آپ سے میری زبانی کہا کہ آپ روضہ روانگی کے تقریر سے اطلاع جانتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدم بوسی اور انوار الدولہ کے دیدار کی آرزو سے زیادہ ہے اور بس جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں سے جاؤں گا۔

پھر لکھتے ہیں:-

لکھتے ہیں :-

دیں فرخندہ ہنگام امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر شہنشاہ جنگ
 کرد سادہ نشین ایالت فرخ آباد است و رود من بہ فرخ آباد آید و کرد - ہر چند خوشہ نشینی و
 نامرادی آئین من است اما بہ مشاہدہ مہرے کہ این والا جاہ بامن مے و رز و آہنگ اس دارم
 کہ پائے خوابیدہ را بہ رفتار آرم و از دلی بہ فرخ آباد پویم و شمارا با خوشنشن برم - چہ خوش
 باشد کہ پیوند اقامت پشوی کہ نہ بر نمازہ اندیش شہاست بگسید و ہم دین ہفتہ بہ من
 پیوندید -

ہلاک شیوہ تمکین مخواہ مستان را

عنان گسستہ تر از باد نو بہار بیا

یہ معاہدہ نہیں ہو سکا کہ غالب فرخ آباد گئے یا نہیں گئے لیکن یہ ہر حال ان کا قصد
 ۱۸۳۶ء سے پیشتر کا ہے۔ اس لئے کہ ۱۸۳۶ء میں نواب تجمل حسین خاں کا انتقال
 ہو چکا تھا۔ غالب کی ایک اردو غزل کے آخر میں تجمل حسین خاں کی مدح میں چند
 اشعار بطور قطعہ موجود ہیں۔

بقعہ نوٹ صفحہ ۱۴۱ - آخری دور کا ایک مشہور سردار اور جرنیل تھا۔ اسی نے ریاست فرخ آباد کی بنیاد ہی تھی
 اور فرخ آباد کا قصبہ فرخ سیر کے نام پر آباد کیا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں محمد خاں کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا قاسم خاں
 بانشین ہوا۔ وہ لڑائی میں مارا گیا تو اس کا بھائی اسلام خاں رئیس بنا۔ اسلام خاں کے بعد ایک اور بھائی احمد خاں نے
 ریاست سنبھال لی۔ احمد خاں کے بعد اس کا بیٹا مظفر جنگ سنبھالیا۔ ۱۸۳۶ء میں
 وفات پائی تو اس کا بیٹا مظفر جنگ بھٹا شوکت جنگ گدی پر بیٹھا۔ نواب تجمل حسین خاں شوکت جنگ کے صاحبزادہ
 تھے۔ ۱۸۳۶ء میں وفات پائی۔ چونکہ ان کے اولاد نہ تھی۔ اس لئے ان کے چھوٹے بھائی تفضل حسین نے
 ریاست پائی۔ لیکن غدر میں تفضل حسین پر بغاوت کا الزام لگا۔ اور فرخ آباد کی ریاست ضبط ہو گئی۔
 تفضل حسین خاں کے مزید حالات آپ کو باب غدر میں ملیں گے۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے بنا ہے عیش تجل حسین خاں کے لئے
 زباں پر بار خدا یا یہ کس کا نام آیا کہ سیر لطق تے بوسے مری زباں کے لئے
 نصیر دولت دیں اور معین ملت و ملک بنا ہے چرخ بریں جس کے آستان کیلئے
 زمانہ عہد میں اس کے ہے محور آرائش
 بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

گوالیار کا روادہ | میر سید علی خاں بہادر عرت حضرت جی کے نام کے ایک فارسی خط سے
 معلوم ہوتا ہے کہ گوالیار جاتے کا قصد کیا تھا حضرت جی کو لکھتے ہیں کہ مجھے ولایت سے
 اپنے مقدمے کے متعلق آخری اطلاع کا انتظار ہے۔ اس کے بعد:
 جزاں مایہ مدت کہ یہ سرانجام ضروریات سفر و قافا تو نہ کر دیہ دہلی تیار امام دروے بہ گوالیار
 نہم و اگر زندگان بہ پائے رہ نہ من پہ سر لپچم۔

غالباً یہ قصد بھی پورا نہ ہوا۔

سورت کی دعوت | غالب کی زندگی کے آخری دنوں میں ثواب میر غلام بابا خاں انہیں
 سورت بلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ریل کے سفر میں تکلیف نہیں ہوگی۔ ان کے
 تقاضے کے جواب میں لکھتے ہیں:-

یہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے پاؤں سے ہوا ضعف
 بصارت، ضعف مانع، ضعف دل، ضعف معدہ، اور ان سب پر ضعف طالع، کیونکہ قصد سفر
 کروں؟ تین چار شبانہ روز نفس میں لبر کروں، گنڈہ بھریں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے
 ایک ہفتہ دو ہفتہ بعد ناگاہ قویج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں حالت
 بیان میں نہیں، آتا میرا سورت تک کسی سورت حیزا مکان میں نہیں۔

۱۴ نصیر الدولہ حسین الملک حشرت جنگ نجل حسین خاں کے اجزائے خطاب تھے۔

اس سے پہلے بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ریل نہیں چارے روز میں سو رنٹ پہنچتی تھی۔
غالب کے لمحات نے اس کو یہ ایک نمایاں پہلو ہے کہ وہ کسی تفصیل کے عزم و ارادہ کے
بغیر مختلف ضروری وزارت کو ضمناً بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی پٹیشن کے لئے درخواست
و لایٹ بھیجنے کے ضمن میں یہ بیان کر گئے کہ بہار چھ ہفتے میں لندن پہنچتا ہے۔ اور
یہاں سورت تک ریل کے سفر کی مدت بتا گئے۔

انبارہ ارادہ | غالب کا دربار امیر اور خلعت جب سرکار انگریزی سے بحال ہوئے تو
لفٹنٹ گورنر پنجاب نے انہیں کہا تھا کہ گورنر جنرل انبارہ میں دربار کریں گے، وہاں
جا کر خلعت لے لیجئے۔ اگرچہ غالب نے اس وقت لفٹنٹ گورنر کو یہ جواب دیا تھا کہ
انبارہ کہاں جاؤں گا۔ لیکن بعد میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ بالآخر مختلف وجوہ
انہیں اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

ساتواں باب

پیشکش کا مقدمہ

بندہ را بودہ است از سرکار دست مزدِ مشقتِ اسلاف
 زہرِ سالانہ بر اے دوام وجہ شایستہ بقدر کفایت
 ملزم کردہ اند ہاں بہ دروغ حق من خوردہ اندہ ہیں بگزات
 آہ از اقربائے بے آزر م داد از حاکمان بے انصاف

خاندانی پیشکش کا مقدمہ غالب کی زندگی کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ خواجہ
 حالی نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ اتنا مجمل ہے کہ کوئی شخص اس
 سے غالب کے مطالبات کی صحیح کیفیت معلوم نہیں کر سکتا۔ اور جس جھگڑے
 میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا۔ جس کی وجہ سے ان کا دل مسلسل
 تیس برس تک گونا گوں توقعات کا مولد و مشہد بنا رہا۔ اس کی تفصیلات
 ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ معہذا اس قصیدہ کے متعلق غالب کی نظم و تشریح جا بجا اشارے

ملتے ہیں اور حیات تک اصل قضیہ کے پورے حالات معلوم نہ ہوں، نظم و نثر کے وہ حصے ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس لئے میں نے کوشش کی ہے کہ اس داستان کا ایک ایک پہلو واضح ہو جائے۔

خانہ دانی پشن کا آغاز ^{۱۸۵۷ء} میں غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہوا۔ وہ لارڈ لیکٹ کے ماتحت چار سو سوار کے برگیدہ تھے۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ ان کا ذاتی مشاہرہ تھا۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر تھی۔ ان کے انتقال پر جاگیر واپس لے لی گئی اور متعلقین کی پرورش کے لئے دس ہزار روپے سالانہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھڑ کے ذمے لگا دیئے گئے۔ نواب صاحب کو ^{۱۸۵۷ء} اور ^{۱۸۵۸ء} میں دو جاگیریں بہ طور استمرازی ملی تھیں۔ ایک فیروز پور جھڑ اور سانگرس کی جاگیر، دوسری پرگنہ پونا ہانا، بھجور اور نلگینہ کی جاگیر۔ اول الذکر کا معاوضہ پانچ ہزار اور آخر الذکر کا بیس ہزار روپے سالانہ تھا۔ یعنی دونوں جاگیروں کے سلسلے میں نواب صاحب پچیس ہزار روپے سالانہ سرکار انگریزی کو ادا کرنے کے ذمہ دار ٹھہرے تھے۔ ان جاگیروں کے باشندے بڑے سرکش اور ہنگامہ پسند تھے۔ اور خاص امتانات کے بنیر ان کو امن و قانون کا پابند رکھنا غیر ممکن تھا۔ اس وجہ سے لارڈ لیکٹ کو خیال ہو گیا کہ نواب کے ساتھ کسی قدر رعایت ہو جانی چاہیئے۔ اسی اشارہ میں نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ لارڈ لیکٹ نے بتاریخ ۱۸ مئی ^{۱۸۵۷ء} حکومت کی طرف سے ایک شفقہ نواب احمد بخش خاں کے نام اس مضمون کا بھجوا دیا۔ کہ جو پچیس ہزار روپے حکومت کو ادا کرنے ہیں۔ ان میں سے دس ہزار روپے سالانہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو دیتے رہیں۔ میرزا لے مرحوم

۱۸۵۷ء۔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰ آزاد مرحوم نے خدا جانے کس بنا پر ترہ سو روپے لکھا ہے (ملاحظہ ہو نواب جیانا)

کے رسالے کے جو پچاس سوار باقی رہ گئے تھے دان کا افسر خواجہ حاجی تھا، ان کو اپنے انتظام میں لے لیا اور قیام امن کے سلسلے میں حکومت سے کوئی امداد طلب کر لی۔ ان شرطوں پر پچیس ہزار روپے کی رقم معاف ہو جائے گی۔ اور جائیداد مستفلاً نواب صاحب اور ان کے وارثوں کے پاس رہے گی۔ یہ ششہ حکومت کا دستور کردہ تھا۔ اور اس کا مسودہ دفتر میں موجود تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ راجن ششہ کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ الگتھام سے ایک درخواست حاصل کر لیا۔ جس کا مقصود یہ تھا کہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ دیئے جائیں اور ان متعلقین میں خواجہ حاجی کو بھی شامل کر دیا گیا۔ پانچ ہزار کی تقسیم کا نقشہ یہ تھا

خواجہ حاجی رسالدار دو ہزار روپے سالانہ

والدہ و مشیرگان نصر اللہ بیگ پندرہ سو روپے سالانہ

میرزا نوشہ (غالب) اور میرزا یوسف
برادر زادگان نصر اللہ بیگ خاں پندرہ سو روپے سالانہ

سلسلہ کہا جاتا ہے کہ خواجہ حاجی اور غالب کا سلسلہ نسبت اور پر جا کر مل جاتا ہے۔ خواجہ حاجی کی شادی بیوی بیگ کیسہ دان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اور بیوی بیگ کا راجہ کبریا بیگ غالب کی مشیرہ سے بیاہا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ تین خاندانوں میں رشتوں کے رد و بدلے اور پر جا کر نسب کے اتصاں کی بنا پر خواجہ حاجی غالب یا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے رشتہ دار ہیں۔ انہیں نہیں ہو سکتا تھا تاہم اسے نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین میں شمار کیا گیا۔ جن کی بدولت ان کے بڑے خدات مرحوم غروزی قرار پائی۔ اس طرح غالب کی خاندانی پشت پہلے دس ہزار روپے کم ہو کر پانچ ہزار بنی۔ پھر اس میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کی مقرر ہوئے۔ بقیہ تین ہزار میں سے نصف ان کے رشتہ داروں اور ان کے بھائی کو

جھگڑے کی ابتدا کیوں کر ہوئی | غالب ۱۸۵۷ء میں صرف نو برس کے تھے۔ جو کچھ ملتا رہا اس پر قانع رہے۔ جب ہوش منبھالا تو معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی جائیداد کو بیچ بیچ کر گزار کرتے رہے۔ نیز نانا کی طرف سے ان کو کاتی امداد ملتی ہوگی۔ وہی چلے آئے۔ تو بعض تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ بھی انہیں وقتاً فوقتاً روپیہ مل جاتا تھا۔ نیز نواب احمد بخش خاں مقررہ وظیفہ کے علاوہ ان کو کچھ نہ کچھ دیتے ہوتے تھے۔ نواب موصوف نے خانہ نشینی اختیار کر لی اور نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھر کے رئیس بنے تو اس وقت مقررہ وظیفہ کے سوا کوئی ذریعہ معاش باقی نہ رہا بلکہ نواب امیر الدین احمد خاں مرحوم کے بیان کے مطابق شمس الدین احمد خاں نے یہ وظیفہ بھی بند کر دیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ غالب کی بیگم کو تیس روپے ماہانہ کا جو وظیفہ نواب احمد بخش خاں کے زمانے سے ملتا تھا۔ وہ بھی بند ہو گیا۔ اس حالت میں غالب کو اپنی خاندانی پنشن کے لئے قانونی

سلسلے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شمس الدین احمد خاں اور لوہارو خاندان کے دوسرے افراد میں شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ غالب بھی اپنی بیگم اور دوسرے رشتہ داروں کی وجہ سے اس کی پسیٹ میں آ گئے ہوں گے۔ شمس الدین احمد خاں کو جب ریاست مل گئی۔ تو انتقاماً اپنے تمام مخالفوں کے ساتھ یہ سلوک کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اس سلسلے میں غالب کے بچے رہتے کی کوئی صورت نہ تھی۔ عرض شمس الدین احمد خاں کے ساتھ غالب کے تعلقات اس طرح بگڑے کہ پیران کی درستی نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ نواب کو پھانسی مل گئی۔ در فیروز پور جھر کے کی ریاست ہمیشہ کے لئے چھین گئی۔

چارہ جوٹی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں پانچ ہزار روپے کے اس شقہ کا غالباً کوئی علم نہ تھا۔ جو ثواب احمد بخش خاں نے ۱۸۰۶ء کو لاہور ڈپٹیک سے حاصل کیا تھا۔ بلکہ سمجھ رہے تھے کہ ہر مٹی شقہ کے شقہ کے مطابق دس ہزار روپے سالانہ کی جو پنشن مقرر ہوئی تھی۔ وہی ملتی چاہیئے۔ اس میں سے ان کو اور دوسرے اہل خاندان کو صرف تین ہزار روپے ملتے رہے تھے۔ خواجہ حاجی چونکہ نصر اللہ بیگ خاں کے حقیقی متعلقین میں شامل نہ تھا۔ اس لئے اس کے دو ہزار روپے کو بھی وہ اپنی خاندانی پنشن میں شامل نہیں کرتے تھے۔ غرض غالب کے مطالبات یہ تھے کہ اول دس ہزار کی پوری پنشن بچاں ہو جائے، دوم اس میں سے جتنی رقم نہیں ملی۔ وہ مٹی شقہ سے گن کر یک مشت ادا کی جائے۔

حیدر آباد کا ہیڈ کوارٹر اس زمانہ میں غالب کی مالی حالت بہت مستقیم تھی۔ وہ اپنی آزاد مشربوں میں کافی رہا۔ پیسہ اڑا چکے تھے۔ بہت سا روپیہ قرض لے چکے تھے۔ ایک طرف قرضہ زواہ تنگ کر رہے تھے، دوسری طرف بھائی دیوانگی کے عارضہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ خود فرماتے ہیں :-

آغاز رو بہ ہلی کہ در کو با، ہ غفلتے بہ تمت داشتہ تھے از عمر بہ پیوند جاہدہ کارانی ہوس گزشت

سلسلہ مائیکر مہ صاحب مصنف ذیل غالب کہتے ہیں کہ شقہ میں خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کا ذیقتاس کے میٹھوں خواجہ جان اور خواجہ امان پر منتقل ہو گیا۔ غالب نے اس پر بھی اعتراض کیا۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ یہ امر بھی پنشن کے لئے قانونی چارہ جوئی کا محرک بنا۔ لیکن آگے چل کر خواجہ جاہد اور خواجہ امان کی تھ خویشی کے روابط از سر نو مستوار ہوئے۔ چنانچہ جب خواجہ امان نے بومستان خیال کا ترک کیا تو غالب نے اس کا دیباچہ لکھا اور کتاب کی شاعت میں سعی فرماتے رہے۔

و بے راہہ خرامیدہ شد تا سراز مرستی بگریید و اندراں بخودی پائے مصطفیٰ پیائے بنگوے فردر
 ہنگامہ دیوانگی برادر یک طرف و غوغائے دام خواہاں یک سویا آشوبے پدید آمد کہ
 نفس راہ لب و نگاہ روز نہ چشم فراموش کرد۔ پایے از سخن دوختہ و چشمے از خویش
 فرو بستہ جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خشکی با خود گرفتہ و از بیدار روزگار نالوں و سینہ بروم
 تیغ مالوں بہ کلکتہ رسیدم۔

نواب کے ساتھ فیصلہ کی کوشش | معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ جانے سے قبل دہلی کے مختلف
 دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ خود نواب سے مل کر فیصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ
 اس غرض سے فیروز پور چھڑک گئے۔ علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :

یک چند بہ امید نواب صاحب مآختم و از تاب آتش انتظار گداختہ شستم ام بہ عذاب کہ
 مجرم بہ زنداں نشیند و مے بینم آنچه کافر بہ جہنم بیند۔ بہ فیروز پور از بہراں زیادہ بودم کہ باز م
 بہ دہلی باید آمد۔ نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریقند۔ . . . تا کجا شکیب در زم و خود را
 بہ ایچ شادمان دارم۔ از در و دیوار شاہ جہان آباد بلا مے بار۔ . . . میرا امام علی بہ اعراف و شد
 بہ خدمت نواب صاحب فرستادہ ام۔ ز بہار با من زمانہ سازی و از نواب محابا مکنید، و چنان کنید کہ چون
 عرضداشتن خواندہ شود شاہم در ان انجمن باشید تا تکارش را بہ گزارش نیرو۔ . . .
 بہاران مے گفتند کہ تو بہ نواب نئے گرائی و در دہل با مے نئے گوئی و نہ از کجا کہ نواب
 بہ چارہ بر نہ خیزد۔ اینہا کہ مے کنم از بہر زباں بندی ہیں، و انانہ سنا سان
 است خدا را طرح آں انگنید کہ میرا امام علی زود برگرد و بہ من پیوند فدا و دستان ناصح را
 خیر باد گویم و بہ سرور برگے کہ نہ دارم بہ شرق (کلکتہ) پویم۔

کلکتہ میں کوشش | بہ ہر حال غالب کلکتہ پہنچے۔ نواب اکبر علی خان سے ملنے کے لئے

ہنگلی گئے۔ جن کے نام مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے ایک سفارشی خط دیا تھا۔ اس کے بعد سیمین فریڈ سے ملے جو اس زمانے میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی میں اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدے پر مامور تھے۔ فرماتے ہیں :-

میں فریڈ اسسٹنٹ سکرٹری راہ یافتہ ملاقات شایستہ روداد و استقبال و مشایعت و معافہ و عطاے عطر و پان بہ میاں آمد۔ ہر ملاقات میں ستودہ خوش خوسند و توانا دلم کردہ عرضداشت

گورنر جنرل بہادر چٹا نگر رسم اس داد گاہ است بہ صاحب سکرٹری بہادر ہر وہ اند و ہم دریں صحبت۔ صاحب سکرٹری بہادر آں بابا پٹن صاحب سپرد آں بہ انگریزی نقل کند۔

اس تحریر سے یہ بھی واضح ہے کہ شہزادہ میں انگریز افسر معزز ہندوستانیوں سے کس طریق پر ملتے تھے۔ جب وہ ملنے کے لئے آتے۔ تو افسران کا استقبال کرتے۔ بغل گیر ہوتے۔ عطر اور پان دیتے۔ اور رخصت کے وقت چند قدم چھوڑنے کیلئے ساتھ جاتے۔

چیف سکرٹری سے ملاقات | اینڈریو اسٹرلنگ دفتر فارسی کے سیکرٹری اور پولیٹیکل ڈی پارٹمنٹ کے ڈپٹی سکرٹری رہ چکے تھے۔ مقدمہ پیش ہونے کے زمانے میں وہ چیف سکرٹری تھے۔ غالب نے ان سے بھی ملاقات کی۔ وہ بڑے اچھے فارسی دان اور غالب کے بیان کے مطابق سخن فہم تھے۔ بڑے حس اخلاق سے ملے۔ ان کی مدد میں غالب نے بیچپن شعر کا ایک فارسی قصیدہ کہا تھا۔ جس کا ایک حصہ سنایا۔ صاحب بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ پوری امداد فرمائیں گے۔ غالب لکھتے ہیں :

۱۵ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۷ ویسٹ فریڈ کے بھائی تھے۔ ۱۸۵۳ء میں دہلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کو غدر کے آغاز پر مارے گئے۔ ۱۸۵۳ء ڈکشنری آف انڈیا کی باپو گرانی صفحہ ۴۰۵۔

۱۶ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۷

اندروا سترنگ کہ قوس عروجی کو نسل رانقہ بدایت و قوس نزولی آں رانقہ نہایت است۔
 جوں سراپا یہ علم و آگہی دارد و سخن راے فہم و بہ لطف سخن و لے رسد در مدح وے قصیدہ شتعلبر
 پنجاہ و پنج بیت انشا کردم و در آخر قصیدہ نختے از حال خویشش نکاشتم از حسن اتفاق نہ یہی
 کہ ملازمتش بہ روش گزیدہ و ایں معنی پسندیدہ بہم داد۔ اعتبار خاکسار یہاے من افرود و
 عیار اُبید و اریہاے من کامل برآمد۔ پارہ از قصیدہ بر خواندم، محفوظ شد، دلجو بہا کرد و
 وعدہ یارگیری داد۔

غالب نے اس قصیدہ میں اپنے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ انہی کی زبان سے سن لیجئے :-
 من شکستہ دل بے نواے ہیچ مداں چگونہ دم ز دم از دعوی ثنا خوانی
 گدایم و بہ تناسے داد آمدہ ام یہ در گہے کہ بود قیصر شش بدربانی
 و نایام چہ محابا کہ معدلت کیشی ز گدیہ ام چہ خجالت کہ از کریانی
 نہ ملک خیمہ ہم نے مال، ایں قدر خواہم کہ گرد غم ز سحر بخت من بہ فشانانی
 مراد لیست ز درد شکستگی لبریز نہ آرزوے امیری، نہ حسرت خالی
 ز بہت سال فزوں میشود کہے سوز نفس چو رشتہ شمع ہم یہ بزم حیرانی
 کجاست جیب کہ چاکے درد تو انم زد مگر بگر یہ دریدن و ہم ز عسریانی
 ز اہل دہر دریں روزگار بے دردی بہ عید عشرت خویشم نمودہ قریانی
 سیاہ مست نہ دارد ز کس محاباے شمرودہ خون دلم را ر حیق ریحانی
 شرر بہ پیرین جاں فشاند، جانگذاشت کہ شعلہ ہر کشد از داغہاے پنہانی
 چنان بہ حلقہ دام کشید تنگ کہ من بہ بند عجز فرو ماندم از پہ افشانی
 غریب نیست بہ درد دلم رسیدن با نہ مدعی عربی و نہ من خراسانی

یہ داد گاہ رسیدم چنانکہ دانستم
 بہ رس یہ داد غریباں چنانکہ مے دانی

کونسل کا طریق کار | اس زمانے میں دستور تھا کہ جب دو تین مقدمے کو نسل میں پیش ہونے کے لئے جمع ہو جاتے تو اس سٹنٹ سکریٹری وادخواہوں کے نام اور مقدمات کے حالات چیف سکریٹری کے روبرو پیش کر دیتا۔ وہ ہر مقدمے کے حالات خود دیکھتا۔ ان پر غور کرتا اور جن مقدمات کو کونسل میں پیش کرنا مناسب سمجھتا، صرف انہیں رکھ لیتا، باقی واپس ہو جاتے۔ غالب یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں،
بارے بہ ہوس شاد نامہ کہ واد نامہ من پذیر فنی دیہ کونسل گزشتی سنجیدہ شد تادران انجمن چہ
روسے دمد و فرماں فرمانداں و بارہ من چہ باشد۔

دہلی میں مقدمہ پیش کرنے کا حکم | عرضداشت کونسل میں پیش ہوئی تو اس پر حکم صادر ہوا کہ ضابطہ کے مطابق یہ معاملہ سب سے پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس پیش ہونا چاہیے غالب نے غدر پیش کیا کہ میرے پاس اتنا ساز و سامان اور تاب و توان نہیں کہ کلکتہ سے دہلی جاؤں اور وہاں سے دوبارہ چارہ خواہی کے لئے کلکتہ آؤں۔ اس پر کونسل نے حکم دیا کہ خود یہاں انتظار کرو اور وکیل کے ذریعہ سے دہلی میں مقدمہ پیش کراؤ۔ غالب لکھتے ہیں،

عرضداشت کونسل گزشت و فرماں صدر سٹنٹ کہ ضابطہ مقضیٰ آن است کہ نخست زمزمہ تنظیم
بر گوش ریزیڈنٹ دہلی رسیدہ آید گنم کہ سرور برب و تاب و توان محاد و تم نہ ست۔ فرمان یافتہ
کہ خود ایں جا باشد و دکا نہ بر ریزیڈنسی دہلی گراید۔

اس پر غالب نے کلکتہ سے اپنے ایک دوست کو لکھ کر ایک وکیل کے ذریعہ سے دہلی ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرایا اور تمام ضروری کاغذات بھی وکیل کے پاس بھیج دیئے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس شخص نے دکالت کی اور کون سے دوست

نے یہ کام اپنے ذمے لیا۔ رائے پھل کے نام کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کو وکیل بنانے کے خواہاں تھے۔ ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ لالہ ہیرالال ان کے وکیل تھے۔

پیشی میں تعویق | مقدمہ تیار ہو چکا تھا لیکن ابھی پیش نہیں ہوا تھا کہ ایڈورڈ کول بروک ریزیڈنٹ دہلی دورے پر روانہ ہو گئے۔ اس وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ غالب لکھتے ہیں :
کاغذ فرستادہ من رسیدہ است کار فرمائاں را ہر میرفت۔ وکالت نامہ لوکیل دادہ ہنوز وکالتش از قوۃ بہ عمل نیامدہ بود کہ روشن اددہ سر ایڈورڈ کول بروک فرمانروا سے دہلی پہنچا و دورہ بال نہضت کشادہ ہر آئینہ انتظار بارگرددیدہ شیش پیش و اس درنگ کہ بلے خوش دست در بیان آمد بجائے خویش است۔

ادھر کلکتہ میں ولیم ہیل رکن اعظم کونسل برما چلے گئے۔ لارڈ ہنسنگ گورنر جنرل شکار کے لئے مالہ روانہ ہو گئے۔ مولوی عبدالکریم صاحب میسرشی دفتر سی آٹھ مہینے کی رحمت لے کر اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے تھے۔

انگریز کونسل کی سفارش | غالب نے ایک فرد جی افسر کرنل ہنری املاک سے سر ایڈورڈ کول بروک کے نام ایک سفارشی خط لکھوا دیا تھا۔ نیز نواب اکبر علی خاں متولی امام باڑہ ہو گئی سے ایک خط منشی التفات حسین خاں کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ جو غالباً ریزیڈنسی کے میسرشی تھے۔ یہ خط لالہ ہیرالال وکیل کو بھجوا دیا گیا۔ علی بخش خاں رنجور کو یہ نام حالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :

وقت ست کہ رپورٹ مقدمہ من از حکم ریزیڈنسی دہلی بالی ردائی کشایدہ لاہرمہ شمارا باید۔

۱۔ کلیات شرفارسی صفحہ ۱۵۹

۲۔ کلیات شرفارسی صفحہ ۱۶۹

۳۔ سر ایڈورڈ کول بروک ۸۲۷ء سے ۸۳۹ء تک دہلی میں ریزیڈنٹ تھے۔

در مستی استغاثت حسین سرشته گشتودا کردن در نوبت رخسار که فقر یا ذکر سفارش مامور گریل
بهنری ملک بسیار در میان آورد تا گل بد ما شادمانی پذیرد و در تن به لطیف
در صمیم حاکم تار گره کرد.

معلوم ہوتا ہے کہ لرنیل ہنری ایلک کی سفارش پر سرایڈور ڈکول بروک
نے رپورٹ اور پتہ چھٹی دور دیا۔ اسے اچھا جواب حاصل ہوا تھا۔ لیکن جواب
ابھی دیا نہیں پہنچا تھا کہ صاحب موصوفہ دفعہ عدالت سے الگ کر دیئے
گئے اور ان کی جگہ فرانسس ہائنس ریڈیڈنٹ مقرر ہوئے۔ بن کے ساتھ دلی فیروزپور
چھر کے لئے دوستانہ روابط پیدا کر لئے۔ ہائنس نے کول بروک کی رپورٹ کو نظر انداز کر کے
غائب کے غائبانہ کے خلاف رپورٹ لکھ دی۔

کون بود که به نو صد که بیار بمنوی درک بر من مهر من شود و در دست که خوشه بر من نتوان بدستید
به صد در فرزند و جوابی که سودمند تر از آن است سنجید از نهد در جانش مایه بسو آن خوب و در راه
مانند که گول بود که در گرد و باغش گمان که گول بود که از نسیب و نسیب به چهره آن چنانکه
است که در نسیب مایه و به هر یک به صد و به صد و

میں نے سب سے پہلے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ
کمرہ خیل بہ ہی اعلیٰ سے فرائس پائس کے نام پر ہے۔ یہاں بھی خیل بہ ہی
کے بیکین کمرہ خیل صاحب بیمار ہو گئے اور اسی بیمار ہی میں وفات پا گئے۔

میرزا بواسطہ سم خاں و عدد داوند کہ پیر کہیل ہنیری اداک را فرج ہر رجور ہوا و حبس نزد
مپارتن نامہ از دست بنام پاکنس صاحب بہ گفت : آندو بہ من رسانند ہمہ دریں دروز
یکے از سزگان فرما کہ من گفت کہ کہ نیل ہسری اداک نہ جہاں رفت و آئے بر در گار ۔

۱۰۰ سراپد و رڈ کول بروک کے بعد چھ مہینے و لیم فیر پر ریڈنڈنٹ رہے بعد ازاں تو سیرسٹ
نک یا کنس کو یہ حمد ہی نسل دیا۔

من کہ دریں دیار بے فرمانروا سر بر سنگ سے زخم و جال بہ ناکامی سے دہم عدو جاہ مند و مالدار
و من تہی دست و تنہا۔

فرانسس ہاکنس کی مخالف رپورٹ تیار ہونے سے پیشتر غالب کلکتہ سے
واپس آچکے تھے۔ وہاں کم و بیش دو ہر س ٹھہرے رہے۔ اس دوران میں چونکہ
دہلی ریزیڈنسی سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ولیم ہنٹنگ گورنر جنرل دورے پر
دہلی کی طرف آئے والے تھے۔ اس لئے غالب بھی چلے آئے۔ تاکہ ریزیڈنسی سے
رپورٹ پیش کر کے گورنر جنرل کے دورے ہی میں اپنے مقدمہ کا فیصلہ
کرا لیں۔

ریزیڈنٹ سے بے پروائی | ریزیڈنسی کے دفتر میں جو لوگ غالب کے ہمدرد تھے اور
فرانسس ہاکنس کی رپورٹ کے باز سے آگاہ تھے وہ ہر چند متنبہ کرتے رہے کہ
ابھی وقت ہے، چارہ کر لیجئے، ہاکنس سے مل کر اپنے حالات خود سناد دیجئے۔ لیکن
غالب کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ چیف سکریٹری
سکریٹ ہندداد کا حتمی وعدہ کر چکے ہیں۔ اس لئے ریزیڈنٹ کی رپورٹ اگر خلاف
بھی ہو تو پروا نہیں۔

مسٹر اسٹرلنگ کا اتفاق | لیکن سو اتفاق دیکھئے کہ ادھر ریزیڈنسی میں غالب کے خلاف
رپورٹ تیار ہوئی، ادھر کلکتہ میں اینڈریو اسٹرلنگ کا انتقال ہو گیا اور غالب کی یہ
امید گاہ بھی منہدم ہو گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

فرماندہ اس خراب آباد کہ فرانسس ہاکنس بہادر ش نامند بادی فیروز پور پیمسان
یک دنی بست۔ رپورٹ چنانکہ خواست بہ صدر فرستاد۔ ہر جہہ ہر دہہ وراں در پردہ
بارم دادند۔ دلتہ ازاں راز بہ من باز گفتند مراد دل ارجاے نہ رفت، گفتہ اسٹرلنگ حق پرست
و حق شناس کسے است کہ ہر رشتہ ہر کار بہ دست، دست، ہر چارہ گری خواہد نشست

قضاہ میں خدیوہ طرح آل انگلند کہ پیش از انکہ رپورٹ بہ صدر رسید امید گاہ مرا اجل
فرور رسید و ششم جہاں بنیش فرد بستہ شد۔

پھر فرماتے ہیں :

حیرتے دانستم کہ بہ مرگ ما گاہ در گزشتش میر جوان دولت و جوں سال جینی مسٹر اندر و اسٹرننگ
ستودہ خصل بر اسے حبیب و کار پردازن تھا ازین سانکہ سترگ کردم نتیجہ منظور دارمند ؟
حالیا جان شد کہ بہ میلاد فنا و دن بناؤ امید ری غالب رمیدہ نجات مے خواستند۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :

مسٹر اندر و اسٹرننگ مرد و از گیتی تر نام نیکو ماحود نہ برد اکنوں امید
غمواری ز کے بایدم داشت دل را بہ خیال گردش چشمہ کے تسکین باید مرداد۔ رپورٹ
کہ فرانسس پاکنس بہادر در خصوص داود خواہی مس بہ صدر فرستادہ است چہ گویم کہ
چہ مایہ بہد گاہ و اندرہ فزا وداست۔ تکیہ بر کار سازی ہاں چاہک خرم میداے فنا و دانستم
کہ ز شش شونک بہ کام دشمن است۔

فرانسس پاکنس کی رپورٹ اینڈ ریو اسٹرننگ کے انتقال سے صرف
انیس روز قبل یعنی ۱۶ مئی سنہ ۱۸۳۳ء کو دہلی سے روانہ ہوئی تھی۔

بروز پہارہ بدشتی کہ ہمارے شنبہ بود۔ باز ہم فدی قعدہ مطابق داشت، رپورٹ مقدم
من اریں دادریکا بہ صدر رواں شد جسے چہ رپورٹ و کو مقدمہ رپورٹے ہوں مے
رنگیں شہ اندر ہم رپورٹے ہوں حال دل بستگان در ہم۔ رپورٹے فتو اسے خون یک جہاں
آزد و رپورٹے فرماں رہم ہاں رود۔

پاکنس کی رپورٹ کے متعلق ایک قطعہ بھی لکھا ہے :

ایا ستم زدہ غالب ز پاکنس مسکاں منہ بہ سینہ بے کینہ از شکایت داغ
اگر بہ صدر خلاف تو کردہ است رپورٹ وگر ہضم بہ قتل تو بستہ است جہاں

قضا ہند خرابی فکند و ہم زخست ندیدہ کہ بدل عکس غالب است بلاغ

گردش روزگار کی بے دردی اب آپ غالب کی پریشاں حالیوں اور در ماندگیوں پر غور فرمائیں۔ دل و دماغ حد درجہ نازک زندگی کی سب سے بڑی متاع ذکاوت حس، حساسیت کا مجموعہ رفاقتوں کی بے چارگی اس الم زار میں کیا گزرتی ہوگی۔ دہلی سے لے کر کلکتہ تک انہوں نے کئی جوتی کے لئے تدبیروں کا جوہاں بچایا تھا اس لئے تمام حلقے یکے بعد دیگرے ٹوٹتے گئے۔ انہیں اپنے مطالبات کی قوت نہ رہی۔ اعتماد تھا اگر اعتماد نہ ہوتا تو کلکتہ تک کا سفر کیوں گوارا کرتے۔ وہ بیٹھتے تھے کہ صدر دفتر والے ہمدردی کو دیکھتے ہی فیصلہ ان کے حق میں صادر کر دیں گے۔ اس ضمن میں انہیں دفتری کاروبار کے آئینی مراحل معنوم کرنے کا بھی خیال نہ آیا۔ کلکتہ پہنچ کر حیب یہ کٹا کہ دہلی ریزیڈنسی سے رپورٹ حاصل کئے بغیر صدر دفتر میں کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ تو انہوں نے کلکتہ میں بیٹھ بیٹھے وکیل کے ذریعہ سے اس فرو گذاشت کی تلاقی کرنے کی کوشش کی۔ ریزیڈنٹ اور اس کے میرٹھی کے پاس سفارش پہنچائی۔ اپنے حق میں رپورٹ لکھوائی۔ ایسٹ و فیسٹ یہ تدبیر بھی درہم برہم ہو گئی۔ پہلے ریزیڈنٹ عاجز ہو گیا اور دوسرے ریزیڈنٹ نے والی فیروزہ کے ساتھ ذاتی تعلقات کی بناء پر مداف رپورٹ لکھ دی۔ اس کے پاس سفارش پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن جس شخص سے سفارش حاصل کی جا سکتی تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ تدبیر کی یہ کڑی ٹوٹ گئی تو غالب اینڈ ریواسٹر لنک کے وعدے پر مجبور ہوئے۔ لیکن دہلی سے مخالف رپورٹ کلکتہ پہنچنے تک اینڈ ریواسٹر لنک کی حیات مستعار کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

غالب اگر کہتے ہیں کہ کارگاہ قضا و قدر میں یہ ساری آفتیں اس غرض سے ڈھلیں کہ مجھے پنشن کا جو رادہ پیہ نہ مل سکے تو ایک حقیقی شاعر کے لئے ان حالات کی تعبیر کا عام اسلوب اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی نواریز نول میں درد و یاس کی بے بلا شبہ بہت ابھری ہوئی نظر

آتی ہے۔ اس کا سرچشمہ تلاش کرنا ہو تو ان کی زندگی کے المناحہ پر ایک سرسری نگاہ ڈال
 لینی چاہیئے۔ ایسے ہی احوال و ظروف نے ان سے کہلوایا کہ :

نومیدی ماگروش ایام نہ دارد

روز سے کہ سید شہ سحر و شام نہ درو

نئے چیف سکریٹری کے اینڈریو سٹرٹنگ کی جگہ جارج سوئٹن چیف سکریٹری مقرر ہوئے غالب نے
 ماس کو کشش اور گے کے سفارش پہنچانے کیلئے مولوی سراج الدین سے کہو کہ :

خدا اگر جارج سوئٹن مہربان ہو تو وہ غلام رحمتی ہو گا۔ کام دل رسیدن میں آسان است

اگر کار خود کار شامے وانسمہ چاکوہ میں نہ سترگ در میان سے نہادہ

اس باب میں غالب کو رازداری کا بھی بہت خیال تھا۔ مولوی سراج الدین نے
 کہ جارج سوئٹن تک سفارش پہنچانے کی تحریک کے بعد لکھتے ہیں :

ہر نامہ زمیں سے رسیدہ باشد۔ بعد خاندان وہ مولانا نمودن سے در پادہ دست افش

افگندہ باشد۔

پہلے شمس کام [یعنی تھوڑی مدت کے بعد جارج سوئٹن صاحب لائٹ چلے گئے

غالب ایک خط میں اپنی ناکامی کے داستان در بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

سبحان اللہ! ضرور نہ گرد و مگر کول بردک ہر گ ناگاہ ہر گ سٹرٹنگ ہویت نہ ہو۔

مگر جارج سوئٹن۔ در خور صد سے ہاں کاہ بناسد مگر اسد اللہ داد خواہ کنوں مصلحت دین

مے بینم کہ میں داوری قلع نظر فرمایند و کانت نامہ میں کہ نزد منشی نصر اللہ صاحب دست

بار سناں داند ہم درند و بگز نہ۔ اللہ س ما سوا ہوس ۔

یہ غالب کے مقدمہ کلکتہ کے وہ حالات ہیں جو ان کے مکاتیب یا خزینہ میں

دعوے کی بناء ان کے مطالبے کی بناء ہم منی مسئلہ والا سرکاری شفق تھا جو لارڈ

لیکٹ کی شہرہ کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے

باب میں نواب احمد بخش خاں کے نام جاری ہوا تھا۔ اس کے روستے غالب اور ان کے اقربا کو دس ہزار روپے سالانہ ملنے چاہئیں تھے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم لارڈ لیک کے، جون سنہ ۱۸۶۶ء والے شتے پر عمل پیرا تھے جس کے مطابق ان پر صرف پانچ ہزار روپے سالانہ واجب تھے اور اس رقم میں بھی دو ہزار کا حقدار خواجہ حاجی تھا۔ غالب آخری شتے کو جعلی سمجھتے تھے، اور اس حقیقت میں شبہ نہیں کہ اس کا کوئی مسودہ یا نشان سرکاری ریکارڈوں میں موجود نہ تھا۔ علاوہ بریں یہ حکومت کی منظوری سے شائع نہیں ہوا تھا کہ اُسے ۱۸۶۶ء والے شتے کا نسخہ تسلیم کیا جاتا۔

خواجہ حاجی کا بیان | خواجہ حاجی مرحوم فرماتے ہیں،

اسٹرنٹ صاحب سکریٹری گورنمنٹ ہونے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق ضرور

تم کو ملے گا کول بروک صاحب جو اس وقت آئی میں ریزیدنٹ تھے انہوں نے دئی ہی میں

میرزا غالب سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا، امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دہریں

کلکتہ میں رہے مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہو گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی

سے حوالہ ڈیل کے سکریٹری روایت کیا، اور انہیں کے روبرو جاکیراں اور پٹنوں

کی سندیں، گورنر کو مل گئیں، مرزا کے مددگار کی مات استسار کیا، انہوں نے مرزا کے

دعوے کو ملت بنایا، اور جس قدر پیسے فیور پور سے منی قرار دی گئی تھی، اس کی منسل کبیٹ

جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی، گورنمنٹ اس میں دبی۔

یہ بالکل درست ہے کہ اینڈریو اسٹرنٹ نے کلکتہ میں غالب کی امداد کا وعدہ

کیا تھا لیکن یہ صحیح نہیں کہ کول بروک نے ان کے کلکتہ جانے سے پہلے مفید رپورٹ کا وعدہ کر لیا

تھا۔ میرزا غالب ہے کہ غالب جب کلکتہ روانہ ہوئے تو اس وقت کول بروک ریزیدنٹ ہی نہیں

بنے تھے تو پھر میرزا پر پیش کی جا چکی ہیں۔ ان سے صداقت ظاہر ہے کہ کلکتہ میں مقدمہ

دائر کرتے تک انہیں یہ خیال ہی نہیں تھا کہ ضابطہ کے مطابق مقدمہ پہلے ریزیڈنسی میں پیش ہونا چاہیئے، ورنہ وہ کلکتہ میں بیٹھ کر وکیل کے ذریعہ سے ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرانے کے بجائے خود دہلی میں اس کا فیصلہ کر کے کلکتہ جاتے۔ سب سے آخر میں یہ کہ اگر کوئل بروک ان سے امداد کا وعدہ کر چکے تھے، تو کلکتہ سے کرنل ہنری مٹلاک کا سفارتش نامہ کیوں بھیج دیا جاتا۔ نیز نواب اکبر علی خاں طباطبائی سے منشی التفات حسین کے نام خط کیوں لکھوایا جاتا؟

سرجان میلکم نے کیا کہا تھا؟ | خواجہ عالی فرماتے ہیں کہ اصل معاملے کے متعلق سرجان میلکم سے استفسار کیا گیا تھا۔ لیکن دہلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈوں میں غالب کی نیشن کے متعلق جو کاغذات ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ۱۸ جون ۱۸۵۷ء والا تشدد اس غرض سے سرجان میلکم کے پاس بھیجا گیا تھا کہ اس کی مہر اور دستخط دیکھ کر بتائیں کہ واقعی لارڈ لیک کا ہے یا جعلی ہے؛ سرجان کا جواب یہ تھا کہ مہر اور دستخط واقعی لارڈ لیک کے ہیں۔ غالب کے دعوے کے متعلق نہ ان سے کچھ پوچھا گیا، اور نہ انہوں نے موافق یا مخالف کوئی بات کہی۔ غالب اس بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

فرماندہ دہلی وکیل مرزا بان بیوات (نواب شمس الدین احمد خاں) رازد خود خواندہ کا غدارانہ دے ہوئے بازو دو گفت کہ جعلی است۔ مہر و دستخط اس کا غدارانہ نہ شدہ و سرجان میلکم بہادر اس را بہ دیدہ وری پذیرفت۔ اکثریوں مرا گریہ چند بہ سررشتہ خیال افتاد، یکے از دیگرے سخت تر و محکم تر نہ سخت اینکہ سرجان میلکم چنانکہ نامہ فارسی بے نام و نشان اب اور دست رپورٹ انگریزی را کہ جگر گوشہ دفتر سرکاری است نیز غلط دانودہ است یا نہ؟ دوم اینکہ ہر گاہ اس خط فارسی نے تو اند کہ رپورٹ انگریزی انا نسخ اقتد بہین و دی چرا باز آمد، بایستے کہ مقابلہ اس

ہر دو تحریر یہ بیان آمدے تاکار یک سو شد۔ سوم اس کہ ہر گاہ خط فارسی بعد غایبہ کہ اس نقش تازہ بر
روسے کار آوردہ اوست باز داند بہ مدعی چراند گفتند کہ ز رندرجاں ایام بستد و دیگر نباید خروشد۔

غالب کا دعویٰ مسترد ہو گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار والا شفقہ والی فیروز پور
جہر کہ نے مقدمہ کے آغاز میں نہیں۔ بلکہ آخری دور میں پیش کیا تھا۔ جارج سونٹن کے
ایک خط سے جو ریزیلٹسی کے پرنے ریکارڈوں میں موجود ہے ظاہر ہوتا ہے کہ سر جان میلکم
کی تصدیق کے بعد غالب پانچ ہزار والے شفقہ کی صحت کے متکر نہیں ہے۔ تاہم ان کی
رائے یہ تھی کہ اس شفقہ سے حکومت کے منظورہ شفقہ کی تیغ نہیں ہو سکتی۔ لیکن پانچ ہزار
والا شفقہ ہی صحیح سمجھا گیا اور غالب کا دعویٰ مسترد ہو گیا۔ اس سے ان کے حساس قلب
پر جو اثر پڑا۔ اس کا اندازہ ذیل کے الفاظ سے ہو سکتا ہے :-

کار من بہ داد گاہ و ہل چنانکہ دانستہ باشد تبای گزیبہ عالیا براس سرم کہ اگر مرگ امان وہ باز ہاں
در (کلکتہ) رسم و در دل ہاں زمرہ فروریزم کہ مرغان ہو او ماہیان دریا را بر خود بگنایم ہیہا اگر
معاش من ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار کہ سادہ لو جان رامیت
آثار گویند ثابت شدہ بود بایستہ کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش ،
آپجہ تو بازیانت و انمودہ یا فتنی زان فزوں تر نیست۔ قرار داد نیز ہمان است لاجرم دیوارہ بوڑے
اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک تیلکہ کو خلیشاں و برادران من اند بہ ستیزہ بر خاستے وہ باطل
سیری نام برد آوردے۔

گورنر جنرل کے پاس اپیل لیکن غالب اس پر خاموش نہیں ہے۔ انہوں نے پھر براہ راست گورنر
جنرل کے پاس اپیل کر دی۔ اس کوشش میں دوبارہ کلکتہ جانے کے آرزو مند تھے لیکن
زاد راہ کا سرو سامان نہ تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے شاہ اودھ کی مدح میں ایک
۱۷ یعنی دو ہزار اخراجہ حاجی کو با اس کے خاندان کو بقیہ تین ہزار میں سے پندرہ سو غالب کی وادی اور
پھر پھیوں کو اور پندرہ سو غالب اور اس کے بھائی میرزا یوسف کو۔

قصیدہ بھیجا تھا جس کے صلہ کے منتظر تھے تاکہ سفر خرچ کی طرف سے ایک گونہ اطمینان ہو جائے۔ فشی محمد حسن کے نام کے ایک خط میں اس قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بوکہ مرابہ جائزہ یاد خوانی و صد مدح گستری این مایہ سامان فراز آید کہ خود را گرد آورده به کلکتہ
توانم برد۔ و کارے تو انم کرد وقت از دست می رود و ہنگام کارے گزرد۔

سفر کا سامان میسر نہ آ سکا اور وہ اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ گورنر جنرل یہ سلسلہ دورہ دہلی پہنچیں گے تو ان سے آخری جواب کے لئے تقاضا کیا جائے گا:

چہار سال سے گزرد کہ مقدم من یہ اجلاس کونسل در پیش است و دلم از فقر و امید و بیم ریش
حکمے کہ قطع خصومت تواند کرد و بر نیامدہ و ہنگام بہ پایان رسیدن تیرہ شب تا امید و بر نیامدہ۔

عالیابراں سرم کہ چوں جزو اعظم کونسل ان شرت الامراللہ و لیم کہ اس ٹینک بہادر ہیں یا در آید
بہ دانش در آویزم و داد خواہم داد استدعائے حکم اخیر کنم۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ لاٹ صاحب کا دامن تھام کر غالب نے داد خواہی میں براہ کیا
یا نہیں کیا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ لاٹ صاحب نے ان کے کاغذات منگائے
غائب فرماتے ہیں:

فرجام داد خواہی من جزا میں قدر نیست کہ لارڈ کونڈس ٹینک بہادر کو اخذ مقدمہ مرا از دفتر
دہلی با خود بردہ کا۔ پر دازان دفتر گورنری سے گفتند کہ داد نامہ اسے پیش از دفتر کلکتہ نیز طلب
فرمودہ است تا یہ مشاہدہ آں مجموع حکم اخیر توانم داد۔

ماریسی | لیکن ان کا دل مایوس تھا۔ اس بات پر بے حد قلق تھا کہ ایک غیر منظورہ تحریر کی
بنیاد پر حکومت کی منظورہ تحریر منسوخ کر دی گئی:

نفریہ تفرقہ کرد در قوانین حکومت روسے دادہ وہ حکم کشاکشے کہ در سر رشته کار من افتادہ، اگر
فی انشل در بارہ من حکم قتل صادر گردد و بعد نے دامن وا اگر بالفرض یک نیمہ زجا گیر قتلانے یہ من بخشیدہ

شود شگفت نے پندارم۔ چوں عدل حقیقی نیست ہرچہ باشد گویا بش۔

اپیل مسترد ہوگئی | آخر کار غالب کے خلاف فیصلہ صادر ہو گیا۔

چیراسی سررشتہ اجنبی دہلی رسید نامہ مہری و نیم فریور بہادر بہن داد چوں بہیزان نظر بخیم
گراں ترزاں بود کہ آں را یک نامہ توان نگاشت۔ بائے از ہم کشورم و دیدیم کہ نامہ مہری و نیم
صاحب بہادر در نوردان است۔ یہضموش ایسکہ کو نقد نظر شمس قدسہ ز نظر نواب معالی القاب (گورنر جنرل)
لکڑ گزشت و فرمان صادر شد کہ تجویز پانکس صاحب منظور و مہر و دستخط کاغذ گزرا نہ مرزا بن مہوات
(والی فیروز پور بھکر) اصلی و بند و ثبت مندرجہ دفتر سرکار نامہ صرح و نامکمل فقط اللہ و من قال عہ

در خاندان کسرے ایں عدل و داد باشد

گورنر جنرل سے ملت بھی نہ کی | غالب اس کے بعد اس درجہ مایوس ہوئے کہ گورنر جنرل ہی کیا

تو اس سے ملنے بھی نہ گئے۔ وہ خود فرما تھے: یہ

لارڈ کوئٹس بینک بنے۔ میں قریب۔ وہی نزول ہوا۔ نوید بار داد و مرزا باناں و
مشاہرہ خیراں، بزرگان و عہداران شہر رتند و شمسند و عہد پان یافتہ۔ غالب مستند کرکشتہ
صورت معقول اعمال خرامت۔ دریں ہنگامہ جاگرم نہ کرد و بہ بارگاہ نہ رسید و چشم بہ راہ پیدا آمدن
اہممت از جانب بیٹکا اشارہ بہ ورود نواب گورنر جنرل جدید است۔

یعنی غالب سمجھ رہے تھے کہ لارڈ بینک تو ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے شاید جدید
گورنر جنرل (لارڈ آکلینڈ) ان کی حق رسی پر متوجہ ہوں۔ اس لئے لارڈ آکلینڈ کے
ورود کو "ایر رحمت" قرار دیتے تھے۔ اور ان کی کشت امید اس باول سے سیرانی و
شادی کے لئے چشم براہ تھی۔

سے سرولیم عہد مکنائٹ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک لارڈ ولیم بینک کے سیکرٹری تھے اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۶ء

تک حکومت ہند میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری رہے و ڈاکٹری ات انٹین بالوگرافی صفحہ ۲۵۶

ولیم فریزر کا قتل اور شمس الدین احمد اس دوران میں ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس میں وہاں خاں کو پھانسی کی سزا۔ شمس الدین احمد خاں ماخوذ ہوئے۔ انکی ریاست سرکار

انگریزی نے اپنی نگرانی میں لے لی۔ ماتھی، گھوڑے، سانڈیاں، گائیں، بیل، پیش بہا پارچا کے تھان، بگھیاں اور بہت سادہ و سراسر سامان فروخت ہو گیا۔ دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کی رقم پراسری نوٹوں کی شکل میں حکومت انگلشیہ کے پاس جمع تھی، اس میں سے ڈھائی لاکھ روپیہ پھانسی سے دو یا تین روز پیشتر نواب نے اپنی بڑی بیگم کے مہر میں لکھ دیئے تھے۔ جیسا کہ ان کے وصیت نامہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نواب کے ذمے مختلف سامانوں کے قرضے تھے۔ ان کی ریاست سے جن لوگوں کو پشتمیں ملتی تھیں ان کے بھائے واجب اللادہ تھے۔ شمس الدین احمد خاں کی بیگم نے ایک درخواست پیش کر دی کہ ریاست نواب کی صاحبزادیوں (احمد انسا، بیگم اور شمس انسا، بیگم) کے نام مستقل کی جائے۔ دلیل یہ دی کہ یہ نواب احمد بخش خاں کو استمراراً ملی تھی۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے کسی ذاتی فعل کی بناء پر ان کی اولاد کو آبائی حقوق سے محروم کرنا خلاف انصاف ہے۔

نائب کی تازہ درخواست اس زمانے میں دہلی کا علاقہ آگرہ دارالآباد کی لفٹنٹ گورنری سے متعلق تھا۔ غالب نے بھی ۳ جون ۱۹۳۵ء کو یعنی شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری سے قریب دو ماہ بعد اپنے پرانے مطالبات کے متعلق ایک مفصل درخواست مرتب کر کے لفٹنٹ گورنر آگرہ دارالآباد کے پاس بھیج دی۔ یہ دہلی ریزیدنسی کے پرائیویٹ رولز میں موجود ہے۔ اصل درخواست انگریزی زبان میں ہے۔ آخر میں غالب کی مہر اور دستخط ثبت ہیں۔ اس میں ۳ جون ۱۹۳۵ء والے نقشہ پر جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کا مقدمہ خارج ہوا تھا، مفصل بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے :-

۱) کوئی پرواز یا شفعہ جاری نہیں ہو سکتا جس کا مسودہ ریکارڈ میں موجود نہ ہو۔ لہذا رڈ لیک کا رشتہ

والی فیروز پور کی طرف سے پیش ہوا وہ جعلی ہے اس لئے اس کا کوئی مسودہ سرکاری دفتر میں موجود نہیں۔

(۲) اصل شقہ میں ”گورنر جنرل“ کے نام کے ساتھ ”نواب“ کا لفظ موجود نہیں اور یہ امر سرکاری دستور مخاطب کے

خلاف ہے۔ لہذا یہ شقہ کسی ایسے شخص کے لکھا جو فارسی دفتر کے قواعد سے سراسر انا بلد تھا۔

(۳) اس میں خواجہ حاجی کو میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے اہل خاندان میں شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ خواجہ حاجی

اس خاندان کا فرد تھا اور اس خاندان میں اس کی شادی ہوئی تھی۔

(۴) اصل شقہ میں پانچ ہزار روپے کا ذکر ہے لیکن یہ تصریح نہیں کی گئی کہ پانچ ہزار کی یہ رقم پچیس ہزار

کی اس رقم کے علاوہ ہوگی جو نواب احمد بخش خاں کے ذمے لگائی گئی تھی یا اس میں محسوب ہوگی۔

(۵) اگر پانچ ہزار کی رقم کو دس ہزار کی اس رقم کا حصہ قرار دیا جائے جو ہر مئی شقہ کو لارڈ لیک کی تجویز

اور حکومت کی منظوری کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کے لئے مقرر ہوئی تھی تو سوال یہ ہے

کہ لارڈ لیک ایک ماہ کے اندر انہ اس رقم میں سے نصف حصہ کیمر کر خد ف کر سکتے تھے؟ اور پھر نہ اس باب

میں گورنر جنرل سے منظوری لی گئی اور نہ اس کے متعلق حکومت سے خط و کتابت کی گئی۔ لارڈ لیک

بہ اختیار خود گورنر جنرل کی منظوری میں تخفیف کے مجاز نہ تھے۔

اس بحث کے بعد غالب لکھتے ہیں کہ بے شک سر جان سلیم کی تصدیق سے ثابت

ہو گیا کہ والی فیروز پور کا پیش کردہ شقہ لارڈ لیک کی مہر اور دستخط سے باری ہوا۔ لیکن معلوم

ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک کے عملہ کو رشوت دے کر شقہ لکھوایا۔ اور

دوسرے کاغذات کے پلندے میں رکھ کر اس پر لارڈ موصوت سے دستخط لئے۔

دو لاکھ تین ہزار کا مطالبہ اس درخواست میں غالب کا مطالبہ یہ تھا کہ فیروز پور جھڑ کی ریاست

مولانا آزاد نے اب حیات میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کے مطابق تحریر فرمایا ہے کہ سر جان سلیم نے غالب کے دعوے

کے متعلق یہ لکھا تھا کہ نواب احمد بخش خاں انگریزوں کا قیدی دوست اور استبداد میر تقی اس پر اتہام ضد سے لگایا گیا ہے۔ میں

نہیں کہتا کہ نواب صاحب کا بیان صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن غالب کے دعوے کی بنیاد محض یہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں

نے عملہ کو رشوت دیکر شقہ پر دستخط حاصل کر لئے بلکہ حقیقی بنیاد یہ تھی کہ لارڈ لیک بہ اختیار خود گورنر جنرل کی منظور کردہ تحریر

کو منسوخ کرنے کے مجاز نہ تھے۔ عملہ کو رشوت دے کر شقہ حاصل کر لینے کا جو نسبہ ظاہر کیا گیا ہے وہ بھی غیر معقول نہیں۔

اواخر اپریل ۱۸۳۵ء تک نواب احمد بخش خاں اور نواب شمس الدین احمد خاں کے پاس یہی اس طرح مٹی شدہ سے لے کر اپریل ۱۸۳۵ء تک سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے دو لاکھ تین ہزار روپے کی رقم جو مجھے ملنی چاہیے تھی نہ ملی۔ لہذا اب یہ روپیہ اس رقم میں سے ادا کیا جائے۔ جو نواب شمس الدین احمد خاں نے سرکار انگریزی میں جمع کر رکھا ہے۔ خواجہ حاجی کو جو دو ہزار سالانہ ملتے رہے ہیں، وہ پندرہ ہزار کی اس رقم میں محسوب ہوں جو نواب بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے دس ہزار روپوں کے علاوہ والی فیروز پور کے ذمے واجب الادا تھی۔

اس وقت تک شمس الدین احمد خاں کے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور ان کی ریاست اگرچہ سرکار انگریزی کی تحویل میں تھی۔ لیکن ضبطی کے آخری احکام صادر نہیں ہوئے تھے۔ لہذا غالب نے اپنی درخواست میں تفریح کر دی۔ کہ اس باب میں تین صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

(۱) ریاست شمس الدین احمد خاں یا ان کے وارثوں کو واپس مل جائے۔ اس صورت میں پچیس ہزار روپے کی رقم ہر سال حکومت کو وصول کر لینی چاہیے۔ جس میں سے دس ہزار روپے مجھے (غالب کو) دیئے جائیں۔ بقیہ روپے سرکار کے خزانے میں جمع ہوں۔

(۲) ریاست کو حکومت خود سنبھال لے اور نواب کے متعلقین کا گزارہ مقرر کرے۔ اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے (غالب کو) ملنے چاہئیں۔ اور پندرہ ہزار روپے حکومت خود رکھے۔

(۳) حکومت ریاست کو سنبھال لے اور نواب کے متعلقین کو گزارہ بھی نہ دے۔ اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے ملنے چاہئیں اور خواجہ حاجی کے وظیفہ کو ہر حال میں ختم کر دینا چاہیے۔ اس درخواست کے آخر میں غالب نے اپنے قلم سے پانچ ہزار والا وہ فارسی شوق نقل

کر دیا۔ جو وائی فیروز پور چھر کے جواب دعوے کی بتا رہا تھا۔

مقدمہ از سر نو دہلی میں اس درخواست کے جواب میں لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا کہ ٹامس تنجیولس مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی اس کے متعلق رپورٹ پیش کریں۔ غالب کو اس حکم کا علم ہوا۔ تو ۱۷ دسمبر ۱۸۳۵ء کو پھر ایک درخواست لفٹنٹ گورنر کے پاس بھیجی جس میں لکھا کہ مٹکاف صاحب کا عام طریقہ یہ ہے کہ عملہ سے تمام مقدمات کا خلاصہ تیار کراتے ہیں۔ اور ان خلاصوں کی بنیاد پر اپنی رائیں لکھتے ہیں۔ عملہ والے رشوت کے عادی ہیں۔ میرے پاس روپیہ نہیں۔ اس لئے عملہ کو خوش نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں میرے مقدمے کے متعلق محض خلاصہ پر تکیہ نہ کیا جائے بلکہ اصل کاغذات دیکھے جائیں۔

غالب کو جویشن مل دہلی تھی اس میں سے بھی کچھ رقم واجب الوصول تھی۔ لہذا انہوں نے تیسری درخواست پیش کر دی کہ اول نواب فیروز پور کا جوڈھائی لاکھ روپیہ سرکار میں جمع ہے۔ اس میں سے دو لاکھ تین ہزار روپیہ بہ سلسلہ بقایا دیا جائے۔ نیز تین ہزار روپے جویشن کے عام روپے میں سے باقی ہیں، ادا کئے جائیں۔ جزوی بقائے کا معاملہ الگ چلتا رہا۔ اصل دعوے کے جواب میں لفٹنٹ گورنر کا حکم آیا کہ مقدمہ سوپریم کونسل میں پیش ہو چکا ہے، اس لئے لفٹنٹ گورنر اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کر سکتا سارے کاغذات گورنر جنرل کے پاس بھیجے جائیں۔

گورنر جنرل کے پاس درخواست ۱۲ مارچ ۱۸۳۶ء کو غالب نے لارڈ آکلینڈ کے پاس دو درخواستیں بھیجیں۔ ان میں اپنے مقدمے کی روداد تحریر کر دی۔ نیز لکھا کہ سکریٹری اور ریزیڈنٹ نے میرا مقدمہ خراب کر دیا ہے اور میرے ساتھ مزید بے انصافی ہوئی ہے آپ خود انگریزی انصاف کے اصول پر اس کا فیصلہ کریں۔ تمام ضروری کاغذات سرکاری دفتر میں

سلسلہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں نے پیش یا قاعدہ ادا نہیں کی تھی یا کم از کم آخری چار سال میں ایک جہہ بھی ادا نہیں کیا تھا۔

موجود ہیں۔ اگر وہی کے حکام میرے مطالبات کے سلسلے میں شبہات پیدا کریں تو میں انہیں دور کر سکتا ہوں۔ انی درخواستوں میں سے ایک پر غالب نے اپنے قلم سے حکومت کا وہ فارسی شقہ لفظاً نقل کر دیا تھا جو لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری کے مطابق نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کیلئے دس ہزار روپیہ سالانہ کے حکم پر مشتمل تھا۔ ان درخواستوں کی رسید کی اسناد غالب کی تھی۔

بقایا کے لئے جھگڑا | تین ہزار کے جس بقائے کا ذکر اوپر آیا ہے اس کے لئے غالب نے ۲۶ اگست ۱۸۳۷ء کو پھر ایک درخواست پیش کی۔ ایجنٹ نے مطالبہ حق بہ جا قرار دیا، اس پر حکم ہو گیا کہ رقم ادا کر دی جائے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو امر او بیگم دیگم غالب اور ان کی بہن بنیادی بیگم کی طرف سے بھی وظیفے کی بقایا رقوم کے لئے درخواستیں پیش ہو گئیں۔

شمس الدین احمد خاں کو پچانسی مل جانے پر چونکہ ریاست فیروز پور کے خلاف ہر طرف سے مطالبات پیش ہو گئے تھے اس لئے انگریز حکام نے غالب ان سب کو قرض تسلیم کر کے یہ شیوہ اختیار کر لیا تھا کہ وہ جس کسی کو دیتے، اصل سے ایک حصہ کم کر کے دیتے۔ غالب نے اس تخفیف سے بچنے کے لئے ۱۳ جولائی ۱۸۳۷ء کو ایک درخواست دی کہ میرے معاملے کو دوسرے لوگوں کے معاملات سے جداگانہ متصور کیا جائے۔ اس پر ۲۴ جولائی کو حکم صادر ہوا کہ امتیازی سلوک کی کوئی وجہ نہیں۔

بقائے کے متعلق اس کے بعد یہ بھی جھگڑا جاری رہا۔ چنانچہ ۱۴ جولائی ۱۸۳۷ء کو بھی غالب نے ایک دعوے کیا تھا جو بے بنیاد قرار پایا۔ یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ یہ دعوے تین ہزار کے متعلق تھا یا دو لاکھ تین ہزار کے متعلق جس کا حساب غالب نے ۱۸۰۶ء سے لگا رکھا تھا۔

بقدر حالات عدم اس کے بعد غالب کی تحریرات سے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے

وہ مولوی خلیل الدین خاں بہادر کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ لارڈ ڈنکن کے ہمارے سچائی پر دئے کار نہ آئی اور دشمن کامیاب ہو گیا۔ لارڈ آکلینڈ کے ہندوستان آنے تک زمانے کے حالات بدل گئے۔ والی فیروز پور کو پھانسی کی سزا مل گئی۔ انکی ریاست سرکار انگریزی کے قبضے میں آگئی۔ میں نے سرکار انگریزی کو بدعاطیہ اور کورٹ آف انکوائری کو بیخ قرار دیا اور سندھ و ایب بجا لارڈ آکلینڈ کا زمانہ ختم ہو یا لندن سے مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ لارڈ ڈیلن براگور نہ بنیں بنے تو میں نے اپنی منظومیت کی داستان انکے سامنے پیش کی اور ایک انگریزی عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھ کر خواہش کی کہ اسے لندن بھیج دیا جائے۔ اس کا جواب چیف سکریٹری صاحب نے الہ آباد کے مقام سے بھیجا کہ عرضداشت دوسرے کاغذات کے ہمراہ ولایت بھیج دی جائے گی۔

میر سید علی خاں عرف حضرت جی کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مدت تک فرماندگان کلکتہ کی انجمن میں بیچ و تاب کھاتا رہا۔ اب دو سال سے میرا مقدمہ ولایت گیا ہوا ہے۔

سہ کلیات شرفازی صفحہ ۱۹۹ و ۲۰۰ مذکور غالب میں مرقوم ہے کہ ۱۲ نومبر ۱۸۳۱ء کو مالتب نے درخواست دی تھی کہ میرا مقدمہ یا تو صدر دوائی کلکتہ میں رکھا جائے یا کورٹ آف ڈائریکٹر کے فیصلے کیلئے ولایت بھیج دیا جائے اس کا جواب ۵ دسمبر ۱۸۳۱ء کو ملا کر تھارے کاغذات ولایت بھیج دیئے جینگے۔ کاغذات در *میر سید علی خاں* (نامی جہاز میں ۱۰ مئی ۱۸۳۲ء کو بھیجے گئے تھے۔ ۱۱ کلیات شرفازی صفحہ ۱۹۳ مذکور غالب میں مرقوم ہوا ہے کہ غالب ۲۴ دسمبر ۱۸۳۱ء کو ایک درخواست میں گورنر جنرل سے نہیں مطالبے کئے تھے (۱) دو لاکھ تین ہزار روپے والی فیروز پور کا بیع کردہ رقم میں سے دانٹے جائیں (۲) جس ہزار عام اٹھایا اکا جائے جس جب تک کورٹ آف ڈائریکٹر میں مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے تب تک ہزار روپے باقی عدہ ملتے رہیں۔

یہ جس ان درخواستوں سے کوئی نتیجہ نہ نکلا ۱۸۳۲ء میں کورٹ آف ڈائریکٹر نے بھی فیصلہ کر دیا کہ جو کچھ ہندوستان میں پہلے طے ہو چکا ہے وہی بحال رہیگا۔ غالب نے اس کے بعد ۲ جولائی ۱۸۳۲ء کو ملکہ مظفر کٹوریہ کے نام ایک مسموری بطور پس تیار کیا اور گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا۔ آخر ۲۷ دسمبر ۱۸۳۲ء میں پائل مایوس ہو گئے۔

اس طرح پنشن کا مقدمہ ختم ہو گیا اور ۱۸۲۶ء سے لے کر ۱۸۴۳ء تک زندگی کے اٹھارہ برس امید و بیم کی کشمکش میں گزار کر حبيب بہبود کار کا ہر رشتہ کٹ گیا اور روشنی کی ہر جھلک ناپید ہو گئی۔ تو چند سال ناموش بیٹھے رہے۔ ۱۸۵۳ء یا ۱۸۵۵ء میں خدا جانے کس کی تحریک پر ملکہ و کٹوریہ کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ لکھا اور ڈاک کے ذریعہ تلہ لارڈ ایلن براکے پاس انگلستان بھیج دیا۔ لارڈ موصوف کی گورنر جنرلی کے زمانے سے ان کے ساتھ وابطہ قائم تھے۔ غلبہ بعد میں بھی سلسلہ مکاتبت جاری رہا ہو۔ یہ قصیدہ لارڈ ایلن برائے نزدیکیاں بارگاہ کے حوالے کر دیا۔ ایک مہینے کے بعد جواب آیا کہ شاعر پناہ عاز مقصود ہندوستان کے گورنر جنرل کی وساطت سے پیش کرے۔ اس کے جواب میں نائب نے تین درخواستیں کیں :-

۱۱۔ ملکہ کی طرف سے خطاب دیا جائے۔

(۲) خلعت عطا ہو۔

(۳) پنشن کا بندوبست کیا جائے۔

یہ درخواستیں گورنر جنرل نے اس دن پڑھ دی۔ غدر سے قریباً تین ماہ پیشتر لندن سے امید افزا جواب آیا۔ لیکن ابھی کچھ ٹپے نہیں ہوئے تھے کہ غدر کی آگ جھڑک اٹھی جس نے خوش کن آرزوؤں کی اس نئی مناسبت کو بھی جلا کر راکھ بنا ڈالا۔

اُردو کے ایک مکتوب میں خواجہ غلام غوث خان پنجاب کو لکھتے ہیں :-

۱۵ ستمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہو حکم وزیر اعظم کا دست کی ڈک میں مجھ کو آیا ہے کہ اس قصیدے کے

صند درجائزہ کے واسطے جو ہوسط لارڈ ایلن برائے ملکہ سے جواب سے خطاب و خدمت اور پنشن کی تجدید پر

منسوب ہے حکم صادر ہو گا سائل کو نومستور نمشت اسکی اطلاع دی ضروری ہے۔ حکم مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۶ء

تھوڑی سی مقدار میں نے پایا فروری، مارچ، اپریل، مئی، اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء

میں نلک نے یہ فتنہ اٹھایا یعنی غدر برپا ہو گیا

تک کے انگریز مدوح | غالب کے فارسی کلیات نظم میں متعدد انگریزوں کے مدحیہ قصائد و
 قطعات موجود ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر اصحاب کی مدح پنشن ہی کے مقدمہ کے
 سلسلے میں کی گئی تھی۔ مثلاً اینڈریو اسٹرلنگ کے قصیدے کے بعض اشعار اور نقل ہو
 چکے ہیں وہ چیف سکریٹری تھے اور غالب کا مقدمہ ان کے پاس پیش ہوا تھا۔ ایک قطعہ ولیم
 میکناٹن کی متائش میں ہے۔ وہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۳ء تک گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکریٹری
 اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۷ء تک پولیٹیکل ڈی پارٹمنٹ کے سکریٹری تھے جیمس ٹامپسن جنکی
 مدح میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ ہے۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۲ء تک گورنمنٹ کے سکریٹری
 اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۳ء تک فارن سکریٹری تھے۔ بعد میں صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر
 بن گئے تھے۔ چارلس متائش کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ وہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء
 تک سوپریم کونسل کے ممبر رہے۔ ٹامس باڈک کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ وہ گورنمنٹ
 کے سکریٹری تھے۔ بعد ازاں بنکال کے ڈپٹی گورنر بنے۔ کالون کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔
 وہ لارڈ آکلینڈ کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ بعد ازاں صوبجات متحدہ کے لفٹنٹ گورنر
 بنے۔ اینڈرمنٹن کی مدح میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ ہے۔ وہ گورنمنٹ کے فارن
 سکریٹری تھے۔ گورنر جنرلوں کی مدح کا سلسلہ بھی پنشن ہی کے ضمن میں شروع ہوا تھا۔ مثلاً
 لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانے میں پنشن کا مقدمہ پیش ہوا۔ ان سے پیشتر کے گورنر جنرلوں کی
 مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں۔ صرف ایک قطعہ لارڈ بنٹنک کے ورود دہلی کے متعلق
 کلیات نظم فارسی میں ہے اس کے بعد گورنر جنرل کی مدح میں ایک ایک قصیدہ موجود
 ہے۔ لارڈ ایلیٹ برا کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔

غالب نے حکومت ہند کے مختلف امدیداروں اور گورنر جنرلوں کے قصیدے لکھے یا

قطعوں کے سلسلے میں پنتن کے مقدمہ یا اپنی ذات کے متعلق جو کچھ لکھا مناسبیت
مقام کا اقتضاد ہے کہ اُسے بھی یہاں پیش کر دیا جائے۔

سینکڑوں صاحب امیکنٹائن کے قطعہ میں لکھتے ہیں،

باچیس بختے کہ من دارم عجیب اسم کہ من نوشتن راستحق لطف احسان دیدام
وہم ستودہ است بر من دیں پیرانہ بود کہ من خود چہ نوشیدی ز گمراہیہ دران دیدام
یکدہ پرکشش دارم وار لعل گوہر بار تو آرزو ز نشہ کام پاسخ آن دیدام
سہ چارلس مکافٹ اچارلس مکافٹ کے قصیدے میں فرماتے ہیں،

یاد باد آنکہ از یں مرحلہ تا کلکست کردہ ام مٹے بہ امید تورہ دور و دراز
گر نہ اندیشہ بہ عدل تو قوی لگستہ ناقہ سی من از راہ نہ گریہ سے باز
نالہ زار من از شدت جور شرکاست نے زد یونگی و خیرگی ز شوخی و آزار
بہر من در رزقے کہ کشاید واذر سیب باشد کہ کند خشم بد اندیش فرا
ہفت سال ست کہ بایک گراؤ یختہ ایم من و خاصب پو سررشتہ شمع دم کاڑ
اور خوشخوارگی خویش در انداز غضب من ز بیچارگی خویش بہ آداب نیاز

خود تودانی کہ از یں منحصر رہن نتواں جز بہ تائید تو اسے شہر درویش نواز
بوکہ اندازہ در آید بہ درستی ز خلل ہو کہ اندیشہ گراید بہ حقیقت ز مجاز
طاقتم نیست بخاک کف پائے تو قسم زانکہ غم جو وصلہ سوز است بل از ہرہ گداز
چوں چرخ غریہ بادم بہ گزر گاہ فنا داد را نہ دو تراز ہر چہ بہ حالہم پرواز
پانچ مطالبات "ہفت سال" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ غالباً ۱۸۳۶ء میں کہا۔

گیا۔ اس میں اپنے مطالبات کے متعلق لکھتے ہیں :

پانچ مطالبے تو اہم بہت بہ صد گونہ امید خواہم آل پنج علی الرغم حسود و غماز
اول این است کہ در باب محاشہ کہ مرست کنی اندیشہ محکم بہ طریق ایجاب
ہرچہ در دفتر سرکار بود نقضش پذیر ہم بہ اندازہ آل نقض شومی ماندہ ساز
دوم آل کذا اثر عدل تو اسے کس نہ جوب غیر پابندہ دریں وجہ نباشد انسا
سوم آن است کہ دیگر نگنہ دست طلب پیش فرماندہ میوت بدر یوزہ دراز
ہم بہ گنجینہ سرکار براسند خواہم دادہ انصاف ہمیں یا فسخی اذن جواز
چارم آن است کہ باقی زیر پندیں سالہ بے نزاع و جدل و جہد بہ من گزرو باز
پنجم آن کذا پس ازین فتح کہ بناید روسہ ہی ام مشردہ الرام و نوید اخسزانہ

بخشی ام تازہ خطابے و براں افسزائی

خلعتے در خدراں دولت جاوید طسیرانہ

غالب کی قادر الہی کے کلمات و احفظ فرمائیے کہ ہر قسم کے خطاب کس بے تکلفی سے نظم کر جاتے ہیں اور شعری دیکشی میں ذرا فرق نہیں آئے دیتے۔ اوپر کے اشعار میں اپنے پانچ مطالبات کس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ اول مجھے پنشن سرکار کی منظوری کے مطابق ملے۔ دوم، میری پنشن دوسرے متعلقین سے الگ کر دی جائے۔ سوم مجھے والی فیروز پور جہر کہ کے رو برو دست خط دراز نہ کرنا پڑے بلکہ پنشن سرکاری خزانہ سے متعلق ہو جائے۔ چہارم، جتنا روپیہ اب تک وصول نہیں ہوا وہ مل جائے پنجم نیا خطاب اور خلعت دیا جائے۔

مقدمہ ولایت جارہا ہے جس زمانے میں مقدمہ ولایت جارہا تھا حکومت ہند کے

کسی کن کو لکھا تھا

بہ صدھے رو دایں باز پرس بسیم اللہ
تو کردی تو کنی کارم اعتقاد این است
رسیدے دیپائے تو سودے سدر خضر
مفیدہ طالب من ہر کتابتہ کہ بود
بہ صفت تو دل شد بہد بدیں شادم
بہ ذوق قرب زمان مراد بے تمام
بہ نیم روز بہ لندن رساندے زورق
از آکلیند از آکلیند کے قصیدے میں لکھتے ہیں

از تو رسیدم بہ نوش در بہ ہم عمر یا
از تو توانا شدم ورنہ مراد ہوا
خواست دل اردو خیال زخم چاندن
سرکہ زہبہ پاشید زہر ز شکر گرفت
چارہ زبے یانی صورت ابتر گرفت
از پیشہ آن بخیہ تار از تن لاغر گرفت

بہم زدم گرم خوش خشک نمودم ورق
باتو چہ گویم زہر کا بزد ز انصاف تو
آخر می شعر میں غالباً ثواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی اور ریاست فیروز پور جیکہ
کی ضبط کی طرف اشارہ ہے۔

لا رہ ڈا یلن سرا لا رہ ڈا یلن ہر اس کے قصیدے میں فرماتے ہیں :

بہ گفتارم تو نگر گر بہیم دوز تہید ستم
بہ رسم نکتہ سنجای در سخن نام بود غالب
مراد وفاست اندر دل کہ با غرضائی لڑ
زمین کلبہ من شد گلستان بعد ویرانی
بہیں نام از ازل آوردہ ام طغرا سنجائی
ندام چارہ اما میں قدر و نام کہ مے دانی

کرمے کرو گمراہ راہ گلیںڈ از راہ غمخواری تو نیز از راہ غمخواری کرم کن کنز کرم بیانی
ازاں در نامہ مدح تو از ہم ہرزبان نامش کہ بامین داشت گوناگون نواز شہسائے نہانی
گمراہ در رشتہ مدح سخنور گوہر آمود سے ترا باید کہ بر فرق سخنور گوہر افشانی
دوسرے قصیدے میں فرماتے ہیں:

رفت آں غم از نہاد و بدیں شاد زیستن و انم کہ مردہ زندہ شد اندر زمان تو
در اجرائیکہ کوشش من ایگان رفت خواہم ز حق حیات ابد را یگان تو
و کثیریہ | و کثوریہ کے قصیدے میں غالب نے یہ سلسلہ دعا لکھا تھا۔

آں باد و در نیست کہ گفتار من مرا سیمائے عز و جاہ بریں آستان دہد
آں باد و در و باد کہ کلک دبیر خاص آوازہ نوازش من در جہاں دہد
آں باد و در خورست کہ فرماند ہی کنم بر یک دودہ کہ گنگ بہ ہندوستان دہد
آں باد و خوش بود کہ شہنشاہ بحر و بر

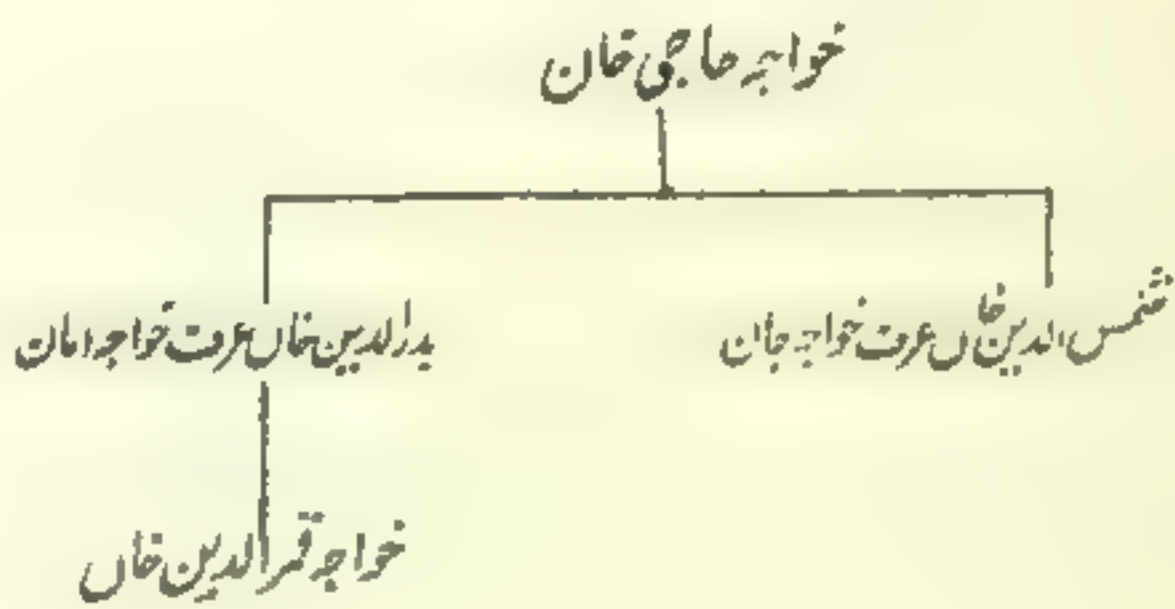
انجام خواہش اسد اللہ خاں دہد

میرا خیال ہے کہ غالب کی مالی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمہ کا بڑا حصہ تھا۔ اس پر کافی روپیہ صرف ہوا اور مدت دید تک امید لگی رہی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو جائیگا۔ اس بنا پر وہ بے تکلف قرض لینے رہے اور انہیں قرض ملتا رہا۔ ایک وقت میں امید پیدا ہو گئی تھی کہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ یک مشت مل جائے گا اور اتنی بڑی رقم کے یکمشت مل جانے کی امید پر غالب کو قرض کا بڑے سے بڑا بوجھ اٹھالینے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا تھا سو دواخوار حجاجوں کے لئے ایسی موٹی مگر عاقبت نااندیش اسامی کو زیادہ سے زیادہ قرض دینے میں تذبذب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بہ ہر حال وہ اٹھارہ برس اس قرضہ میں الجھے رہے۔ پھر نئی پنشن نئے خطاب اور نئے اعزاز کی توقع پیدا ہوئی جو ۱۸۵۷ء تک خدا جانے کس شاییش و فراغت بال کے کیسے کیسے

دلکش خیالی منظران کے سامنے پیش کرتی رہی۔ اُمید و آرزو کے یہ تمام رنگین نقوش اس وقت مراب ثابت ہوئے جب سنہین حیات کی اکسٹھ مسافتیں طے ہو چکی تھیں۔ اور شہرِ خموشاں کا سواد بالکل سامنے آ گیا تھا۔

شجرہ خواجہ حاجی خاں

خواجہ حاجی خاں کے والد خواجہ قطب الدین غالب کے دادا کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غازی کے مورث اعلیٰ شہزادہ ترسم خاں کے بھائی شہزادہ رستم خاں کے اخلاف میں سے تھے۔ خواجہ حاجی خاں کی شادی جیون بیگ کیدان برلاس سبرپوش کی صاحبزادی امیرانسا بیگم سے ہوئی تھی۔



بدرالدین خاں عرف خواجہ امان نے بوستان خیال کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔

اٹھواں باب

ابتلا راسیری

چرٹ یک مرد گراں مایہ بہ زنداں خواہد
یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

۱۲۶۳ھ (مطابق ۱۸۴۷ء) میں غالب پراسیری کی مصیبت آئی۔ اس واقعے کے متعلق تصانیف میں کوئی مواد موجود نہیں۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے ایک فارسی خط میں اس واقعہ کو اختصاراً لکھا ہے۔ یہ خط کلیات نثر میں موجود نہیں اور غالباً اب تک غیر مطبوعہ ہے خواجہ مرحوم نے اس کا جو اقتباس ”یادگار“ میں درج کیا ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ غالب کو چور اور شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اور جب کھیلتے تھے۔ تو برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلتے تھے۔ کو تو ال دشمن تھا۔ اس نے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ مجسٹریٹ غالب کی حیثیت، مرتبہ اور ذاتی حالات سے ناواقف تھا۔

۱۵ سیدنا صندیر قراق نے لکھا ہے کہ مجسٹریٹ کنور نوروز علی خاں تھے۔ جو دان پور ضلع بلند شہر کے تعلقدار اور سرکار کمپنی کے معتمد تھے۔ وہ میرٹھ سے بدل کر شاہ جہان آباد آئے تھے۔

اس نے چھ ماہ قید کی سزا دے دی۔ سیشن ججی میں اپیل کی گئی۔ جج اگرچہ غالب کا دوست تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملتا تھا۔ لیکن اس نے بھی تغافل اختیار کر لیا۔ اور سزائے قید بحال رکھی۔ صدر میں اپیل کی گئی۔ لیکن وہاں بھی کوئی ششخوائی نہ ہوئی۔ تین مہینے گزر جانے کے بعد مجسٹریٹ نے خود ہی رہائی کی رپورٹ صدر میں بھیج دی اور غالب رہا ہو گئے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ قید میں ان کی حیثیت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا پینا اور ضرورت کی دوسری چیزیں ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست بے تکلف ملتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے حالات اور نوعیت جرم کے اعتبار سے یہ واقعہ سخت ذلت خیز تھا۔ اور غالب نے اسے بے حد محسوس کیا۔ خواجہ صاحب کا بیان کے مطابق انہوں نے فرمایا:۔

اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے رشتہ نہیں جا سکتا، جو کچھ گزرا، اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے۔ اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلا دادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ دراندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفوسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصد و قرار دے

سر بہ صحرانگل جاؤں

اردوئے معنیٰ میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جس پر: ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کی تاریخ

ثبت ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

۱۷ "یادگار غالب" صفحہ ۲۷ و ۲۸

سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔

شاید ان الفاظ میں بھی قید سی کی طرف اشارہ ہے۔

دہلی میں قمار بازی کی وبا خواجہ حسن نظامی نے ”دہلی کا آخری سانس“ کے نام سے ”احسن الاخبار“ کے ان فارسی مضامین کا ترجمہ شائع کیا ہے جو دہلی یادر بار شاہی کے حالات پر مشتمل تھے یہ کتاب نومبر ۱۸۴۳ء سے لے کر مارچ ۱۸۴۴ء تک حالات دہلی کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکام کی توجہ اس زمانے میں قمار بازی کے انسداد کی طرف بطور خاص مبذول تھی۔ شاید اس لئے کہ یہ وبا بہت پھیل گئی تھی۔ مثلاً ۲۰ جون ۱۸۴۳ء کے حالات میں مرقوم ہے :-

کوئال شہر نے سو آدمیوں کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر کے عاکم کے سامنے پیش کیا۔ نو آدمیوں کو چھ مہینے کی قید اور پچاس روپے جرمانہ اور پانچ آدمیوں کو تین مہینے کی قید اور پچیس روپے جرمانہ اور دو آدمیوں کو ایک مہینے کی قید اور چار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں حکم ہوا کہ ایسے لوگوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر سڑکوں کی تعمیر و درستی کا کام لیا جائے

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قمار بازی کا براے نام ارتکاب بھی حکام کی نظروں میں بہت سنگین جرم بن گیا ہوگا۔

غالب کے خلافت مقدمہ اس کتاب میں غالب کی گرفتاری اور مقدمہ کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ ۲۵ جون ۱۸۴۳ء کے حالات میں یوں آیا ہے :-

۱۷ بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب علی خان خواجہ سرا اور کئی معزز آدمی مل کر جو اٹھلتے تھے۔

۱۸ ”دہلی کا آخری سانس“ صفحہ ۱۶۔

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر (ریزیڈنٹ) کے نام سفارشی چٹھی (بہادر شاہ کی طرف سے) لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے۔ محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کھن بہادر ریزیڈنٹ کے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی ماستیں قانون سنارسز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ۲۵ جون ۱۸۵۷ء یا اس سے چند روز قبل گرفتار ہوئے۔ بہادر شاہ بادشاہ اور ان کے درباریوں کی رائے بھی یہی تھی کہ گرفتاری محض حاسدوں کی غلط اطلاع کے باعث عمل میں آئی ہے۔ اور غالب قمار بازی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ریزیڈنٹ نو سفارشی چٹھی بھیجی گئی۔ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کے حالات میں پھر اس مقدمے کا ذکر آیا ہے :-

مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید یا مشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں۔ تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر بچاس روپے زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عمر سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پر میزنی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ ابید کی جاتی ہے

کہ اگر میشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے۔ اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ کہ ایسے بالکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دیدہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ غالب کو چھ ماہ قید با مشقت کے علاوہ دو سو روپے جرمانے کی سزا دی گئی تھی۔ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید چھ ماہ کی قید کا حکم سنایا گیا تھا البتہ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ پچاس روپے دیگر مشقت معاف کرائی جاسکتی ہے۔ اقیباس کا آخری حصہ احسن الاخبار کے ایڈیٹر یا اس کے نامہ نگار کا تسموہ ہے۔ اس سے منسلک جہیل نتائج نکالے جاسکتے ہیں :-

(۱) غالب کی صحت اس زمانے میں ابھی نہ تھی اور وہ پرہیزی غذا کھاتے تھے۔
 (۲) عام خیال یہ تھا کہ سزا بہت سخت دی گئی ہے۔
 (۳) بڑے بالکمال رئیس سمجھے جاتے تھے۔ جن کی عزت و حشمت کا دیدہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

(۴) اندیشہ تھا کہ وہ اسیری کی تاب نہ لاسکیں گے۔

میر انبیل ہے کہ مشقت پچاس روپے دے کر معاف کرائی ہوگی۔ اور جرمانہ بھی یقیناً ادا کر دیا ہوگا۔

غالب کا حبسہ قید کی حالت میں غالب نے چوراسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند لکھا تھا۔ جو ان کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ لیکن عزیزوں اور دوستوں نے اسے کلیاتِ نظم

میں شامل نہ ہونے دیا۔ غالباً اس خیال سے کہ اس کی اشاعت سے غالب کی قید ہمیشہ کے لئے منظر عام پر آجائے گی۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ شاعر کی زندگی کا حاصل محض شعر ہوتا ہے۔ دنیا کو اس کے عام حالات کی اچھائی یا بُرائی سے براہ راست کیا واسطہ؟۔ اسے تو محض یہ مطلوب ہے کہ مختلف واقعات نے اس کے سانسوں میں کیا کیا نغمے پیدا کئے۔ غالب کے دوستوں اور عزیزوں کی غلط اندیشی پر تعجب ہوتا ہے کہ قید کے واقعہ کو چھپانے کے اہتمام میں انہوں نے غالب کی ایک بہترین نظم کو ضائع کرنا پسند کیا۔ کلیات نظم فارسی کے چھپ جانے کے بعد غالب نے ”سید چیں“ کے نام سے متفرق کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا تھا۔ جس میں ”حبیبہ“ بھی داخل کر دیا تھا۔ افسوس کہ ”سید چیں“ والا کلام بعد کے ایڈیشنوں میں شامل کیا نہ ہو سکا۔ میں نے یہ ترکیب بند بیان پورا درج کر دیا ہے

قید کی حالت | خراجہ عالی کا بیان اوپر درج ہو چکا ہے۔ اس میں صاف مرثوم ہے۔ کہ قید میں غالب کی حیثیت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا، کپڑا اور دوسری چیزیں ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست بے تکلف ملتے تھے۔ عام قرائن بھی اسی بیان کے مؤید ہیں۔ لیکن خود غالب نے ”حبیبہ“ میں لکھا ہے۔

شادم از قید کہ از بند معاش آزادم
از کف شکنہ رسد جامہ و نام در بند

میری رائے میں یہ محض سخن گستری ہے یا ممکن ہے ابتدائی ایام کی کیفیت یہی ہو۔ اور پچاس روپے ادا کر دینے پر مختلف سہولتیں ہم پہنچی ہوں۔

غالب کے غیر مطبوعہ اردو کلام کے سلسلے میں مختلف اصحاب نے یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جو ہیں نیچے کے ٹانگوں سے سوا ہیں

جناب نظامی بدایونی فرماتے ہیں کہ غالب اتفاقاً قید ہو گئے تھے۔ وہاں کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ اُن کو چن رہے تھے کہ ایک رئیس نے جا کر پرسش مزاج کی غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں۔ اس سے قطع نظر شعر کی شان نزول قطعاً ناقابل قبول ہے۔ اگر خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق قید میں ان کی حیثیت محض نظر بند کی تھی، یا پچاس روپے ادا کر کے مشقت معاف کرا لی گئی تھی۔ تو بے یاری و درماندگی کی یہ حالت کیوں کر قرین قیاس سمجھی جاسکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ اور ایک رئیس ملاقات کے لئے آیا تو وہ جوئیں نکال رہے تھے۔ علاوہ بریں وہ رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ وقت کے پادشاہ نے ان کی رہائی کے لئے سفارش کی تھی۔ لہذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ ہر اعتبار سے مستبعد ہے۔

”جب یہ“ سے ظاہر ہے کہ اس ابتلا میں نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفہ نے اعانت، غمخواری اور دوست نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا تھا۔ اسی وجہ سے غالب نے نواب صاحب مرحوم کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ ایسا غمخوار دوست عزاداری کے لئے موجود ہو تو مرنے کا بھی غم نہیں۔ نیز عید الفطر قد میں گزاری تھی۔ اگر چھ ماہ کی مدت جیل میں پوری ہوتی۔ تو عید الفطر بھی قید ہی میں آتی۔

۱۵ دیوان غالب مع شرح نظامی طبع ششم صفحہ ۲۱۸

۱۶ ۲۶ ص ۱۸۷ کی عید الفطر ۱۸۷۳ء اگست ۱۸۷۳ء کو تھی، اور عید الفطر ۱۸۷۴ء کو ہوئی۔ اگر یہ درست ہے کہ وہ اواخر جون میں گرفتار ہوئے تو جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینے یقینی طور پر جیل میں گزرے۔

مولانا ابوالکلام کا بیان حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کی گرفتاری کے متعلق ایک مفصل نوٹ تحریر فرمایا ہے جسے میں حضرت مدوح کے انتہائی شکر سے ساتھ یہاں سچ کر رہا ہوں۔ فرماتے ہیں،

خواجہ حالی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے "حیات جاوید" میں بھی انہوں نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ سرسید مرحوم کے آخری عہد کے تین حالات سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ "حیات جاوید" لکھنے کا خیال تک ترک کر دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ایسے کاموں پر خاک تک نہیں ڈال سکتا۔ بالآخر انہی معاملات کو پوری رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔

مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کہتے تھے کہ جب خواجہ صاحب نے سرسید کی دوش سے سخت برا شغف ہو کر حیات جاوید کی تکمیل کا خیال ترک کر دیا تو میں نے ان سے کہا تھا کہ آج آپ ایسا کہہ رہے ہیں مگر چند دنوں کے بعد یہ ساری باتیں بھلا دینی پڑیں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا جو نہی سرسید کے انتقال سے ان کے تمام نکتہ چیں دوستوں کی زبانیں خاموش ہو گئیں اور ان کی خدمات کے اعتراف و تحسین کا از سر نو غلغلہ بلند ہوا۔ خواجہ صاحب نے "حیات جاوید" کی تکمیل و ترمیم شروع کر دی اور پھر تمام معاملات کو اسی طرح رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا جس طرح وہ سمجھتے تھے کہ سوانح نگار کو بہ غرض مدحت طرازی لکھنا چاہیے۔ خواجہ صاحب نے اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ گویا کوئی بات نہ تھی محض جو سراور شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کیلئے برائے نام کچھ بازی بھی پلایا کرتے تھے۔ کو تو ال چونکہ دشمن تھا اسلئے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ حالانکہ اصلیت بالکل اسکے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا نہ نواب امیر الدین مرحوم (دالی لوارو) کے لفظوں میں

”مرزا نے اپنے مکان کو جو بازار سی کا ڈا بنار کھا تھا“

جو تفصیلات مجھے سر امیرالین مرحوم سے معلوم ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-
 غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعہ کے سچاس روپے
 تھے چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے اس لئے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے
 اس زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے
 گزراں وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا۔ گنجہ عام
 طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں
 مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک کے بعض جوہری بچے آنے
 لگے اور باقاعدہ جو بازی شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ ہے کہ صاحب مجلس رہائیوں کہا
 جاتے کہ مہتمم قمار خانہ کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے جو بھی جیتے فی صدی اتنا
 صاحب مجلس کا ہوگا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں جمنے لگیں تو وہ صاحب
 مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول ہونے لگی وہ خود بھی
 کھیلنے لگے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے اسلئے اس میں بھی کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے۔

انگریزی قانون اسے جرم قرار دیتا تھا لیکن شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں
 کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل
 کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انہیں اندر راہ تجاہل رئیسانہ آفریحوں کے ذیل میں تصور کیا
 جاتا تھا۔ عرصہ تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ تھے جن سے مرزا غالب کی رسم راہ
 رہتی تھی۔ اسلئے انکے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا۔ نہ قانونی اقدام کا اندیشہ تھا۔ انہی
 میں ایک کوتوال قبیل کے شاگرد مرزا خانی بھی تھے جنکی نسبت خواجہ نصیر نے کہا ہے :-

”حضرت مولانا فرات نے مرزا خانی پھر لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے میرے عزیز دوست مرزا محمد عسکری لکھنؤی، انہی کے پوتے ہیں جنہاں“

کے بیان کے مطابق انہی مرزا خانی اور مولوی فضل سی خیر آبادی نے غالب کے اردو دیوان کا انتخاب کیا تھا۔

کرنے لگے کہ میرزا کے عزیز و قریب تصور کئے جائیں۔ اس باب میں لوہار و خاندان کا جو طرز عمل رہا وہ نہایت افسوسناک تھا۔ میں نے نواب امیر الدین مرحوم سے اشارۃً تذکرہ کر کے ٹوٹنا چاہا تو ان کے جوابات سے بھی اس کی پوری تصدیق ہو گئی۔

اس خاندان کا کوئی فروغ نہ تھا اس زمانے میں میرزا سے ملا اور نہ کسی طرح کی اعانت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب آگرہ کے ایک اخبار نے میرزا کا ذکر کرتے ہوئے انہیں خاندان لوہار و کا رشتہ دار ظاہر کیا تو یہ بات ان لوگوں پر بہت شاق گزری اور بہ اہتمام و تکلف اس کی تخلیط کرائی۔ یہ لکھوا یا گیا کہ میرزا صاحب سے خاندان لوہار و کا کوئی نسب تعلق نہیں محض دور کا سببی تعلق ہے۔

نواب ضیاء الدین پٹھان کو جس درجہ ناز و تہادہ ان کے قصیدہ سے ظاہر ہے،

منہ خزانہ زینہ زار و درخسہ منہ زار ضیاء الدین محمد نہیں براور من

اگرچہ دوست اسطو و من ندا طویم بود بہ پایہ اسطو و من سکند من

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور اسے کسر شان سمجھا کہ قید خانہ میں ایک اسیر جرم سے ملنے جائیں!

لیکن بے مہری و حق فراموشی کے اس عام منظر میں صرف ایک شخص کا پہرہ درخشندہ نظر آتا ہے یعنی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ خواجہ حالی مرحوم کہتے تھے جو نبی اس واقعہ کی خبر ملی فوراً ایک ایک حاکم سے جا کر ملے اور میرزا کی رہائی کے لئے پیہم کوششیں کیں۔ پھر مقدمہ چلا اور اس کی اپیل کی گئی تو تمام مصارف اپنے پاس سے ادا کئے۔ جب تک میرزا قید میں رہے ان کا معمول تھا کہ ہر دوسرے دن سوار ہو کر قید خانے میں جانا اور میرزا سے ملاقات کرنی۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے ”مجھے میرزا سے محبت ان کے زبد و اتقائی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی جوئے کا الزام آج ماں ہوا مگر شراب پینا تو ہمیشہ سے معلوم ہے۔ پھر اس الزام و گرفتاری کی وجہ

سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے؟ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال
ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا!

مرزا کے ترکیب بند کا آخری بند دوستوں کی بے مہربانی اور طوطا چشموں کا
نہایت لطیف پیرایہ میں افسانہ سناتا ہے،

روز سے از مہر نہ گفتید فلانے چوں است

بارے از لطف بگوئید چسا نید ہر

مصطفیٰ خاں شیفتہ کی اس سچی دوست نوازی کا مرزا غالب کے دل پر جو اثر پڑا
ہو گا وہ ان کے ترکیب بند سے ظاہر ہے۔ غدر کی گرفتاری کے بعد جب شیفتہ رہا
ہوئے تو مرزا غالب اپنا جوش محبت ضبط نہ کر سکے اور ڈاک کی سواری میں میرٹھ باکر
ان سے ملاقات کی۔ ان کی ریائی کے لئے بھی جس قدر کوشش کر سکتے تھے کرتے رہے۔
جب معلوم ہوا کہ مومن علی خاں صدر الصدور کو اس مقدمہ کے فیصلہ میں دخل ہے اور وہ
صدیق حسن خاں کے دوست ہیں تو بھوپال خط لکھ کر صدر الصدور کے نام خط منگوایا اور
شیفتہ کو ایک خاص معتمد کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اب صدیق حسن خاں نے فارسی کی چند نثریں مرزا غالب سے
پڑھی تھیں اس لئے مرزا کے خط کو استاد کا خط سمجھ کر بلا تاویل تعمیل کی۔ وہ خود بھی شیفتہ سے واقف تھے۔

آخر میں "حبسیہ" پر میں اس باب کو ختم کرتا ہوں،

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم	غم دل پر وہ درمی کرد فغاں ساز کنم
بہ نواسے کہ ز مضرب چکاند خون تاب	خویشین را بہ سخن ز مزمزہ پرداز کنم
در خرابی بہ جہاں میکہ بنیاد نہم	در اسیری بہ سخن دعویٰ اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید بہ شعر آویزم	روز کے چند رسن تابانی آواز کنم
چوں سراپیم سخن انصاف نہ مجرم خواہم	چوں نو لیم غزل اندیشہ ز غماز کنم
تا چہ افسوں بہ خود از ہیبت عیاد دہم	تا چہ خون و جگر از حسرت پرواز کنم

یار دیرینه قدم رنج مفر ما کای نچس
 آں ز گنج که تو در کوبی و من باز کنم
 با سزای طالع که بمن گرد باز
 با خرد شکوه گرا از طالع تا ساز کنم
 اہل زنداں بہ سرو چشم خودم جادادند
 تا بدیں صدر نشینی چه قدر ناز کنم
 بلہ زنداں گرفتار و فانیست بہ شہر
 خویشتن را بہ شتا ہمدم و ہمراز کنم
 من گرفتارم و این اترہ دوزخ تن زن
 در سخن پیروی شیوہ ایجاز کنم

گر چه توفیق گرفتاری جادیدم نیست
 لیکن از دہر گر خوش ولی امیدم نیست

شمع ہر چند بہ ہر زاویہ آساں سوزد
 خوشتر آن است کہ بر قطع در ایوان سوزد
 عود من ہرزہ سوزید و گریختنی است
 بگزارید کہ در مجلس سلطان سوزد
 خانہ ام ز آتش پیدا و مدو سوخت دیلغ
 سوختن داشت ز شمع کہ شبستان سوزد
 منم آن سوختہ کہ گریز خم بگر بنایم
 بر من از ہر دل گبر و مسلمان سوزد
 منم آن قیس کہ گرسوے من آید یساک
 تحمل از شعلہ آواز حدی خواں سوزد
 تا چسانم گزرو روز بہ شہماور یاب
 از چہ لعلی کہ عیس بر در زنداں سوزد
 تنم از بند در انبوہ رقیباں لرزد
 از غم دیدہ من فتنہ طوفان خیزد
 آہ زیں خانہ کہ روشن نشود در شب تار
 از غم دیدہ من فتنہ طوفان خیزد
 آہ زیں خانہ کہ دروے نتوان یافت ہوا
 جز سموے کہ خس و خوار بیاباں سوزد

اے کہ در زاویہ شبہا بہ چہرا غم شمری

دلہم از سیدہ بردن آر کہ داغ غم شمری

پاسبانان نہم آئید کہ من مے آیم
 در زنداں بکشتائید کہ من مے آیم
 ہر کہ دیدے بہ در خویش سپاسم گفتے
 خیر مقدم بہ سرا آید کہ من مے آیم

جاده نشاسم و زانوه شامے ترسم
 رہرو جادۂ تسلیم درشتی نکند
 نشت تن در ره و تعذیب ضرور است اینجا
 عارض خاک بہ پاشیدن خون تازہ کنید
 چوں من آیم بہ شامکوة گردون نہ روست
 ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید
 تا بہ دروازہ زنداں پتہ آوردن من
 چوں سخن بچی و فرزانگی آئین من است
 بخود از شوق بہ بالید کہ خود باز روید
 راہم از دور نمایند کہ من مے آیم
 سخت گیرندہ چہر ائید کہ من مے آیم
 نیک آید و بہ سائید کہ من مے آیم
 رونق خانہ فستائید کہ من مے آیم
 زیر سپاس شایہ مخائید کہ من مے آیم
 بخت خوراہ ستائید کہ من مے آیم
 قدمے رنجہ نمایند کہ من مے آیم
 بہرہ از من بہر بایید کہ من مے آیم
 بہ من از مہر گرایید کہ من مے آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بد نامی من

غیر نشگفت خورد گر غم ناکامی من

آنچہ فردا است ہم امروز در آمد گوئی
 دل و دستے کہ مرا بود فرو ماند ز کار
 سرگزشتہ ہمہ رنج و المہ آرد گفتی
 بہرہ اہل جہاں چوں بہاں رو غم است
 خستن و بختن من غم نیست برو
 ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع
 غم دل داشتہ اینک غم جانم داوند
 چرخ یک مرد گر نمایہ بہ زنداں خوابد
 مرفہ امشب ز کجایں ہمہ خوباب آورو
 خود چہر خون خورم از غم کہ بہ غمخواری من
 آفتاب از بہت قبلہ بر آمد گوئی
 شب و روزے کہ مرا بود سر آمد گوئی
 سر نوشتہ ہمہ خوف و خطر آمد گوئی
 بہرہ من ز بہاں بیش تر آمد گوئی
 بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوئی
 خستگی غانہ روے بہر آمد گوئی
 زخم راز ختم دگر بر اثر آمد گوئی
 یوسف از قید زلیخا بد آمد گوئی
 ایں چنین گرم ز زخم جگر آمد گوئی
 رخت بق بہ لباس بشر آمد گوئی

خواجہ بہت دیر شہر کے پیش میں سے پایہ خویش تنم در نظر آمد گوی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است

گر بہ میرم چه غم از مرگ خزاوار من است

خواجہ دانم کہ بسے روز نہ مانم در بند
نہ پسندم کہ کس آید، نتوانم کہ روم
خستہ ام خستہ من دعوی تمکین حاشا
شادم از بند کہ از بند معاش از ادم
آمد و جامہ بیارید و بحسل بنویسد
یارب ای گوہر معنی کہ فشانم ز کجاست
ہر کس از بند گراں نالد و ناکس کہ منم
خوے خوش بہر صیبت زدہ بچ و گرا
رفتہ در بار کا من علم کہ باد و دیغ
اگر این است خود آن است کہ عید افی
مدت قید اگر در نظر من بہت چرا
خون دل از مژہ بے صرفہ چکانم در بند

نیستم طفل کہ در بند رہائی باشم

ہم نہ ذوق است کہ در سلسلہ خالی باشم

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ تنگم نبود
چہ کنم چون بہ قضا نہ ہرہ جنگم نبود
زیں دورنگ آمدہ صد رنگ خرابی بہ ظہور
گلہ نیست کہ از بخت و درنگم نبود

سلسلہ نواب مصطفیٰ علی شیعہ نے قید کے رہانے میں دوستی کا حق بہ طریق حسن و ایک تمنا یہ اور اس سے پہلے دو شعر

نواب صلیب کی سچی اور مخلصانہ دوستی کا ایسا وثیقہ ہیں جو اس وقت تک قائم رہے گا جب تک غالب کا قلم دنیا میں موجود رہے گا

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست
 زدم از خوف دین حجره که از خشت و گل است
 زین دوسر سنگ که پویند بهم می ترسم
 منم آئینه و این حادثه رنگ است
 آه از آن دم که سرایند ز زندان آمد
 بهار ما دارم امید ربانی در بند
 جور اعدا و دزدان به ربانی لیکن
 حاشا که درین سلسله باشم خوشنود
 به مرید تسلیم خویش بود مستی من
 اندرین بند گراں بین و سبک سستی من

همدماں در دلم از دیده نهانیدم
 لشکر احمد که در عیش و نشاط طبعم
 هم در آئین نظر سحر طرازیدم
 چشم بد و دور که فرخنده نقایدم
 سود بینا و وقادیده و نوریدم
 من بخون خفته و بهنجم همه بجهنمیدم
 در میان ضالان مهر و وفای بود است
 روزی از من نیفتید قتلای چون است
 گر نیا شوم به جهاں خار و خنجر
 چاره گزنتوان کرد علی کافی است
 هفت بند است که در بند رقم سازیدم
 غالب غم زده را روح و روانیدم
 لشکر که با شوکت و شانیدم
 هم در استیلایم سخن شاه نشانیدم
 شاد باشید که فرخ کهرانیدم
 زنده مانید صفا قالب و جانیدم
 من جگر خسته و دلم همه دانیدم
 من برینم که بر آئینه بر آیدم
 بار است از لطف بگوئید چنانیدم
 اے که سر و دامن باغ جهانیدم
 داغ اگر نیست خداوند زبانیدم
 بنویسید و به بگیرد بخوانیدم

آں نہ باشم کہ یہ ہر بزمِ زمن یاد آرید
دارم اُمید کہ در بزمِ سخن یاد آرید

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :-

۱۹۳۲ء میں جب میں دہلی سنٹرل میں اسیر تھا تو مجھے ایک دن خیال ہوا کہ
کیا مرزا غالب اسی قید خانے میں رکھے گئے تھے؟ آصف علی صاحب اس کا ذکر
کیا تو انہوں نے کہا کہ غدر سے پہلے بھی قید خانہ یہی تھا۔ یقیناً اسی معاملے کے کسی حصہ
میں اسیر رہے ہوں گے۔

بعد کو تفتیش کی تو معلوم ہوا یہاں پہلے بھولی بھٹیاری کی سرائے تھی۔ بھٹیاری
کو بعض تو "بھٹیاری" ہی سمجھتے ہیں بعض "بختیاری" کی تحریب سمجھتے ہیں۔ فتح دہلی کے
بعد انگریزی حکومت نے سراسر کو قید خانہ بنا دیا اور پھر مزید عمارتوں کا اضافہ ہوتا رہا
اسطیٰ عارف ہجیم لوگوں کو دہی گئی تھی واقعی قدیم طرز کی معلوم ہوتی ہے اور ٹھیک ٹھیک
سرائے کی طرح ہے۔ غدر سے پہلے اس کے سوا کوئی قید خانہ نہ تھا۔ اس لئے تمام
قیدی یہیں رکھے جاتے ہوں گے اور مرزا غالب نے یہیں کہا ہو گا کہ :-

ہل و زدا ان گرفتار و قایت شہر
خویشتن را بہ شمس اہدم و ہراز کنم

۱۵ غالب نے ترکیب بند میں صرف یہ تفصیل بیان کی ہے کہ جس کو تھری ہیں انہیں رکھا گیا تھا۔ وہ
"خشت و گل" سے بنی ہوئی تھی۔ نیز سامنے دو سیاہی پہرہ دیتے تھے :-

لزم از خربت دریں مجرہ کہ از خشت و گل است ورنہ دروں خدرا ز کام نہت گم نبود

نہیں دوسرے رنگ کہ پویند بہم سے ترسم
یہیے از شیر و ہراس ز پلست گم نبود

نواں باب

مالی حالات، مدح گوئی اور صلہ یابی

گفتنی یہ ہے کہ بر غالب نامہ چہ وقت
مے تو اں گفت کہ این بند خداوندہ شایستہ

غالب کی زندگی مالی مشکلات کی پریشانی و در ماندگی کے جس ماحول و محنت میں گزری
اس کا صحیح نقشہ اوپر کا شعر پیش کر رہا ہے اس غمخوار کو وہ اردو میں یوں لکھتے ہیں :-

زندگی اپنی جیب اس شکل سے نرسی غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہ بڑے خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ باپ اور چچا کا سایہ کسٹی ہی میں
ان کے سر سے اٹھ گیا۔ فطرۃ لا ابالی تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت کی سیہ مستیوں
اور فانیع البالی کی سرخوشیوں نے انہیں مدد و مسرت و غیر محتاط بنا دیا۔ جب
دولت و ثروت کے جمع شدہ ذخیرے ختم ہو گئے، تو اپنی روش بدلنے کے بجائے
بڑھے ہوئے مصارف کی تکمیل کے لئے بے تکلف قرض لینے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ

اسراف ان کی فطرت کا جزو بن گیا۔ شراب کی عادت ایسی پڑی کہ آخری دم تک نہ چھوٹی۔ ذاتی آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے۔ لیکن جمع شدہ دولت نے ابتدا میں وسائل کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ تب تنگ ہوئے تو پنشن پوری نہ ملنے کی جانب خیال منتقل ہو گیا۔ اور مقدمہ کا سلسلہ جاری کیا جو ۱۸۶۲ء سے شروع ہو کر قریباً ۱۸۸۴ء تک قائم رہا۔ اس سلسلے میں مسلسل امیر لگی رہی۔ کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا اور بقائے نام بہت سارے پیسے ایک نشست ملے گا۔ ادھر سے مایوسی ہوئی۔ تو حکومت انگلیشیہ کی طرف سے نئے صلے کی توقع پیدا ہو گئی۔ جس میں وہ قدر تک اُچھے رہے۔ بہ ہر حال مختلف توقعات کی بنیاد پر قرض لیتے رہے اور آمدنی کا بیشتر حصہ سود میں ضائع کرتے رہے۔ دوسری وجہ یہ پیدا ہوئی کہ ان کے لئے کنسائش کے بستے دینے آتے رہے یا تو ان میں ناہمی ہوئی یا اگر وہ مہیا ہی ہوئی تو وسیلے زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے۔ اس لئے اپنی زندگی کے متعلق غالب کے نظریہ میں ڈنٹی اور امید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہی تھی۔

یاس کی نیرنگی | صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں آمدنی کے مختلف وسائل کا حال بتاتے ہوئے پہلے خاندانی پنشن اور اس کے لئے مقدمے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں :-

بعد ایک زمانے کے پادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اس کے بعد بعد چار سو روپے سال کی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واعد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکارت بہ صلہ ۷۰ گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں۔ مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دہلی بس ہیں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دیکر گڑھی ایسے طالع مری کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں مردالی دکن کی طرف رجوع کران یا درہم یا مندرست

مرجائیگا۔ یا معزول ہو جائیگا یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی رایگان
جائیگی۔ اور وہاں شہر محکمہ کو کچھ نہ دے گا۔ اور اجیانہ اگر اس نے کم سوک کیا تو ریاست خاک ہیں
ہل جائیگی۔ اور ملک ہیں گدھے کے ہیں پھر تائیں گے۔

غالب کی کم نصیبی | تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دہلی یا قنوج کے لئے
ہر اس مقام پر کوشش کی جس سے کہ میانی کی کچھ بھی امید نہ تھی۔ ایسے
لوگوں کے قصیدے لکھے جو اگرچہ زبان سے بہت تھے۔ یا بڑے بڑے سرکاری
عہدے دار تھے۔ یہیں غالب جیسے زوردار شاعر کے ہر دم مدوح نہ تھے۔
ان قصیدوں کے صحیح مخاطب سبھراکبر جہانگیرا منشا جہان اور خانخاناں جیسے لوگ
تھے۔ لیکن منخوروں کی پابہ شناسی اور قدر دانی کا یہ زریں دور غالب سے بہت
پہلے گزر چکا تھا۔ خانخاناں اور ذوالفقار خاں کی جاگڑا کاہنڈا، امین بڑا، مارڈنگ اور
کیننگ نے لے لی تھی۔ اور غالب کو، حجاج سے بیور ہو کر انہی کا رخ کرنا پڑا لیکن
ان فرمایہ چشموں سے اس بلا نوش کی پیاس کیا بجھ سکتی تھی۔ انہیں زندگی میں سکون
اور فردیات سے فرائع میسر نہ آیا۔ اپنے عہد کی خیر و برائی اور جو ہر نا شناسی کے متعلق
جو درد، نگیز خیالات جا بجا ظاہر کئے ہیں۔ ان کو نفس کشی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ واقعات
و حقائق ہیں۔ روزگار کی ستم پوشی اور جہا آرائی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ جو شخص
قصائد میں عرفی کا، ہمسرا و غزل میں فیضی کا ہم پد تھا۔ جو مثنوی میں فارسی کے
بہترین مثنوی نگاروں سے ٹکر کھاتا تھا۔ حریر و جلیقہ میں مہر نیلام، وریحانی استرآبادی
سے کم نہ تھا۔ اور نثر میں ابوالفضل اور ظہوری سے نہ ہوتا تھا۔ اسے تہذیب و سلیقہ کی عمر میں
ایک خانخاناں یا ایک ذوالفقار خاں بھی نہ مل سکتا۔ سلطنت نے ذوق کو "خاقانی ہند"
بنا دیا۔ اور ان کے لئے ایک مہم جوئی تجواہ اور جائیداد مقرر کر دی۔ لیکن غالب کو یہ سلطنت
صرف پچاس روپے ماہوار دے گی۔ اور یہ کو "رستم نگاری کی مزد تھی جس سے زیادہ

قیمت آج غالب کا ایک غیر مطبوعہ اُردو خط پاکستان ہے اور جس سے چار گنا قیمت پر ہمارے زمانے میں اُردو دیوان غالب کے مصوٰر ایڈیشن کا ایک ایک نسخہ باب چکا ہے۔ مشہور ہے کہ عرفی نے عائشاناں کی مدح میں ترستھ شعر کا قصیدہ کہا تھا۔ جس کا مطلع یہ تھا:-

اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را

وے ساختہ آرائش ہم فصل و کرم را

دریاد دل اور قدر شناس عائشاناں نے ترستھ ہزار روپیہ دیا۔ غالب نے اسی زمین میں وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک کی مدح میں اُنہتر شعر کا قصیدہ کہا۔ جو عرفی کے قصیدے سے کسی حالت میں بھی کہ پایہ نہیں۔ لیکن غالب کو ٹونک سے غالباً اُنہتر سو روپے بھی نہ ملے۔

مشہور ہے کہ ناصر علی سرہندی نے ذوالفقار خاں کی خدمت میں ایک مختصر سی مدحیہ غزل پیش کی تھی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

اے ثابن حیدری ز جبین تو آشکار

نام تو در نبر و کند کار ذوالفقار

ذوالفقار خاں نے صرت مطلع سُن کر روک دیا اور کہا کہ مجھ میں مزید اشعار کا صلہ دینے کی قدرت نہیں۔ ناصر علی کو جو کچھ ملا۔ وہیں فقرا میں بانٹ دیا اور یہ مقطع پڑھتا ہوا غالی اُتار پٹا آیا:

ناصر علی تراز تو خواہ مراد و بس

اے ابر فیض بر ہمہ عالم گہر یبار

غالب نے اس زمین میں راجہ شیو و صحیان سنگھ والی الور کی مدح میں چالیس شعر کا قصیدہ لکھا۔ ریاست الور کی خدمت میں غالب کے والد نے جان قربان

کی تھی۔ اور راجہ شیو دھیان سنگھ غالب کے قدردان بھی تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ الور سے غالب کو اس کا بیسواں حصہ بھی ملا۔ جتنا ذوالفقار خاں نے ایک شعر کے صلہ میں ناصر علی کو دے ڈالا تھا۔ ناصر علی اپنا صلہ فقرا میں بانٹ آیا۔ لیکن غالب کی زبان کو اس تشکوے سے فرائع نصیب نہ ہوا:

نہ بخشندہ شاہ ہے کہ بارم دہد بہ ہر بار زر پیل بارم دہد

کہ تا پیل زانچہ برا نگیزم

ز رش برگدایاں فروریزم

یہ ہر حال غالب کی مالی مشکلات کی داستان بڑی ہی درد انگیز ہے اور اس جیسے نازک دل اور نازک دماغ شاعر پر ان مشکلات کے انبوہ میں جو قیامت گزرتی ہوگی۔ اس کا صحیح اندازہ آج کون کر سکتا ہے۔

دہلی کی ابتدائی زندگی غالب جب دہلی آئے۔ تو ان کی مالی حالت یقیناً اچھی ہوگی۔ نواب الہی بخش خاں معروف اور نواب احمد بخش خاں زندہ تھے۔ ان کی موجودگی میں غالب کو کوئی مالی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔ معتمد آمدنی کے دوسرے وسائل بھی موجود تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی قرض لیتے تھے۔ نواب علار الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

بھائی دین الدین احمد خاں والی (ہارو) سے کہنا صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر منتھرا اس سے قرض لیا ادھر زبانی مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چہین سکھ کی کوئی ٹوٹی۔ ہر ایک کے پاس تنک مہری موجود، شہد لگاؤ چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل چھو بھی کے سر بایں ہمہ کبھی خان نے غالباً خان سے مراد نواب احمد بخش خاں ہیں) کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگے سے کچھ بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے

سور و پے رام پور۔

تنگدستی کے بیان کے اپنی تنگ دستی اور مصائب و آلام کے ہجوم کو نئے نئے
نئے نئے اسلوب اسلوب اور نئے نئے عنوانوں سے بیان کرتے ہیں۔
پھر بھی نہیں تھکتے۔ گویا یہ موضوع ان کے فکر و تخیل پر بہ طور خاص حاوی تھا۔
ایک خط میں لکھتے ہیں :

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ اپنا آپ تماشاں میں گیا ہوں۔ رنج و دلت سے
خوش ہونا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے جو دکھ مجھ پہنچتا ہے، کہتا ہوں
کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اترانا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں اور فارسی داں
ہوں، آج دُور دور تک یہ جواب نہیں۔ لے اب قرضہ اردوں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے
کہ غالب کیا مرا بڑا مر دھرا بڑا اندرا بڑا کافر مرا، ہم نے ازردہ عظیم جیسا پاشا ہوں کہ
لوگوں نے "جنت آرا سگاہ" اور عرش نشین خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ
قلم و سخن جانتا تھا، "مستمقر" اور "ہادیہ زادہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدین پادشہ
ایک قرضخواہ کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضخواہ بھوک سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں
"اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اور علان صاحب! آپ سلجوقی و اتراسیابی
ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو۔ یہی ہے کچھ تو اکیسویں صدی کے بڑے بڑے کیا بے حیا، بے عزت کوٹھی سے
شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فردش سے آم، مرث سے دام قرض لے
باتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا، ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔

خاندانی پیش | غالب کی جو آمدنی ابتدا سے آخر تک مستقل طور پر قائم رہی وہ خاندانی پیش تھی۔
ریاست فیروز پور جبر کہ کی ضلعی کے بعد یہ سرکار انگریزی کے خزانے سے متعلق ہو گئی تھی
اس کی مقدار سات سو پچاس روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ تھی۔ اس کے ملنے
میں مرث دو مرتبہ عارضی غل پیدا ہوا۔ ایک مرتبہ نواب شمس الدین احمد خاں کے ساتھ جھگڑے

کے دوران میں دوسری مرتبہ غدر کے آغاز سے لے کر باغیوں کی اعانت کے الزام سے غالب کے ممبر اثابت ہونے تک۔ لیکن دونوں مرتبہ جمع شدہ روپیہ مل گیا۔

قلعہ کی ملازمت | شاہ وہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ۱۸۵۰ء میں غالب کو تیموری خاندانی کی تاریخ لکھنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور نجم الدولہ و بیر الملک نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی تھی یہ تنخواہ آغاز جولائی ۱۸۵۰ء سے لے کر آخر اپریل ۱۸۵۱ء تک ملتی رہی۔ حکیم احسن اللہ خاں جمع و تحقیق حالات پر مامور تھے جو کچھ لکھ کر حوالے کر دیتے۔ غالب اس کو بہار آفریں نشر کا جامہ پہنا دیتے ۱۸۵۲ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتداء سے آفرینش سے بیکر ہمایوں پادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا، مکمل ہوا۔ اس کا نام ”مہر نیمروز“ تھا۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی۔ اس کا نام غالب نے ”ماہ نیم ماہ“ رکھا تھا۔ لیکن یہ حصہ شروع ہوا اور غدر کی آگ بجھڑک اٹھی جس نے تیموری خاندان کے رخت وجود ہی کو راکھ بنا ڈالا۔

غدر ارمی ۱۸۵۴ء کو ہوا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ قلعہ سے آخری تنخواہ اپریل ۱۸۵۴ء کی ملی ہوگی۔

ملازمت سے پیشتر کا تعلق | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ملازمت سے قبل بھی غالب قلعہ میں آتے جاتے تھے۔ مختلف تقریبات پر بادشاہ کی خدمت میں قصیدے گزراستے تھے اور خلعت پاتے تھے۔ اس کی تائید غالب کے کلیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے۔ جن کا انتقال ۱۸۳۷ء میں یعنی قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے سے تیرہ برس

پیشتر ہوا۔ بہادر شاہ ثانی کی مدت میں غالب کے فارسی کلام میں دو ٹنڈیاں
ایک ترکیب بند اور پندرہ قصیدے ہیں۔ نیز اردو میں دو قصیدے اور
چند چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قلعہ کے ساتھ
ملازمت سے پہلے بھی روابط قائم تھے۔ لیکن یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ قصائد کا سلسلہ
کیا ملتاریا اور خلعت کی حیثیت کیا تھی۔

شش ماہہ تنخواہ کا حکم | قلعہ والی تنخواہ میں غالب کے لئے صرف ایک مرتبہ ناگوار صورت
پیدا ہوئی۔ یعنی یہ حکم ہو گیا تھا کہ ملازمین قلعہ کو ماہ بہ ماہ کے بجائے چھ ماہ کی کٹھی
تنخواہ ملا کر رہیں۔ غالب کی پوری زندگی مختلف النوع مالی احتیاجات میں بسر ہو رہی
تھی۔ وہ اپنے کسی ذریعہ معیشت میں ذرا سا توقف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
اس لئے شش ماہہ تنخواہ کا حکم بڑی معیشت کا پیش خیمہ نظر آیا۔ ناچار اس سے مستثنا
کئے جانے کے متعلق اردو میں ایک قطعہ لکھ کر بادشاہ کی بارگاہ میں گزارنا جس میں
اپنی ضروریات و مشکلات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا فرماتے ہیں :

مری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجر
رسمت مڑے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بے قید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

سے مولانا ابوالکلام آزاد دہلی میں رہتے ہوئے صرف ایک مرتبہ ایک مرتبہ حالات نے ایسی شکل اختیار کی کہ حضرت
منظوم لکھنی پڑی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس زمانے میں قلعہ و تنخواہ میں ماہر و برآمدی مل جاتا کرتی تھیں
تنخواہ کے تقرب سے کہیں زیادہ مشکل اس کا ماہ بہ ماہ وصول کرنا تھا۔ تقریباً دو ماہ تاخیر سے ماہ بہ ماہ کی رقم چھوڑ
جاتی تو خیر یہ درگاہ دو ماہ کی تنخواہ کے کرپے میں ماہوں کے فرقے کے تصفیہ کی رسید دے دینا اور اس
پر ہزر و شکرت و منت اسے غیبت سمجھ کر رسید دے دیتا۔

بسکہ پیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
 مری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے نہ کہ سا ہو کار
 آخر میں لکھتے ہیں :

مری تنخواہ کچھ ماہ بہ ماہ تانہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
 اس پر غالب کے لئے ماہ بہ ماہ تنخواہ کا حکم جاری ہو گیا بادشاہ کی طرف سے
 پچاس روپے ماہانہ کے علاوہ شہزادہ فتح الملک کی طرف سے بھی چار سو روپے سالانہ
 تنخواہ ملتی تھی لیکن شہزادہ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ نو و غالب
 فرماتے ہیں کہ دو برس سے زائد فائدہ نہ اٹھا سکے۔

راہ پور کا ذیلیف | غالب کی زندگی کے آخری دس برس میں انہیں راہ پور سے دوپٹے
 ماہانہ مستقل طور پر ملتا رہا۔ فرمانروایان راہ پور کے خانہ بن کے ساتھ غالب کے
 تعلقات اسی زمانہ میں قائم ہو گئے تھے۔ جب نواب سید محمد خان خلع نواب
 سید فضل محمد خان ریاست میں داخل ہوئے تو ان کے باعث دہلی چلائے گئے۔ ان کے
 ہمراہ تھے نواب سید محمد سعید خان جو سنہ ۱۸۳۶ء میں مسند نشین ریاست ہوئے۔ نواب
 سید محمد فضل خان جو بہتر تھے اور راجہ درجن گئے تھے اور نواب سید محمد علی خان نواب
 سید محمد سعید خان کے فرزند نواب سید محمد علی خان فوداں گان تھے جو سنہ ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے
 سنہ ۱۸۲۰ء میں فوداں گان کے فرزند نواب سید محمد علی خان فوداں گان کے فرزند نواب سید محمد علی خان
 کے انتقال پر جون سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد وہ محمد بنے۔ وہ حالت کے ساگر تھے۔ بہرہ پور کی نئے حکم سے تھانہ میں بیع ہوئی
 تھی۔ ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۵۰ء کو وفات پائی بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ انہیں دس روپے دیا گیا۔

۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو انہیں غارت جہاز مرزا جاہت پوری بھیک کی تو ترہاں دل کھانے بہت مہر کی اور
 کمزوری بڑھتی گئی بلکہ جس وقت حال کو بلا پایا۔ انہوں نے سنجہ بھیر کر کے بادشاہ کو اطلاع دی ۱۲ جولائی کی شام کو
 ان پر نیم بے ہوشی کی محبت طاری ہوئی۔ صبح کے قریب انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین پور کی ہوئی۔

اور ۱۸۵۵ء میں عنان حکومت سنبھالی۔ قیام دہلی کے دوران میں انہوں نے مفتی صدر الدین آزادہ مرحوم مولانا فضل حق خیر آبادی اور غالبؔ عربی اور فارسی پڑھی تھی ۱۸۵۵ء میں غالبؔ نے پرانے دوستانہ روابط کی بنا پر قطعہ جلوس نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں بھیجا لیکن اسکا کوئی جواب نہ آیا۔ ۲۸ جنوری ۱۸۵۶ء کو مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک پر ایک قصیدہ مع عرضداشت بھیجا جس کا مطلع یہ ہے۔

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم

بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

یہ عرضداشت اور قصیدہ پہنچنے کے ساتھ ہی نواب یوسف علی خاں نے شاعری میں غالبؔ کی شاگردی اختیار کر لی اور ڈھائی سو روپے کی رقم شیرینی کے طور پر بھیج دی۔ غالبؔ نواب صاحب استاد کی تلاش میں تھے مولانا فضل حق خیر آبادی نے غالبؔ کا نام پیش کیا۔ اس کے ساتھ غالبؔ کو قصیدہ اور عرضداشت کیلئے لکھا۔ اس طرح دیرینہ روابط تازہ ہو گئے۔ نواب یوسف علی خاں اشعار کے ساتھ وقتاً فوقتاً روپیہ بھی بھیج دیتے تھے۔ غالبؔ لکھتے ہیں،

۱۸۵۶ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پورؔ میرے آشنائے قدیم ہیں۔ میرے

شاگرد ہوئے ناظم ان کو خلص دیا گیا بیس پچیس غریب اردو کی بھیجتے ہیں اصلاح دیکر

بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا

ان کے عطایا یعنی نواب کے عطایا، فتوح گئے جاتے تھے جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں

۱۸۵۵ء میں ۱۸۵۵ء میں درج ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ نقل و کتابت کی غلطی ہے۔

غالبؔ کے مجموعہ مکاتیب رام پور سے ثابت ہو چکا ہے کہ نواب یوسف علی خاں ۱۸۵۶ء

میں شاگرد ہوئے۔

تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔

مستقل تنخواہ کا مطالبہ | غدر کے بعد جب قلعہ کی تنخواہ بند ہو گئی، خاندانی پنشن استوا میں پڑ گئی اور غالب کی مصیبتوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو نواب یوسف علی خاں نے مستقل طور پر دوسو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔

نواب یوسف علی خاں غالب کو وظیفہ خوار نہیں بلکہ ایک گراں مایہ دوست سمجھتے تھے۔ غالب نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں تک کہ وظیفہ کی بندھی اپنے خط میں رکھ کر بھیجتے اور کبھی اس کی رسید طلب نہ فرمائی۔ ایک موقع پر نواب مرحوم کی طرف سے خط و کتابت میں توقف ہوا تو غالب نے تخافل کے شکوہ میں ایک بدیع قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل	دائم کہ تو دریائی و من سبزہ حاصل
در باد یہ بر گور غریباں ز چہ سوزد	آں شمع فروزاں کہ بود در خور محفل
زاں خسرو و خواباں چہ قدر چشم و قابود	صد حیف کہ شد نقش امیدم ہمہ باطل
افسانہ بنم گم بسیر ایم نبود عیب	بادوست کہ پیوستہ ہمے بود غم از دل
مے گویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن	چوں مے ندبد واد ز فریاد چہ حاصل

یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من بر بستہ بہ رویم در در سال رسائل

چون است کہ گاہے نہ کنی روئے بدیں سوعے	چون است کہ ہرگز نہ وہی گدیہ بہ رسائل
گر جاں دہم ز غصہ تو دانی کہ بہ گیتی	حرفے غلط از صفحہ ہستی شدہ رسائل
خواہی کہ مرا بنگری از دور بہ فرماے	تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل
غالب بہ سخن نام من آمد از دل آورد	دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی جاہل

درفن سخن دم مزین از عرفی و طائب
 این آئین خاص است کہ بر من شدہ نازل
 من گنجد و گرد دل بہ گل نہ دودہ درم
 مے ہیں در گنج ارچہ کشودن شدہ شکل
 خود در خورد ویرانہ بود گنج گراں مند
 غم نیست گر آبادی دہلی شدہ زائل
 یاروت فسون نفس گرم چہ داند
 اعجاز زدہ دہلی بود و سحر ز بابل

اس کے بعد توقع بریلی کی مبارک باد دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ
 میں مفتی یا قاضی یا شجہ یا عامل کے غور سے کا طلبگار نہیں بلکہ صرف یہ چاہتا
 ہوں کہ میرا حصہ مجھے ہر سال پہنچتا رہے ۔

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد ان کے بہن پروردار قدر شناس جانشین
 نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی یہ وظیفہ بہ دستور قائم رکھا ۔
 متفرق عطایا اس کے علاوہ بھی نواب یوسف علی خاں وقتاً فوقتاً متفرق رقمیں
 بھیجتے رہتے تھے ۔ غالب ۱۸۶۵ء کے ایک مکتوب میں سیف الحق میاں خاں
 صاحب سیاح کر لکھتے ہیں :

ایک قرن سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں دہلی رام پور بہتہ اشعار میرے پاس بھیجتے تھے
 اور سو روپیہ ہبیدہ ماہ بہ ماہ پر سبیں ہندوی بھیجتے تھے اس مقررہ کی اندازہ دانی دیکھئے
 کہ کبھی فوج سے اس روپے نہ رسید نہ ملی اپنے خلیفہ میں ہندوی بھیجا کرتے تھے میں خدا کا جواب
 لکھ دیتا تھا اس ماہانہ کے علاوہ بھی کبھی دوسو بھی آسمانی سو بھیجتے رہتے ۔ فتنہ و فساد (ص ۱۰۰)
 کے دہل میں قلعہ کی آمد مفقودہ انگریزی پنشن مسدود یہ بزرگوار وجہ مقرر سی ماہ بہ ماہ اور شوج
 گاہ گاہ بھیجتا رہا ۔ تب میری اور میرے منہجوں کی زیست ہوئی ۔

آخری لفظوں سے شاید کسی صاحب کے دل میں خیال پیدا ہو کہ نواب یوسف علی خاں
 شاگردی کے آغاز ہی سے سو روپے ماہانہ مستقل بھیجتے رہے ۔ یہ خیال صحیح نہ ہو گا ۔ البتہ

خود میرزا آقاسی کے موسومہ خط میں تصریح کی ہے کہ مستقل وظیفہ جولائی ۱۸۵۹ء سے شروع ہوا۔ فرماتے ہیں:

نواب یوسف علی خاں تیس برس کے میرے دست درپاچ پچھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ گاہ گاہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سورد پیمہ مہینہ ماہ بہ ماہ بھیجنے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر پلا آیا۔ بہ شرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سورد پیمہ مہینہ یہاں رہوں یا وہاں رہوں اس کے ہاں سے میرا مقر رہے۔

نواب کلب علی خاں کا عہد | اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی یہ وظیفہ جاری رکھا تھا۔ غالب لکھتے ہیں:

رئیس حال (نواب کلب علی خاں) کو خدا بہ دولت و تہال، بد عہد اسلامت کے درجہ مقرری کی بندہ می ہر مہینے حسب دستور قدیم اپنے خطا میں بھیجے جاتا تھا۔ فتوح کی رسم دیکھنے جاری رہے یا نہیں۔

قائم برسات کی | غالب خود بھی خاص ضرورتوں کے موقع پر روپیہ مانگ بیٹھے۔ مہینہ میں دو | تھے مثلاً قاطع برسات کی چھپاٹی کے ساتھ دو سو روپے منگوانے کا واقعہ معلوم ہے۔ خود لکھتے ہیں:

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاصد برسات" کو دوبارہ پیسواؤں پہنچا بھی نواب مخفوع (نواب یوسف علی خاں) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے تب پہلا مسودہ صاف ہو کر تھپڑا گیا تھا۔ اب بھی دہرہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو روپے پہنچیں گے۔ وہ (نواب صاحب) آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ تیس سال سے میں نے پایا۔ مشرقی کتاب گارڈ پیہ نہ آیا۔ اس مضمون پر نواب یوسف علی خاں کا سرسبز دفتر سے نہ تھا۔

جواز دے دفتر اس کی تصدیق ہو۔

اصلاح اشعار سے معذرت | غالب نے ایک مرتبہ اصلاح اشعار سے معذرت بھی لکھ

بھی لیکن نواب کی طرف سے مقررہ وظیفہ بہ دستور پہنچتا رہا میرزا تقی کو لکھتے ہیں،

رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا

کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں

جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے، تو میں سکے لبرسی، ورنہ

خیرات خواہ سی اور اگر یہ عطیہ بہ شرط خدمت ہے تو جواب کی مرضی وہی میری قسمت ہے۔

برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا فتوح مقررہ نومبر تک آئی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا

ہے۔ آہنگ نواب صاحب ازراہ جوانمردی دیئے جاتے ہیں۔

نہ محفل اصلاح اشعار ہی کی خدمت معاف تھی۔ بلکہ رام پور جانے کی بھی

پابندی نہ تھی غالب خود فرماتے ہیں :-

حق تعالیٰ والی رام پور کو صدوسی سال سلامت رکھے۔ ان کا عطیہ ماہ بہ ماہ مجھ کو

پہنچتا ہے۔ کرم گستری ازراستاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اٹھانے

اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔

رام پور میں قیام | دوران قیام رام پور میں مقررہ وظیفہ کے علاوہ سو روپیہ بنام

کے مانے کی تنخواہ | دعوت ملتا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے جس کو یہ دسواں مہینہ سو روپے مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے

ہیں۔ اب جو میں دیاں گیا تو سو روپے مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور میں

رہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔

اودھ کے ساتھ | سلطنت اودھ کے ساتھ غالب کے تعلقات کی نسبت ایک اقتباس

تعلقات | اوپر پیش کیا چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بدر علی شاہ کی سرکار سے

ان کے لئے ہر سال مدح گستری پانسو روپے سالانہ مقرر ہوئے۔ لیکن یہ وظیفہ مقرر ہونے کے بعد سلطنت اودھ دو برس سے زیادہ قائم نہ رہی۔ اس ت مستند ہوتا ہے۔ کہ پانسو روپے سالانہ کا یہ وظیفہ ۱۸۵۳ء کے اواخر یا ۱۸۵۴ء کے اوائل میں منقرض ہوا تھا۔ اس لئے کہ واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں معزول ہوئے۔

غالب کے سفر کلکتہ کے سلسلے میں قیام لکھنؤ کے جو حالات بیان ہو چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے۔ کہ دربار لکھنؤ کے ساتھ ۱۸۵۲ء میں روابط پیدا کر سکی کوشش کی گئی تھی۔ خواجہ خانی فرماتے ہیں:

اس زمانے میں نصیر الدین حیدر قراڑا اور روشن، مدد نائب السلطنت تھے۔ اہل مکتبہ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن المدد کے بار بہ عنوان شایستہ ان کی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اس پر ایشانی کے عالم میں تیس دنوں کا بیجاں نہ ہو سکا۔ مگر ایک مدعیہ نثر صنعت تحفیں میں جرات کے مسودات میں موجود ہے۔ نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ کہ غازی الدین حیدر نے ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۳ء مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۲ء کو وفات پائی۔ اور اس کا بیٹا نصیر الدین حیدر پادشاہ بنا۔ غالب اس سے قبل لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ بلکہ باندہ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ لہذا یہ صحیح نہیں۔ کہ وہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔

اس زمانے میں روشن المدد کے نائب السلطنت : دئے کا بیان دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے۔ کہ یادگار کی ترتیب کے وقت غالب کی کمیانت شرفارسی خواجہ صاحب مرحوم کے پیش نظر ہی نہیں تھی۔ اس لئے کہ جس نثر کا خواجہ خانی نے

ذکر فرمایا ہے۔ اس کی داستان ترتیب غالب خودیوں بیان کرتے ہیں۔ کہ لکھنؤ کے دوستوں نے رفتہ رفتہ میرا ذکر سید آغا میر کی بزم میں پہنچایا جو معتقد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے۔ اور یہ نذر خانی فرمانروائے آن کشور و مدارالمہامی آن سلطنت است تبار داشت۔ پھر لکھنؤ سے رائے جھجھل کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہرچہ در اں بلاد از کرم پیشگی و فیض رسانی اس گدا طبع سلطان صورت یعنی معتقد الدولہ آغا میر شنیدہ سے شد بخدا کہ حاں بر عکس است۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے۔ کہ نہ اس زمانے میں روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ نہ زیر غور تشران کے لئے لکھی گئی۔ نہ غالب کی تقریب روشن الدولہ کی بزم میں ہوئی۔

یہ بھی معلوم ہے۔ کہ غازی الدین حیدر کے بعد نسیر الدین حیدر کے ابستدائی دور میں روشن الدولہ نہیں بلکہ معتقد الدولہ آغا میر ہی۔ مدارالمہامی تھے۔ انکی معزولی کے بعد اعتماد الدولہ میر فتح علی مدارالمہامی بنے۔ پھر فتح علی مدارالمہامی نے حکیم مہدی علی خاں ثیابت و مدارالمہامی پر مامور ہوئے۔ اس سے کہ و پیش ایک سال قبل غالب کھانہ میں دو برس رہ کر واپس آچکے تھے۔ اگست ۱۸۳۲ء میں حکیم مہدی علی خاں معزول ہوئے۔ اور نوبر ۱۸۳۲ء میں یعنی غالب کے لکھنؤ جانے سے قریباً سوا پانچ برس روشن الدولہ کو وزارت کا منصب عطا ہوا۔

۲۵ کلمات نثر فارسی صفحہ ۱۰

۱۵ کلمات نثر فارسی صفحہ ۵۰

۲۵ تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۵۵

۲۵ تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۲۹۱

۲۵ تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۳۰۸

سلاطین اودھ کے قصائد غالب کے کبیات نظم فارسی میں شاہان اودھ کے لئے پانچ
 قصیدے ہیں۔ اور ایک قطعہ ہے۔ پہلا قصیدہ نصیر الدین حیدر کی مدح میں ہے
 چونکہ اس میں روشن الدور کا ذکر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ یہ ہر حال نومبر
 ۱۸۳۲ء کے بعد پیش ہوا۔ دوسرا قصیدہ امجد علی شاہ کی مدح میں ہے۔ تیسرا
 بھی امجد علی شاہ ہی کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ لیکن غالب کی ایک تحریر سے معلوم
 ہوتا ہے کہ اس میں بعد ازاں امجد علی شاہ کی جگہ امجد علی شاہ کا نام داخل کر دیا
 تھا۔ یہ ہر حال وہ امجد علی شاہ ہی کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ بقیہ دونوں قصیدے
 امجد علی شاہ کی مدح میں ہیں۔ قطعہ نصیر الدین حیدر کی شادی کی تقریب میں لکھا
 گیا تھا۔ جس سے ۳۷۷ مطابقت ۱۸۲۸ء تا ۱۸۲۹ء تک ہوتی ہے۔ میری تحقیق کے
 مطابق اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ غالب کے روابط کی پہلی کڑی یہی قطعہ
 ہے۔ اسی کے متعلق لکھتے ہیں: ”میں نے جوئے مولوی کریم حسین خاں نصیر شاہ اودھ تقسیم
 لکھتے کو لکھتے ہیں:“

”بعد من در صد نکاش این قطعہ دست مزد خویش مے نیم روشناسی شروت
 و شریعت قبول توید انشانت و عطیہ فتوح۔ اما کشایش ظلم این معاد زرد آن
 است کہ پایہ و مقام مستالین گر یہ حضرت محمود شمر وہ مے شود تا۔ اند نہ
 اندش و عطا تواند کرد ورنہ پیدا است کہ جایزہ باد خزان تا چہ قدر است۔
 اس کے بعد نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ بھیجئے تک غالب کی طرف
 سے اودھ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی غالباً کوئی کوشش نہیں ہوئی۔
 نصیر الدین حیدر کا قصیدہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ قصیدہ نومبر ۱۸۳۳ء

کے بعد لکھا گیا۔ اس لئے کہ اس میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے جو نومبر ۱۸۳۲ء میں وزیر اعظم ہوئے :

روشن الدولہ بہادر کہ یہ ایثار و عطا
حاش گفتم و شرمندہ تقصاں رستم
بر مکیہ تہ ہمہ بر مکیاں زہر ز شک
چو ثنا خوان تنائیش بر آناں رستم
پادشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں :

توسلیمانی و آن آصف من موضعیت
راہ نسبت طلبی ہیں کہ چہ شایاں رستم
یہ دیم پسرد بنویس بر اتم بروے
تا بد اتم کہ بہ آصف ز سلیمان رستم
سبحان علی خاں قوم کے کبیوہ اس زمانے میں ایک نہایت فاضل اور دانشمند شخص

۱۸۔ مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں : اس قصیدہ کی تشبیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم تشبیہ کا بڑا حصہ سفر کلکتہ میں ضرور لکھا گیا۔ کیونکہ مزاج ان حالات پر مشتمل ہے جو سفر کا باعث ہوئے تھے۔ یعنی اقارب کا جو رستم اہل وطن کی بے اعتنائی حکام کا تغافل اور پھر اتنا ہی نہیں صاف نفکوں میں سفر کا بھی ذکر کیا ہے :

چہرہ اندوہ بگرد و مرثہ آغشتہ بنجوں
خود گواہم کہ زدہلی بہر چہ عنوان رستم
باقی رہی یہ بات کہ غالب نے قیام لکھنؤ کی تالیفات میں مرثیہ صنعت قلعیاں کا ذکر کیا ہے، قصیدہ کا ذکر نہیں کیا۔ نیز ممدوح نصیر الدین جہد ہے نہ کہ غازی الدین جہد تو اس کی توجہ سے یوں ہو سکتی ہے کہ قصیدہ لکھنے کا خیال ہوا تھا۔ اور تشبیہ کا بڑا حصہ انجام بھی پا گیا تھا۔ مگر معتد الدولہ کا حال دیکھ کر طبیعت افسردہ ہو گئی یا پریشانی سفر کی وجہ سے نکلیں ایک معاملہ نہ پہنچا۔ پھر روشن الدولہ کے زمانے میں مدح کے اشعار بڑھا کر قصیدہ مکمل کر دیا گیا غالب نے قصائد میں اس طرح کی تبدیلیاں اکثر کی ہیں :

ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ اودھ کا قصیدہ لکھتے وقت تشبیہ کے لئے سفر لکھنؤ کا مضمون ہوا
معلوم ہوا۔ اور غالب نے پانچ برس پیشتر کے واقعات کا پورا نقشہ تشبیہ میں کھینچ دیا۔

لیکن ابدیت سے میرا خیال بھی یہی ہے کہ قصیدہ کا ابتدائی حصہ یقیناً سفر کلکتہ کے دوران میں لکھا گیا۔

اور ”رستم“ کی ردیف والی زمین اختیار کرنے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے ۔

تھے جو معتمد الدولہ آغا میر کے مشیر خاص رہ چکے تھے اور روشن الدولہ نے بھی اپنے زمانے میں انہیں اپنا مشیر خاص بنالیا تھا۔ غالب اسی قصیدہ کے متعلق سبحان علی خاں کو لکھتے ہیں :

ہیں عرضداشت یہ فروغ نگاہ قبول آصف ثانی در روشن الدولہ مشرقستان گرد و این
قصیدہ بہ بزم مینو مثال سلیمانی (نصیر الدین حیدر) خواندہ شود تا مرا کہ سخن پیوند ستایش
نگارم بہ جا بژہ خسروی رخ امتیاز افروزش پذیر وادانگہ صلہ ہاں گرانمایگی کہ ہم پیرم
بلند نامی و ہم در نظر خویش گرامی کند۔

سبحان علی خاں کے نام غالب کے مکاتیب فارسی میں دو اور خط ہیں جن میں سے ایک میں لکھتے ہیں کہ قصیدہ اور عرضداشت مدتی آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ یہ بھی سن چکا ہوں کہ وزیر اعظم نے اس قصیدے کو بہت پسند کیا، لیکن معلوم نہ ہوا کہ یہ بارگاہ شاہی میں پہنچا یا نہیں۔ فشتی محمد حسن خاں کو بھی اسی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اگر صلہ مل جائے تو میں مقدمہ کی پیروی کے لئے دوبارہ کلکتہ جانے کا انتظام کروں گا۔

پانچ ہزار کا صلہ | اردو کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ پر پانچ
متوسط ٹکائے | ہزار روپے ملے تھے۔ لیکن تین ہزار روپے روشن الدولہ نے
ہضم کر لئے جسے غالب نے ایشار و عطا میں عاتم سے بھی بلند تر قرار دیا تھا۔ اور
جس کے جو دوست سنا کر برہم کیوں کو زہر کھلایا تھا۔ دو ہزار فشتی محمد حسن کو
دیئے اور کہا کہ جو کچھ مناسب سمجھو غالب کو بھیج دو لیکن اس مسکین کو ایک حید بھی نہ ملا۔ وہ
لکھتے ہیں :

یہ قصیدہ فشتی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے

نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیننے کا حکم ہوا۔ متوسط
یعنی فتنی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدین مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انہوں نے یہ راز
مجھ پر ظاہر کیا۔ اور کہا خدا کے واسطے فتنی محمد حسن کو میرا نام نہ لکھنا۔ ناچار میں نے امام بخش ناسخ
کو لکھا۔ کہ تم دربارت کر کے لکھو کہ میرے قصیدہ پر کیا گزری۔ انہوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار
روپے ملے، تین ہزار روپے روشن اور تے کھائے دو ہزار فتنی محمد حسن کو دیئے اور فرمایا کہ اس
میں سے جو مناسب سمجھو غائب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ میں نے لکھ بھیجا۔ کہ
مجھے پانچ روپے بھی نہیں ملے۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو۔ اس کا مقصد
یہ ہے کہ میں نے پادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے۔ اور یہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ
حضور میں گزرا مگر یہ نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط پادشاہ
کو پڑھو کہ ان کا (روشن الدولہ وغیرہ کا) کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔
بھائی! یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں
خبر اڑی کہ نصیر الدین مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔

یہ اس نادرا وجود شخص، آخری دور کے سب سے بڑے شاعر پراتی طرزوں کے خاتم اور
نئی طرز کے موجدوں کی حالت تھی۔ کہ اس کا جو قصیدہ فارسی زبان کے بہترین قصائد کے
مقابلے میں بے تامل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس پر شاہ اودھ پانچ ہزار انعام دیتا ہے۔
لیکن سارا روپیہ متوسط ہضم کر جاتے ہیں اور اس غریب کے ہاتھ پانچ پیسے بھی نہیں آتے
بلکہ صلیبانی کی اطلاع بھی دوسرے ذریعہ سے ملتی ہے۔

۱۔ مظفر الدین سیف الدین خاں خلیف اکبر ذاب حسام الدین حیدر خان بہادر۔

۲۔ مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں: یہ قصیدہ غالب کے بہترین قصائد میں سے ہے عرفی کے تنسیخ میں لکھا گیا
ہے۔ لیکن اس کی تشبیہ کسی طرح بھی عرفی کی تشبیہ سے گری ہوئی نہیں ہے۔

امجد علی شاہ کا قصیدہ | نصیر الدین چیدر نے شمسۃ میں وفات پائی۔ اور محمد علی شاہ
بادشاہ ہوئے۔ لیکن غالب نے ان کے ساتھ کوئی ربط پیدا نہ کیا۔ امجد علی شاہ کا
زمانہ آیا تو چیدر ایک قصیدہ لکھا جس کی بہت اسٹم یہ ہے:

امجد علی شاہ آنکھ بہ ذوق دعا کے اور
صدرہ نماز صبح قضا کرو روزگار

اس قصیدہ کے سلسلے میں بھی عجیب واقعہ پیش آیا۔ غالب جب آگرہ میں
تھے۔ تو ایک صاحب ان سے ملے تھے، بڑے زبان آور اور چالاک۔ کہیں تحصیلدار
رہ چکے تھے۔ آگرہ میں ملازمت کی جستجو کی لیکن کوئی صورت نہ بنی اور وہاں سے چلے
گئے۔ غالب وہی ہیں آ رہے۔ کافی مدت کے بعد امجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ سے
ان کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ وزیر سے ملا ہوں بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ
کی ملازمت انہی کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے۔ "خان" اور "ہمدانہ" کا خطاب ملا
ہے۔ مصاحبوں میں نام درج ہوا ہے۔ وزیر آپ کا بہت مددگار ہے۔ اگر
آپ قصیدہ اور عرقداشت بھیجیں تو بادشاہ آپ کو بلا نہیں گئے۔ غالب کہتے ہیں
کہ قصیدہ تیار تھا۔ لیکن:

مزد تھا کس کی معرفت بچوں تو کھت علی اللہ داس شخص کے پاس بھیج دیا۔ رسید
آگئی۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہنچی۔ وزیر پھر کمر بستہ خوش ہوا
بدائین شالیہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدر الدین مہر کن سے میری
مہر خطابی کھد کر بھیج دیجئے۔ چاندی کا گیارہ موزن اور قلم جلی فقیر نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی
اور قصیدہ کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید اس عہد و میں تک ادھر سے کوئی خبر نہ آیا۔

خط بھیجا اٹھ پھر آیا۔ ڈک کا یہ توقع کہ مکتوب ابیریاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر مکس پینا اور عاقر ہٹا سچ۔ پادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط۔ بہادری کی مہر تم سے اس کے مرشد آباد کر چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دوسرے پے دیئے تھے۔

گویا یہ قصیدہ بھی بے صلہ رہا۔

واجد علی شاہ سے تعلق | واجد علی شاہ کے زمانے میں غالب نے پھر سلسلہ جنابانی کی۔ شاہ کے مصاحبوں میں اس وقت ڈوموں کا بڑا زور تھا اور انہیں بڑے بڑے خطاب ملے ہوئے تھے مثلاً رضی الدولہ، نجیب الدولہ، قصب الدولہ، و باج، الدولہ غالب سے قطب الدولہ کی وساطت سے قصیدہ واجد علی شاہ کی بارگاہ میں بھیجا۔ مولانا نسیم نے اسے بارگاہ میں پڑھا۔ حکم ہوا کہ اس کے صلہ کا مسئلہ دوسرے وقت میں پیش کیا جائے۔ لیکن ابھی کچھ طے نہیں ہوا تھا کہ قطب الدولہ اور دوسرے تمام ڈوم واجد علی شاہ کی مصاحبی سے نکالے گئے۔ ان کے اخراج کا واقعہ جون سنہ ۱۸۵۷ء کو پیش آیا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ قطب الدولہ نے اپنے اخراج پر قصیدہ مع عرضداشت بجنسہ غالب کے پاس بھیج دیا۔ نواب محمد علی خاں عرف میرزا حیدر کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ مع عرضداشت دوبارہ ان کی وساطت سے بھیجا گیا تھا۔

۱۷ مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں: یہ قطب الدولہ دہلی کا گریا تھا۔ اس کا خاندان اب بھی دہلی میں موجود ہے اس خاندان کے ایک گویہ عارف کو حکیم صاحب دمیج الملک حکیم جمل خاں مرحوم نے مالیر کوٹہ میں ملازم رکھوایا دیا تھا۔ ادھر کچھ عرصے سے نظر نہیں آیا۔ پہلے جب کبھی دہلی جاتا تھا اور یہ دہلی میں موجود ہوتا تھا تو آتا تھا۔ اسے بہادر شاہ کی بہت سی غیر مطبوعہ ٹھریاں یاد تھیں۔

۱۸ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۲۰

۱۹ تاریخ اودھ حقہ پنجم صفحہ ۱۶۵

۲۰ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۲۰

کیا کہ نواب شمس الامرا بہادر والی پائیگاہ کی محفل میں غالب کا ذکر آیا تھا بس یہی امر تعلقات پیدا کرنے کا محرک بن گیا۔ چنانچہ انہوں نے، شعر کا ایک قصیدہ شمس الامرا کی مدح میں لکھا اور ایک مکتوب کے ساتھ جس کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی حیدر آباد بھیج دیا۔ مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں اردو شعر کہتا تھا اور ایک دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اب تیس برس صرف فارسی شعر کہتا ہوں۔ قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں،

چہ قصیدہ از سیدہ کہ تاب غم در آں آتش افروخت نیم سوختہ آجے و از خرمی کہ برق آں را پاک سوخت و داند و دود گیا ہے۔ فرخ بخت عریضہ بکار کردستایہ چشمداشت قبول روزے چندول بہ شادمانی نہد و دریں تنہائی داد ہمدی خویش و بد۔

بہ التفات نیزم در آرزو چہ نزاع نشاط خاطر مغلس ز کیا طلبی است
اس فارسی قصیدے کے صرف دو شعر مکتوب میں درج ہیں، لیکن پورا قصیدہ نہ غالب کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے نہ سیدہ میں ہے نہ کسی اور جگہ شائع ہوا ہے نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کہاں گیا اور اگر ضائع ہوا تو کیسے؟ دو شعر یہ ہیں،

اے مظہر کل در ازل آثار کرم را منت بہ سر لوح زاسم تو قلم را
شمس الامرا کز شرف نسبت نلمش خور قبلہ بداد رنگ نشینان عجم را
ممکن ہے خاندان شمس الامرا کے پرانے کاغذات میں غالب کا یہ قصیدہ مل جائے۔ اگر کوئی صاحب اسے تلاش کر سکیں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ شمس الامرا کی طرف سے غالب اس قصیدے کا کوئی صلہ نہیں ملا۔

سالار جنگ کا قصیدہ | اس کے بعد غالب نواب مختار الملک سالار جنگ اول کی مدح میں قصیدہ لکھا فارسی مکاتیب میں ایک عرضداشت نواب صاحب حوم کے نام موجود ہے جس میں لکھتے ہیں۔

اے فخر لدین شمس الامرا میر کبیر ثانی ولادت ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) وفات ۱۲۴۹ھ (۱۸۶۲ء)
اے قلم را و علم را کی زمین میں عربی کی طرح غالب کے بھی دو قصیدے ہیں۔ ایک حضرت عباس علیہ السلام کی منقبت میں دسمار وزیر الدولہ بہادر والی نونگ کی مدح میں ممکن ہے شمس الامرا کی طرف سے یا اس کے بعد اسی کا قصیدہ تھوڑی ترمیم کیساتف وزیر الدولہ کے پاس بھیج دیا گیا ہو۔

قصیدہ مدحیہ فرستادہ باشم و نہ دانستہ باشم کہ بہ نظر گاہ خدایگان گزشت یا خود عرفیہ
در عرض راہ تلف گشت۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کب یہ قصیدہ نواب مختار الملک کی خدمت
میں بھیجا؟ جس مکتوب یا عرضداشت کا حوالہ اد پر دیا چکے ہے۔ اس پر تاریخ ثبت
نہیں لیکن اس کے آخر میں یہ شعر درج ہے۔

تا چرخ کشد محل بر جیس بقا باد
نواب فلک محل بر جیس شیم را

یہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کے قصیدہ کا دعائیہ شعر ہے اور تاریخ
ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ ۱۲۴۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں ٹونک
بھیجا گیا تھا۔ لہذا سمجھنا چاہیے کہ مختار الملک کا قصیدہ ۱۸۶۱ء میں یا اس
کے بعد لکھا گیا۔

اسی زمانے میں ایک مکتوب منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو بھیجا گیا
تھا۔ جو مختار الملک کے میر منشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے اردو دیوان کا
ایک نسخہ موم جامہ میں لپیٹ کر نواب موصوف کو بھیجا تھا۔ ذکا نے اس کی سید بھیجی

نہ اردو دیوان کے دو ایڈیشن گذرے پہلے چھپ چکے تھے تیسرا ایڈیشن محرم ۱۲۴۷ھ (مطابق ۱۸۶۱ء)
میں دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا اس میں بہت سی غلطیاں، گنیر تحیر، اور غلط نامہ ساتھ شامل کرنا ہوا تھا۔
اسی ایڈیشن کی تصحیح کے بعد دیوان پوتھی بار مطبع نظامی کان پور میں چھپوایا گیا۔ اور ذی حجہ ۱۲۴۷ھ میں چھپکے شائع
ہوا منشی حبیب اللہ خاں ذکا نے اردو دیوان کے پارسل کی رسید بھیجتے ہوئے فارسی کلام طلب کیا تھا جس کے جواب
میں غالب نے الریح الاول ۱۲۴۸ھ کو اطلاع دی کہ فارسی کلام چھپوانے کی فکر میں ہوں چھپ جلتے گا۔
تو بھیج دوں گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نواب مختار الملک کو احمدی مطبع والا دیوان بھیجا گیا ہو گا۔

اور فارسی کلام طلب کیا۔ غالب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ طلب غالباً نواب کے
ایجاز سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا کلام غدر میں غنائ ہو گیا۔ میرے ایک عزیز نے
بعد غدر پنجاب جنرل کے قریب جمع کیا۔ اب اسے چھپوانے کی فکر میں ہوں لیکن چھپائی
کے مصارف ادا نہیں کر سکتا۔ آخر میں لکھتے ہیں،

اے خدایم کہ رسیدن و ناسیدن دیوانِ رُود و باز دامن و نیز بدامن کہ طلب کلیات
فارسی ہنر نہ گمان بردہ ام بہ فرمان حضرت نواب صاحب محلۃ القاب
است یا ہمیں از جانب جناب صحیفہ طراز در ہر دو صورت فرمان پذیری آئیں
خواہد بود۔ والسلام بالوف الاحترام سے شنبہ یازدہم ربیع الاول ۱۲۷۸ھ
نائب کی اپنی داستان | نواب مختار الملک واسلے قصیدے میں غالب اپنے
متعلق لکھتے ہیں،

روشن دل و تشبیب ز بانم	اندوہ و دودماں نگویم
در نظم بلند پایہ رندم	والائی خنداں نگویم
عشق است ظہیر و انوری را	از سحر و اسلاں نگویم
والا گہرا! سپر جاں!	ایہما ز رہ گساں نگویم
تنگ است دل از هجوم اندوہ	میرم اگر آنچنساں نگویم
کس نیست متاع را خریدار	با آنکہ بسا گراں نگویم
زناں رود کہ خردوران کیتی	رب نجد چو قدر داں نگویم
ناچار متاع عرضہ دارم	بے رونقی دکان نگویم
سر پایہ زدست رفتہ و انگاہ	گلے سخن از زریاں نگویم
حسن طلب ملاحظہ فرمائیے،	
امید کہ جز سوال نمود	حرفے کہ دریں میاں نگویم

تنگم ز سوال نیست اما با کلک سیہ زباں نگویم
گر وایہ رسد بہ من سویت با غالب خستہ جاں نگویم

کال خود ز من است ناتواں تر

باوے سخن از تواں نگویم

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختار الملک نے غالب کے ساتھ کچھ سلوک کیا یا نہیں۔

وزیر الدولہ والی	لواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں دو قصیدے
ٹونک کی مدح	بیس۔ پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ء و مطابق ۱۸۶۱ء میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت غالب کی عمر چونسٹھ پینسٹھ برس کی تھی۔ چنانچہ اس

بیس بڑھاپے کا ذکر بھی موجود ہے۔

۱۷۸۰ء مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں۔ یہ قصیدہ نہیں غالب کے نبھئے ہوئے دل کا آخری دھواں ہے۔

اں رو کہ خرد در گین شمع چو قصہ رداں نگویم

ماہار مناج حضرت دہم بے رفتی دکان نگویم

حسن دہم نے یہ اشعار لکھے ہیں اس کی مایہ سببیں در تیغ کامیوں کا کیا حال ہوگا؟
اس کا اندازہ صرف وہی دل و دماغ کر سکتے ہیں جنہوں نے زمانے کی قدر شناسیوں اور
خیر امتیازیوں کے خود زخم کھائے

نس نیست متلع ز خریدار با آنکہ ہسا گراں نگویم

صرف نقد و پلاس دارم صرف خزو پر نیاں نگویم

ہر چند بہ پیری شدہ دل سرور بہستی
از سردی موسم چہ زیاں گری دم را
دارم نفس گرم در افسردہ دلی نیز
از بہمن ددے تپ نہ رود شیراجم را
بر نائی اگر رفت نہ آنست کہ برین
حقے نبود پرورشش آموز ہرم را
فرخ دم پیری کہ کند در نظم خوار
خوبان قمر طلعت و ناہید نغم را
پشتم بہ سوے سجدہ زخم راہ نماید
باریست گراں منت غنخوار می غم را
بالشت ختم آسودہ توان زیست گیتی
اماچہ کنم کج روی بخت و ژم را
جادو و جہاں آنقدرم نیست کہ فتنے
بیرون نغم از دائرہ یاس قدم را

اس میں ایک غزل بھی کی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

در ہند تنک مایہ جو رند نکو یاں
یارب بچہ اقلیم بر دم ذوق ستم را
شیرینی جاں بر لب من موج زد اما
ایں شہد نہ بردازد ہم تلخی ستم را
آسودہ دلاں چوں شہوند آہ و فغانم
دانند کہ من مرد نیم رنج و الم را
غافل کہ ہم از ہول نگوں ساری بخت است
فریاد گراں لب جہدار باب ہم را
غم خست درون من و خوتا بہ آل زخم
بر چشم رواداشت برول دامن ہم را
در سرمہ فرو خفتہ گدا یا نہ خرد شہیست
پیش آمدہ روز سبے حرف و رقم را

آخر میں فرماتے ہیں،

گفتم کہ گدا ہم ز گدا یاں نہ شمار می
در ہم نفساں نیز بود تفرقہ ہم را
ہر چند بہ در یوزہ عزت ز عزیزاں
با خود بہ شفاعت نتوان برو قسم را
سو گند خورم گر بہ فروغ گہر خویش
فیض از دم سو گند رسد صبح دوم را
من واپہ ز شہ جویم و شہ معرفت از من
رخ جانب کشکول من است افسر جم را
ہنگام گدائی فتد از شرم سوالم
لعل و گہرا ز لہزدہ زدست اہل کرم را

تایخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے کے صلہ میں تاخیر ہو گئی تو غالب

نے ایک قطعہ بھیجا جسے خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں جو ملیح کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے۔ اور جو غالب کے کلیات میں شامل نہ ہو سکا لیکن "سہد چیں" میں چھپ گیا تھا میری رائے میں یہ قطعہ محض حسن طلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد غالب کو صلہ بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کی مقدار و نوعیت معلوم نہیں ہو سکی۔

دوسرا قصیدہ عید الاضحیٰ کے موقع پر بھیجا گیا تھا۔ اس کے دعائیہ اشعار کا انداز بہت اچھوتا اور دلکش ہے۔ فرماتے ہیں،

چند چیز است کہ در پیشگاه اہل تمیز	بہ گرا نمایاں آرایش گیہاں آمد
آں درخشندہ درفشے کہ بہ یغمانے عرب	در زمان عمر از شکر ایران آمد
آں فروزندہ و فیروز دل افروز نیسے	کہ روانی وہ فرمان سلیمان آمد
دیگر آں جام جہاں میں کہ پوشش وشی	عام افروز تراز مہر درخشاں آمد
دیگر آں تخت سبک سیرک از تیز روی	ہمدم باد چوبوسے گل دریچاں آمد
ہفت گنجینہ پروریز کہ در ہفت اقلیم	بہ نموداری ہفت اختر تاباں آمد
فہم ہر نکتہ غامض کہ ہمیشہ فرمود	فیض ہر ایت رحمت کہ بہ قرآن آمد
یارب نہ با بہ تو بخشند و برآں افزایند	دم آبلے کہ ز سر چشمہ حیواں آمد

تجمل حسین خاں | مسلمان ریاستوں میں اس زمانے میں فرخ آباد بھی خاص اہمیت رکھتی تھی۔ یہ سنگش خاندان نے فرخ سیر کے عہد میں قائم تھی اور غدر میں باد والی فرخ آباد

۱۔ یادگار غالب صفحہ ۸۵	۲۔ یہ حوالہ رسالہ "ردمان" بابت جون ۱۹۳۵ء
۳۔ درفش کاویانی	۴۔ خاتم سلیمانی
۵۔ جسام جم	۶۔ تخت سلیمانی

۷۔ دوسرا قصیدہ بھیجنا بچائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ پہلے کا صلہ اچھا مل گیا ہوگا۔

ہوئی۔ اس کے والی نواب تھمل حسین خاں کے ساتھ غالب کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اردو کی ایک غزل میں نواب ممدوح کی مدح میں ایک قطعہ موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

دیا ہے خلق کو بھی تانا سے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تھمل حسین کے لئے

تھمل حسین خاں نے ایک مرتبہ غالب کو فرخ آباد بلایا تھا ایک فارسی مکتوب میں میکش کو لکھتے ہیں کہ امیر سلطان شکوہ نصیر الدین معین الملک تھمل حسین خاں بہادر حشمہ جنگ فرخ آباد بلارہے ہیں۔ میں نے ان کی محبت کے تقاضے سے جانا منظور کر لیا ہے۔ اور تمہیں بھی میکش کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لہذا پاٹودی سے اسی جہتے دہلی پہنچ جاؤ۔ غالبادہ فرخ آباد نہ جاسکے لیکن میراجیال بت کہ انہیں نہیں فرخ آباد سے ضرور کچھ ملا ہوگا۔ انور کے ساتھ روابط ایاستت الورد کے ساتھ غالب کے روابط بہت دیرینہ تھے خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ان کے والد فی ذاتہ پر راجہ بختاور سنگھ نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روز بہ روز کم کے دونوں چورس (غالب اور یوسف خاں) کیلئے مقرر کر دیا تھا جو مدت درز تک جاری رہا لیکن اس محتاس کی بندش کا سبب نہیں کھلا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ورو دہلی کے بعد بھی غالب کو الورد سے کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔ وہ خود فرماتے ہیں،

صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر تھمل اس نے قرض لیا۔ اس سے بڑھ کر یہ روٹی کا خرچ پھر بھی کے سر پائیں ہم کبھی جان نے کچھ دے دیا کبھی الورد سے کچھ دلوادیا۔

گل کیوڑہ کا عطیہ | مہاراجہ رادہینی سنگھ نے ایک مرتبہ کیوڑہ کے پھول تحفہ

بھیجے تھے۔ غالب نے ان کی تعریف میں ایک منظوم لکھی جو ایک خط کے ساتھ
مہاراجہ کو بھیجی گئی۔ یہ کلیات نظم میں شامل نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں:

خوشا کاوی و بوسے جاں پرورش	ز خود بہر پرواز بوشہ پرش
شہیم رواں پرورش داودہ اند	و گر صورت شہ پرش داودہ اند
ازاں روست کایں گل بہر شہیم	نہ زیباست منت پرست شہیم
تو کوئی بہساران فرخندہ خوے	کہ رسام رنگ است و قسام بوسے
پے تازہ گلہاسے اُردی بہشت	براست رواں بخششی بونوشت
شہیمے کزاں تازہ گرد و دماغ	فروں آمد از طرت گلہاسے باغ
نگہداشت آں مایہ و لفسر ز	بہ کاوی بہ بخشید اندر تموز
تموز از دیش نو بہار اں شدہ	شرفست امر روزگار اں شدہ
اگر حور راخت شادی بود	زا کسوں گلہاسے کاوی شدہ
شمال و صبا پیشکش بدین	گل از شہنم آئینہ وار شش بہ باغ
بدیں ار معانی کہ فرخ دم است	چنین تازہ بیکے دریں جا کم است
بہ انساں کہ جاں است از تبار	فرستد روانہ از من سپاس
بود تا کہ زیب بساط سپہر	ز سرین ماہ و گل سرخ مہر
ہر آن گل کہ آرد بہ کھزار باد	مہاراجہ را وقت دستار باد

گل کیوڑہ کا ترغیب بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے ساتھ روابط محض رسمی

نہ تھے۔ بلکہ ان میں دوستی کا رنگ نمایاں تھا۔

اور یہ سید ان کا ان فحشی ہیں اللہ تعالیٰ دیوانہ اور کے بھائی فحشی فصم اللہ تعالیٰ کے نام

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سے سنا تھا کہ مہاراجہ کی خدمت

میں ایک عرس دست خود غالب کی طرف سے نہیں ہوئی۔ حالانکہ ایسا کوئی چیز نہیں

بھی گئی تھی۔ فتنی فضل اللہ خاں کو لکھتے ہیں کہ بھائی (امین اللہ خاں) سے پوچھ کر لکھو یہ عرضداشت کون لایا تھا۔

تیسرا خط میرزا اسفندیاری بیگ دیوان الور کے نام ہے جس میں میرزا صاحب کے دیوان بننے پر مبارکبادی دی گئی ہے۔ نیز ان کے حسن انتظام کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

نواذراں را بہ پیش بشارت و تبہدنتن را بخشش صلہ دادگری را روزیازار خواہ بود و خرد و ہی را گرمی

ہنگامہ بیابان ہا گلستان ہا خواہ شد و دمن ہا چمن ہا ہر کہ گوشہ نشینم و چمن ہا چشم ہا زان فرخ انجمن و ہا کائنات

و ہا کشور چکا و آبادی ملک و زادگی تعلق چہ سخن آخرا دیریں بندگان آں دو تہم و از کہ خاک

نشینان آں دیکہ شکفت کہ چوں ساس کار بہ آئین دانش و داد ہند گشت و توشہ دیرینہ من بہ من باز ہند

مہاراجہ شیو دھیان سنگھ | مہاراجہ را وہی سنگھ نے پانچ برس قایم میں منسلک کر کے ۱۸۵۷ء

میں وفات پائی۔ اور ان کا کم سن بیٹا شیو دھیان سنگھ مندر نشین ہوا۔ اس کے ابتدائی عہد میں امین اللہ خاں دیوان تھے۔ اور اسفندیاری بیگ نائب لیکن بعد میں کشمکش شروع ہو گئی۔

امین اللہ خاں عرف امون خاں ایک معمولی آدمی تھے۔ ترقی کرتے کرتے وہ الور میں مختاری کے عہدے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے منجھلے بھائی فضل اللہ خاں کو نائب دیوان اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں کو فوج کا بخشی مقرر کر دیا۔ یعنی ریاست کے تمام امور پر حاوی ہو گئے۔ تینوں بھائی بڑے ذکی۔ زیرک اور ہوشیار تھے۔

اسفندیاری بیگ پہلے فیروز پور جہر کہ میں ملازم تھا۔ پھر الور پہنچ گیا۔ شروع میں وہ اور امین اللہ خاں ایک دوسرے کے ہی خواہ تھے۔ پھر کسی بات پر ناچاقی ہو گئی اور اسفندیاری بیگ نے بھائیوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

۱۷۔ ممکن ہے یہ اسی توشہ کی طرف اشارہ ہو چکا کہ خواجہ حالی نے دو گاؤں میر حاصل اور کسی قدر روپے کی شک میں یاد گار ہیں کیا ہے؟

ایمن اللہ خاں نے شیو دھیان سنگھ کی والدہ کو بہن بنایا تھا۔ اسی وجہ سے راجہ اسے ماموں کہہ کر پکارتا تھا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں وہ تینوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی بیٹی سے شادی کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اس کا میلان سلطانوں کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اسفندیار بیگ نے اسی بات کو مخالفانہ نتائج کی بنا پر بنایا۔ اور راجپوت ٹھاکروں سے کہنا شروع کیا کہ مسلمان سارے کاروبار پر حاوی ہو گئے ہیں۔ اگر یہی صورت کچھ دیر اور قائم رہی تو راجہ مسلمان ہو جائے گا۔

ایک ٹھاکر نے جوش میں آکر رات کے وقت ایمن اللہ خاں کے مکان پر حملہ کر دیا جس میں دیوان کا ایک بیٹا اور ایک خدمتگار مارے گئے۔ اور تینوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ راجہ نے انہیں رہا کر کے دہلی بھیجوا یا۔ پھر ایک ریجنسی کو نسل بنی جس کے صدر کپتان اچھے تھے۔ انہوں نے اصلاح کی ہر چند کوشش کی لیکن راجہ کے صرف تین طالب تھے۔ جو آخری وقت تک قائم رہے (۱) مجھے انتخابات دینے جاییں (۲) دیوان ہمایوں کو واپس بلایا جائے۔ (۳) ٹھاکروں کو سزا دی جائے۔

۱۸۴۳ء میں راجہ کو انتخابات ملے۔ کچھ مدت کا کام بڑی اپنی طرح جاری رہا۔ لیکن پھر بد نظمیاں پیدا ہو گئیں اور راجپوت موقوف ہوئے لگے جن سے راجہ کو سخت نفرت تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ساتھ بہتر بیس جول تھا۔ ۱۸۴۷ء میں پھر راجہ صاحب بے اختیار کر دیئے گئے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۸۴۷ء کو وفات پائی۔

قصیدہ غائب نے شیو دھیان سنگھ کی مدح میں ایک قصیدہ نمائندہ میں لکھا تھا اس میں اپنے والد کی شہادت کا ذکر بھی کرتے ہیں:

در بنج سالگی شدہ ام پیا کر حضور رنگیں سخن طرازم دویرہاں وہی نہ خواہد
باید شنود راز زاعیان بارگاہ باید شنفت قصہ ز پیران آں دیار
کافی بود مشاہدہ شاہ ضرور نیست در خاک راج گڑھ پیاں را بود مزار

توقعات پوری نہ ہوئیں راجہ سے غالب کو ٹیڑھی توقعات تھیں میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

راجہ صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ الحمد للہ علی کل حال۔ دیکھئے اب معاہدہ کر گئے ہیں۔ موافق اپنے وعدے کے ہم کو تک غیب رہنے سے نہ گھٹے جاتے وقت فرما گئے ہیں کہ میں اگر اسد کو بلاؤں گا۔ البتہ وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔

ایک مکتوب سے جہ رام پور سے لکھا گیا ظاہر ہوتا ہے کہ پورے غالب کی توقعات پوری نہیں کم از کم ۱۸۶۵ء تک وہ مایوس تھے۔ حکیم غلام محبت خاں کو لکھتے ہیں:

بھائی فضل اللہ خاں کی غمخواری و مدد کو ہی کا کیا کہنا ہے مگر اللہ سے مجھ کو بڑا نہیں یاد رکھا وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ یہ فرض محال کرنا تو دعائی سو روپیہ سود بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں برادر امین اللہ خاں سابق دیوان لورکا دینا ہے ان کا قرض ۱۰۰ روپیہ تھا اگر خلاف ہر سے عقیدے کے پاس روپیہ کا حکم ہو، اور وہ آجائیں تو تم بعد از مدد دعائی سو روپیہ ان کو دینا چاہئے باقی کے اسٹیج جس طرح ممکن ہو سونے "سبد چیں" امیرزا باقر علی خاں کو، روسیرشتہ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

میں نے اگلے مہینے میں (۱۵ نومبر) "سبد چیں" کی ایک جامع عرضی اقبال نشان میرزا افضل حیدر خاں کی معرفت لورکا بھوائی غورسراٹک ہفتے میں حضور پروردگار اور جہاد کا خدا ہستی کی معرفت مجھ کو آیا حضور نے ارادہ بندہ پروری دینا افزائی، غائب بہت بڑے مجھے بھائی میں تقریباً بہت عنایت اور التفات کیے بھرے ہونے دیکھے میرزا باقر علی خاں اس زمانے میں پورے تھے اور پرکے حالات کا ذکر کر نیکی بعد انہیں لکھتے ہیں:-
تم تو ہیں تم کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی یا نہیں؟ اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا؟
اب میں تم سے یہ پوچھنا ہوں کہ کبھی دریا میں میرا بھی زکراتا ہے یا نہیں؟ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں؟

جے پور سے امداد اہر کو پال نفقہ کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جے پور سے

۱۸۶۵ء میں لکھتے تھے۔

بہن کا فی روپیہ ملنے کی امید دلائی گئی تھی، لیکن صرف پانسو ملے۔ فرماتے ہیں :-

تمہارا دعا گو اور امور میں مانی پایہ نہیں رکھتا۔ مگر حقیقت میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی محتاج ہوں سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمہاری حالت پر سو سزا فرمیں۔ جے پور سے اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رقبہ ہو جاتا۔ اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی موتی تو اتنا سی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم متفرقات ہیں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے، سو میرے عرف میں آئیں گے۔ مہاجنوں کا سودی قرض ہے۔ وہ بقتہ رہندہ سود سے کچے باقی رہے گا۔

پانسو روپے | یہ پانسو روپے ہنڈی کے ذریعہ سے بھیجے گئے تھے۔ جس کے جلد نہ پہنچنے کی وجہ سے بڑا اضطراب تھا۔ اس کے ساتھ دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ ہنڈی لانے والے کو پچیس روپے انعام دینے اور اس کے آئے جانے کے مصارف ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ خود فرماتے ہیں :-

بھائی اگر شک ہو تو یہ نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ یہ حیرانی کی ہے کہ اس ہنڈی کے ہر دو سے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے ادائل کا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ اسی دن وہ اتفاق کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں شرم کے مائے بابو صاحب کو کچھ ناکہ نہیں سکندر جانتا ہوں کہ وہ سینکڑہ پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا شکریہ کریں؟ انیس روپے کی کون سی بات ہے؟ اگر مصارف ہر دو سنگھ دہنڈی لانے والے کا نام، میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غصب ہوا؟ انیس روپے پچیس (انعام کے) پتوں نکال ڈالیں، باقی ارسال کریں۔

۲۴ جون ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں :-

تیسرے دن ہر دو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈی پہنچی۔ تم مجھے بابو صاحب سے پچیس روپے ہر دو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا لئے۔ یہ ہر حال ہنڈی

بارہ دن کی مبعادی تھی چھ دن گزر گئے تھے۔ چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو میر کہاں۔ منی کاٹ کر روپے لے لئے، فرض متفرق سب ادا ہو گیا۔ سینتالیس روپے نقد یکس میں اور چار بونٹل شراب اور تین تیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہ۔

مزید عطایا | مزید عطایا کے باب میں فرماتے ہیں :-

بندہ پروردگار باوصاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں سو سو روپے کی۔ ایک میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تیاغ تولہ کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو یہ طریق نذر شاگردی بعد اس کے دو ہنڈیاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں۔ مع میر احمد حسین کے صلہ روپوں کے چار سو اور اس سے علاوہ تین سو اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا وہ باب کنور صاحب کی عمر پر حوائج ہے اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

گواہی کے ساتھ تعلق | معلوم ہوتا ہے کہ گواہی سے بھی غالب کو عطیہ کی توقعات تھیں میر سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی کے نام فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے مقدمہ پیش کے متعلق آخری فیصلے کا منتظر ہوں۔ فیصلے کی اطلاع ملتے ہی گواہی کی طرف چل دوں گا۔

پٹیار | ایک فارسی قصیدہ زہر سنگھ والی پٹیار کی مدح میں بھی ہے۔ جو غالباً حکیم محمود خاں مرحوم کے بھائیوں کی وساطت سے پیش ہوا ہو گا۔ اس میں اپنے متعلق لکھتے ہیں :-

بے زور و دل آمادہ فغاں دارم	فغاں اگر دلت از تنگی : : : : : گبرو
نہ دیدہ و نہ بینی مرا بہ ہیں کہ منم	کیکہ از غمش آور بہ استخوان گبرو
بحوثی حال من از قاف من کہ کار شناس	سراغ آتش سوزندہ از دغاں گبرو
مرا کہ نام مرا بے ادب نہ گیرد کس	فلک نگر کہ بہ بازہ سپچہ ناگہاں گبرو

پہرا عی و من گوشہ گیر و رہ نہ شیب
 خفاں ز لطف کہ خصم بدیں نشان گیرد
 حریر فکر مرا ہر نور و صدر نگ است
 خوشم کہ دیدہ و راز من بامتحان گیرد
 بہ مشتری چہ رسم ترک جہ در راہ است
 کہ جان و جگر و باہر سہ رایگان گیرد
 من آن متاع گرانمایہ سبک قدم
 کہ گریہ بیچ خورد کس ہماں گراں گیرد
 دلم کہ چارہ نہ دارد ہمے جزایں کہ ترا
 بحال خویش در اندیشہ مہرباں گیرد
 و ایوان ممالک اور امرار کے مشاہدوں یا عطیوں کے تذکرے کے بعد غالب کے
 شاگردوں اور نیاز مندوں کے ہدایا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تفتہ کا ہدیہ | تفتہ کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء کو ان کی
 طرف سے سو روپے کی ہندوی آئی تھی اس کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

ایک آدمی رسیدیکر نیل کے کڑے چدائی اور سو روپے چہرہ شامی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور
 بس چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیتے گئے پچاس روپے محل میں بھیج دیئے چوبیس
 روپے باقی رہے۔ وہ بکس میں رکھ دئے (حساب کے مطابق چوبیس باقی رہنے چاہئیں ممکن ہے
 دو روپے کسی کو انعام میں دیئے ہوں)

غالب اسی ہدیہ کے متعلق ”دستبر“ میں فرماتے ہیں :

میرزا تفتہ از میر تفتہ سفتہ نہ رہ من فرستاد و پامہ و نامہ پیوستہ فرستد۔

انور اللہ کے ہدایا | انور اللہ نواب سعد الدین خاں بہادر شفیق رئیس کدوراکا لپی بھی وقتاً فوقتاً
 روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں :

شفیق روپے کی ہندوی پہنچی اس کا بھی حال سابق کی سی ہندوی کا سا ہے یعنی ساہوکار کہتا
 ہے کہ بھی ہم کو کالپی کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی۔ جو روپیہ دیں۔ اگر رکھنے کا پرداز
 وہاں سے ساہوکار کو کہہ کر اجازت لکھو بھیجیں تو مناسب ہے۔

میرزا بہیم علی خاں کا ہدیہ | میرزا احمد حسین مودودی نے غالباً نواب میرزا بہیم علی خاں کی طرف سے

پوچھا تھا کہ آیا کچھ روپیہ بھیجا جائے؟ جواب میں لکھتے ہیں:

مید صاحب تہذیب کیوں تکلیف کرتے ہیں اگر بی مرضی ہے تو انتہائی دباؤ تکلف محض ہے۔ فقیر
یہ سوال ہوں۔ اگر کچھ بھیج دیں گے تو روتہ کروں گا۔ کم دینش پر نظر نہ کریں۔ جتنے کا چاہیں نوٹ
خط میں پیٹ کر بھیج دیں۔

پھر ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں فرماتے ہیں:-

جب نوٹ بھیجئے تو اہل کلمتہ کی طرح آدھا آدھا دوبار کر کے نہ بھیجئے گا۔ میرے نام کا مفاد جس شہر
سے چلے اُنسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے۔ ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کی
امکان ہے کہ تلف ہو۔

انہوں نے غالباً سو روپے کا نوٹ بھیجا تھا۔ اس لئے کہ ۹ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک
خط میں فرماتے ہیں:

دعوت یہ آپ کے جدا مجد کا غلام تو مر لیا۔ کثرت احکام دلو تو اردو و اشعار پھر یہ سہارا کہ
سو روپے کے نوٹ کی رسید سوا بار مانگتے ہو۔

میر غلام بابا خاں کا یہ یہ [نواب میر غلام بابا خاں سورتی نے بھی مالی امداد فرمائی۔ مثلاً اردو سے
معتلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "قاطع برہان" دوبارہ چھپوانے کی غرض سے غالب
نے روپیہ مانگا۔ میر غلام بابا خاں نے گھڑی بھیج دی۔ غالب نے اس کے متعلق
شکایتی خط سیاح کو لکھا جو میر غلام بابا خاں کے صاحب بن گئے تھے۔ اس کے
بعد میر صاحب نے سو روپیہ بھیج دیا۔ جس کی رسید ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں
ان لفظوں میں بھیجتے ہیں:

سو روپے..... مراف سے وصول ہوئے چھوٹے صاحب (نواب میر غلام بابا خاں)

نے بڑی جوانمردی اور بڑی ہمت کی۔ اس صرف میں میرا نام اور ان کا نام ہوا۔ اللہ اللہ
اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا نہ انہوں نے مجھے دیکھا
نہ میرا کوئی حق ان پر نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے یعنی منظور۔ خیر فقیر ہوں جب
تک جیوں گا دعا کروں گا۔

محمد علی خاں کا بد یہ [مولوی ولایت حسین کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے
کہ محمد علی خاں کی طرف سے ایک موقع پر دو سو روپے وصول ہوئے تھے۔
فتوحات و عطایا کے اس تفصیلی ذکر کے بعد غالب کی مالی حالت کے متعلق مزید
تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر وہ
عمر بھرا بنوہ مشکلات میں گھرے رہے۔ قرض غالباً کسی زمانے میں بھی ختم نہ ہوا۔ کسی
جگہ سے روپیہ آتا تو پہلا قرض اتار دیتے لیکن پھر اس بھروسے پر ادھار لینا شروع
کر دیتے کہ اور روپیہ آجائے گا۔ بڑی مدت تک یہ امید لگی رہی کہ ان کی خاندانی پنشن کا
سارا بقایا یک مشت مل جائے گا۔ جو مئی ۱۸۳۵ء میں ان کے حساب کے مطابق دو لاکھ
تین ہزار تھا۔ اس کے بعد سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے اس میں اضافہ
ہوتا تھا۔ اس روپیہ کا داروغہ عمر بھر ان کے دل سے نہ ہٹا۔ اسی کے لئے سہارے اور
اپیلیں کرتے کرتے وہ ملک و سرور یہ کی مدح کوئی پرستوجہ ہوئے۔ وہاں سے جب
پوچھا گیا کہ جو کچھ چاہتے ہو گورنر جنرل کی وساطت سے لکھ بھیجو تو نائب کی امیدوں
کے خزاں زدہ باغ میں پھر بہار آگئی۔ غرض وہ ۱۸۵۰ء تک مسرت افزا توقعات کے
چکر میں الجھے رہے۔ نیز میرا خیال ہے کہ فتوحات و عطایا کے سلسلے میں ان کے
سامنے صرف دو حقیقتیں تھیں۔ اول بڑے بڑے شعرا ماضی کے ساتھ وقت کے سلاطین

وامرا کا شاندار سلوک۔ دوم اپنی شاعری کا کمال۔ وہ اسی توقع پر قصائدِ مدح و تحسین کی خدمت میں بھیجتے تھے کہ ان کے کمال شاعری کی قدر شناسی میں کوتاہی نہ ہوگی۔ لیکن یہ توقع کبھی پوری نہ ہوئی۔ صرف ایک قصیدہ ہے۔ جس پر بادشاہِ اودھ نے پانچ ہزار روپے دیئے۔ لیکن اس رقم میں سے غالب کو ایک حصہ بھی نہ ملا۔

خرچ مسلسل بڑھا رہا اور آمدنی کسی وقت بھی مصارف کا ساتھ نہ دے سکی۔ مالی مشکلات میں افزایشِ اسفر کلکتہ کے گراہنا مصارف کے بعد ان کی مالی مشکلات خاص طور پر بڑھ گئی تھیں۔ وہ اس خیال میں تھے کہ پنشن کا بقایا ایک مشنت مل جائیگا اور سارے قرض بے باق ہو جائیں گے۔ لیکن مقدمہ نے طول کھینچا جب فیصلہ خلاف ہوا اور روپیہ ملنے کی کوئی امید نہ رہی تو دوسرا ہوکاروں نے دعوے دائر کر کے ڈگریاں لے لیں۔ یہ ۱۸۳۵ء کی بات ہے۔ غالب نے گرفتاری کے خوف سے دن کے وقت گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا اور صرف رات کی تاریکی میں سیر کے لئے جاتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں،

نخستین شیرارہ کہ در خرمن صبر و ثبات ز ونداں بود کہ دو تن از گروہ وام طلباں
چنانچہ قاعدہ عدالت انگریزی است ڈگری بحق من از عدالت حاصل کر وند۔ چوں
فرجام اں است کہ یازر مندرجہ ڈگری گزارده شود یا تن بہ بند و زنداں رادہ آید و
دریں بارہ شاہ و گدا برابر است۔ اگرے از بہر نام اور ان ایں قدر ہست کہ سر منگ
عدالت بہ کا شانہ شاں نتواند انداحت تا خود بہ رہ گذر یافتہ نشوند بہ اسیری
نہ روند۔ چوں گنجایش ادا سے زہر بنود لا جرم بہ پاس ابر و خود را گرد آوردم
و ترک نشاط سواری کردم۔

قرض کی کوشش | نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کو ایک خط میں لکھتے ہیں،

کس فرستادہ اندر حیت دہیرالال را بہ حضور بخواند و درانجمن بنشانند و انگاہ مرآیاد
فرمانید تا بایام و سرقلادہ گفتگو بکشایم۔ آنچه گفتہ آید ما حاصل آن ہمہ حرف و سخن ایں باشد
کہ اسد اللہ دم پرست شماسٹ و سررشتہ تور، نائیش بہ دست شماسٹ۔ حالیا زانند وہ
تنگ دستی دریش در ماندہ بہ کار خویش است و دستش بگیری دو بہ یک ہزار روپیہ دیگر بہ
کارش آید سچی شماسٹ نخواہد رفت و سود مند خود افتاد۔

اس خط کی صحیح تازیح معلوم کرنے کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ لیکن اغلب ہے۔
یہ قرض سفر کلکتہ کے سلسلے میں لیا گیا ہو۔ اس لئے کہ اتنی بڑی رقم یک مشٹ لینے کی
بہ ظاہر اور کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور چونکہ خط میں دو ساہوکاروں کا نام آیا ہے۔ شاید یہ
وہی دو شخص ہوں جنہوں نے بعد ازاں غالب کے خلاف ڈگری حاصل کی تھی۔

۱۸۵۳ء کی حالت | قرض کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ مثلاً ۱۸۵۳ء میں جسے پور
سے پانسو روپے آئے تھے تو اس وقت بھی نائب پر پندرہ سو روپے کا سودی
قرض تھا۔ قرض متفرق اس کے علاوہ کھلا مندر کے دلوں میں وہ کپڑے بیچ بیچ کر
گزارہ کرتے رہے اور بے حد تنگ دست ہو گئے تھے۔ اس زمانے کی حالت مختلف
خطوں سے ظاہر ہوتی ہے ایک خط میں پنجابی کی مثل لکھتے ہیں،

پنشن مل جائے جو اس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کر دوں۔ پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی

گلاں موٹیاں در قمر ۴ جنوری ۱۸۵۹ء

۱۸۵۹ء کی حالت | ایک اور خط میں بولنڈر ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں۔

بھائی! نہ کاغذ، نہ ٹکٹ۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے کتاب میں

سے کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل تمام کو فتوح کہیں سے

پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ ٹکٹ مگالوں کا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں،

جانتے ہو علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلہو غالب کا داروغہ کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض ملنے کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن دین کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نہر سے تین برس بعد جب پنشن کا سہ سالہ جمع شدہ روپیہ یک مشت ملا تو غالب کے ذمے سات کم پندرہ سو روپیہ سودی قرض اور گیارہ سو روپیہ متفرق قرض تھا۔

آخری ایام انٹشی حبیب اللہ خاں دکانے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زندگی کے آخری ایام میں بھی غالب کا خرچ کم و بیش تین سو روپیہ مانا تھا۔ اگرچہ آمدنی صرف ایک سو باسٹھ روپے تھی۔ فرماتے ہیں:

ایک سو باسٹھ روپے اٹھ آنے کی آمد تین سو روپے کا خرچ۔ ہر مہینے ایک سو چالیس کا گھانا، کمز زندگی دشوار ہے یا نہیں۔

تین سو روپے کہاں خرچ ہوتے تھے؟ اس کی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ ان کے مکان کا کرایہ پانچ چھ روپے مانا نہ سے کبھی زائد نہیں ہوا۔ ملازموں کی تنخواہیں زیادہ سے زیادہ پچیس تیس روپے ہوں گی۔ گھر کا خرچ بھی زیادہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری دور میں بھی وہ پرانے قرض اتار دیتے رہتے تھے اور ان کی آمدنی کا بڑا حصہ مختصات قرضوں کی قسطوں میں جاتا تھا۔

مجموعہ مکاتیب رام پور سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجہ مقررہ کے علاوہ وایان رام پور

غلیات بھیجتے رہتے تھے۔ بایں بہت عرصہ دھڑل میں غالب کے ذمہ آٹھ سو روپے
 سود می قرض تھا، پیر حسین علی خاں کی شاہی کے لئے کوئی سود سامان
 نہ تھا۔ پہلے وہ شادی کے خرچہ دراد سے قرض دو لوں کے طلب گار
 رہے۔ آخر میں صرف یہ درخواست کرتے رہے کہ قرض سے سبکدوشی کا بندوبست
 کر دیا جائے۔ جواب طلب علی خاں مرحوم کی طرف سے یہ معینہ نہ آیا تو وقف
 ہوا، تو غالب نے سکوت اختیار کر لیا۔ یہ وفات کے وقت ان پر آٹھ
 سو روپے کا قرض رہا۔ دستور باقی رہا جو جواب غالب الدین نے ان سے ادا کیا۔

دسوال باب

داستانِ غدر

بہ ناکر فت چناں صحرے زید بہ دہر کزاں بر آئٹ آسماں غبار آمد
 شرارہ بار غبارے زمخضر خاک آئیت سیاہ روپے کاندیس دیار آمد
 تو گوئی آنچہ من آں را غبارے گویم ز بہر کشت من ابر تگرگ بار آمد
 یوں تو غالب کے الم نامہ سیات کا کوڑا ورق بھی ایسا نہیں بس کی سیاہی
 مصیبتوں اور دل شکستگیوں پر آہ و فغاں کے دھوئیں سے تیار نہ ہوتی ہو یا جس
 کے بین السطور کی آرائش میں دل و جگر کا خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس
 جلیل القدر انسان کے اندوہ و ماتمہ کا سب سے بڑھ کر دردناک باب سلطنتِ تیمور کے
 زوال کا وہ خونچکاں واقعہ ہے جو عام طور پر "غدر" کے نام سے معروف ہے۔

تیموریوں کا زوال | تیموریوں کی سطوت و شوکت تو حقیقتہً عالمگیرِ عظم کے ساتھ ہی رخصت
 ہو چکی تھی۔ مشین اگر پوری تیزی سے چل رہی ہو تو انجن کے اچانک رک جانے پر
 بھی پہلے تھوڑی دیر تک یہ دستور گھومتا رہتا ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت
 مغلیہ کا وجود پہلے کی اس عارفی گردش سے مختلف نہ تھا۔ خانہ جنگیوں کے تواتر
 غرض پرست امر کی کا مجوٹیریں کے نسلسل دشمنوں کے هجوم اور جانشینوں کی نالائقی
 نے حکومت کا شیرازہ اس طرح پریشان کر ڈالا کہ اس کے دوبارہ مرتب استوار ہونے کی

بہ ظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی۔ فتنوں کے بندیکے بعد دیکرے ٹوٹے گئے۔ تباہی
 خیز طوفانوں کا تلاطم بڑھتا گیا۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں پادشاہ کے اضطرار و بیچارگی
 کی یہ کیفیت ہو گئی تھی جیسے کوئی خزاں زدہ پتا ہوا اور ہوا کا ہر جھونکا اسے جس طرف
 چاہے اُڑائے پھرے جس سلطنت کے حدود کسی زمانے میں کابل اور قندھار سے
 برما اور اس کمارمی تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سمٹ کر لال قلعہ کی چار دیواری میں
 محصور ہو چکی تھی۔ تاہم اس کا نام باقی تھا اور ہندوستان کے بڑے بڑے اقطاع کے
 فرمانروا اپنی حکمرانی کی دستاویزوں پر لال قلعہ کے انہی مجبور اور بے ست و پا
 سلاطین سے مہربں لگوانے کے آرزو مند رہتے تھے۔ اس لئے کہ ان مہروں کے
 بغیر کسی کی فرمانروائی کا سکہ چل نہیں سکتا تھا۔ تخت طاؤس افسانہ بن چکا تھا۔
 لیکن جس دیوان خاص نے دو سو برس تک اس تخت کے جلال و شکوہ کی بہاریں
 دیکھی تھیں وہ موجود تھا۔ بابر امید کا ایک جھلسلاتا ہوا چراغ نے کمر اس غربت کدہ میں آیا
 تھا لیکن دیکھتے دیکھتے اس کی روشنی اتنی پھیلی کہ سارا ہندوستان بقعہ نور بن گیا۔ تین
 سو برس کے بعد حوادث کی تیز آندھیاں اس شدت سے پے پے چلیں کہ سب چراغ
 بجھ گئے سب شمعیں گل ہو گئیں، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، صرف دہلی کے لال قلعہ میں ایک
 ٹٹانا سادیا باقی تھا جس کی بھلک دیکھنے والوں کے دلوں میں عہد رفتہ کی
 ضوافشاںیاں تازہ کر دیتی تھیں۔

بہ ظاہر اس بگڑے ہوئے نقشے کے دوبارہ جننے کا کوئی امکان نہ تھا اور شام
 یاس کے بعد صبح امید کے طلوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن لال قلعہ کی سطوت
 کے مٹتے ہوئے نقوش بھی بہتوں کے دلوں کی تسکین کا سامان تھے۔ آہِ قدرت کو تسکین
 قلوب کا یہ بے حقیقت ساسہارا بھی گوارا نہ ہوا اور "غدر" کی بادِ تند نے اس
 چراغ کو ہی بجھا دیا۔ جس کا سارا فیتلہ قریب قریب جل چکا تھا اور تیل کا آخری

قطرہ سنبھالے کی بے گلاہٹ میں صرف ہو رہا تھا۔

مذہب کے نصریہ خاندان کی قوائے سرورش توانہ تھی بلکہ اسی ہمدادی کا لوحہ اور اسی تباہی کا سرشیر تھی۔

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط و اماں باغبان و کیف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ یہ جنت نگاہ، وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھتے آکر تو بزم میں نے وہ سرور و سورن جوش و خروش ہے
اور آخر یہ بھی دیکھنا پڑا،

واریخ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

بہادر شاہ اور غدر | میرٹھ کی سپاہ جب اپنے انگریز افسروں کو قتل کر کے دہلی پہنچی اور
بہادر شاہ کی مستقل پادشاہی کا اعلان کیا گیا تو ممکن ہے بعض لوگوں کو خیال گزرا ہو
کہ سلطنت مغلیہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے اور اکبر و عالمگیر کی سطوت نے پھر خواب سے
آنکھیں کھولی ہیں۔ لیکن خود بہادر شاہ کی نظروں کے سامنے حقیقت سال بالکل بے نقاب
تھی۔ مرحوم ظہیر دہلویؒ داستانِ غدر میں فرماتے ہیں کہ پادشاہ ایک روز تسبیح خانہ
میں سنگ مرمر کے تخت پر نشترین فرماتے تھے۔ میں (ظہیر مرحوم) حمید خاں جمعدار
خاص برادران فتح علی جمعدار کساران اور حسین بخش غرضی بیگی حاضر تھے،

حضور نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام
کیا ہونے والا ہے؟ حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور! بڑھ سو برس کے
بعد حضور کا اتہال یاد رہا ہے، گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آتی ہے۔" پادشاہ سلامت
نے فرمایا "تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں مجھ سے سن لو کہ میرے بگڑنے کا کوئی
سامان نہ تھا۔ یعنی بنا، فساد مال و دولت، خزانہ، ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں میرے

پاس ان ہیں سے ایک چیز بھی موجود نہ تھی۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ مجھ کو کسی سے کیا خدمت تھی..... میں تو اک گوشہ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے، چار صورتوں کو ہراہ سے ہونے بیٹھا روٹی کھاتا تھا۔ میرے بگڑنے کا کوئی سامان تھا۔ اب جو منجانب، شہ غیب سے میرے میں آگ لگی اور دلی میں آکر بھڑکی۔ فتنہ برپا ہوا، فلک غدار اور زمانہ ناہنجار۔ کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان ایک قلم نابود ہو جائے گا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یہاں آکر پناہ پذیر ہوئے ہیں۔ کوئی دن میں سوا ہوئے جاتے ہیں۔ جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوئے تو میرا ساتھ کیا دیں گے۔ یہ بد معاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے۔ بگاڑ چلا۔ اس کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سرکات کر قلعہ کے کنڈرے پر چڑھادیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے۔ اگر کوئی باقی رہ جائیگا۔ تو آج کا میرا قول یاد رکھے۔

تیموری خاندان کا آخری نام لیوا یقیناً مجبور اور بے بس تھا۔ لیکن قدرت کی عطا کی ہوئی بصیرت سے محروم نہ تھا۔ اس کی زبان پر جو کچھ جاری ہوا۔ آخر پورا ہو کر رہا۔

”تنبیہ“ غالب نے حالات قدر کے متعلق ایک مستقل رسالہ قدیم فارسی زبان میں لکھا ہے۔ جو ان کے کلمات نثر میں موجود ہے۔ اسے حقیقتاً غالب کا ایک پرائیویٹ روزنامہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی تسوید شروع ہوئی تھی۔ تو غالب یا کسی دوسرے شخص کو یقین نہ تھا کہ انگریز ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رسالہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے لکھا گیا تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے۔ بعض حالات کو مصلحتاً نظر انداز کر دیا ہو۔

غدر پر کم و بیش انتہی برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں ملک کی سیاسی فضا کارنگ بالکل بدل گیا ہے۔ زاویہ نگاہ میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے نظریات کی صفیں منتشر ہو چکی ہیں، ان کی جگہ نئے نظریات کے عساکر نے لے لی ہے۔ ممکن ہے آج غالب کی رائے بے لوث نہ سمجھی جائے مگر اس کی تصویب میں بار بار تامل ہو۔ لیکن پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے بے لوث سمجھنے میں تامل کی کوئی وجہ نہیں۔ غالب نے غدر کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کی تاریخ ہی ”سختی بیجا“ سے نکالی تھی۔ اس کے متعدد وجوہ ذہن میں آتے ہیں :-

(۱) وہ طبعاً سکون پسند اور امن دوست تھے۔ اور خوریزہ ہنگامہ آرائی سے نفور تھے۔

(۲) دہلی میں یا دوسرے شہروں میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر ہیکسی کے عالم میں جو ظلم و ستم ہوئے تھے۔ ان سے غالب کے انسانیت دوست دل پر سخت چوٹ لگی تھی۔

(۳) جو انگریز مارے گئے تھے ان میں غالب کے دوست، محب اور شاگرد بھی تھے۔
(۴) مغلیہ سلطنت کے اجیار کے لئے جو کوشش کی گئی تھی۔ وہ بالکل غیر منظم تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مسلمان اور بٹی تباہ ہوئے اور سلطنت مغلیہ کا آخری نقش بھی کلیتہً محو ہو گیا۔

(۵) متعدد اکابر مارے گئے۔ ان کے گھر بار کٹے، جائیدادیں تباہ ہوئیں، اونچے درجے کے خاندانوں کی بساطیں الٹ گئیں اور وہ نان شبینہ تک کے لئے محتاج ہو گئے۔
دہلی کی تباہی کا مرثیہ | لیکن انگریزوں کی فیروزی و فتح مندی کے بعد اہل دہلی شاہی متوسلین اور دوسرے لوگوں پر جو ظلم و ستم ہوئے ان کے اظہار میں بھی غالب نے تامل نہیں کیا۔
”وشتنبو“ میں بھی ان سختیوں اور شدتوں کا ذکر ہے۔ لیکن ان کے اردو مرکاتب کا تو

ہر گوشہ ماتم کے آنسوؤں سے نظر آتا ہے۔ ذاتی حالات اور مالی پریشانیوں کے علاوہ غالب کے درد مندوں نے جس موضوع کو تراثر کے ساتھ فی الفاظ کا ماتمی لباس پہنایا۔ وہ دہلی کی تباہی تھی۔ اس تباہی کا یہ منشور لوح جو اپنی الم ناکی اور درد انگیزی میں کسی منظوم لوح سے کم نہیں۔ چونکہ منتشر و متفرق تھا۔ اس لئے اس کی اہمیت پوری طرح واضح نہ ہو سکی۔ میں نے کوشش کی ہے۔ کہ یہ داستان نظم مرتب ہو جائے۔ غالب کی حالت یہ تھی کہ جہاں موقع مل جاتا، خون کے آنسوؤں سے دامن تحریر کو رنگیں بنا لیتے ہیں نے ان تمام آنسوؤں کو یکجا کر دیا ہے تاکہ غالب کے قلب حزیں کی اس اشکباری کے آئینہ میں دہلی مرحوم کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ جو غالباً کسی اور مرقع میں نظر نہ آ سکے گی۔

دستنبذ کا خلاصہ | مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے "دستنبذ" کے اہم مطالب پیش کر دیئے جائیں۔ جس کا موضوع ہی غدر تھا۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ غدر کا سارا زمانہ غالب خانہ نشین رہے۔ اور وہ تمام حوادث کے شاہد و ناظر نہ تھے بلکہ جو کچھ سن لیتے۔ لکھتے جاتے بے شک حالات سناتے والے معتبر آدمی ہوں گے یا ممکن ہے غالب مختلف ذرائع سے ہر روایت کی تصدیق کر لینے کے بعد اسے قلمبند کرتے ہوں۔ یہ مرقع نہ مفصل ہے۔ اور نہ تمام واقعات و حوادث ترتیب کے ساتھ اس میں آئے ہیں۔ بلکہ رسالہ بہت مختصر ہے۔ نیز اس میں ذاتی حالات یا دوستوں اور عزیزوں کے واقعات کا بھی کافی حصہ ہے۔

غدر کا آغاز | غدر کا آغاز ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :

دیس سال کہ شامہ آں را بہ آئین برآورد (یعنی تاریخ نکالنے کے طریق پر) از "رستخیز بیجا"
برآوردند و اگر آشکارا پرسی یک ہزار و دویست و ہفتاد و سہ (۱۲۸۳ھ) شمرند۔ و شنبہ شانزدہم
ماہ روزہ در مہین مبارک) و پانزدہم مئی سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگزشت
پانک

درود لیا بار بار و بار قلعہ فصیل ادہلی بختیہ دآں جنبش زمین را ز اگر گشت در آں روز جہاں
سوز سخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بہ شہر آمدند۔ ہمہ بے آزر م و شور انگیزد۔
در خداوند کشی تشنہ خون انگریزہ وید بانان دروازہ ہائے شہر ہم پاس نکد
ہم پاس شہر گزاشتند۔ مہمانان تا حواہ یا خزانہ را گرامی داشتند۔ آں سواران سرگران و سبک جلوہ
پیادگان تندخو و تیز و چوں در پایا زود در بانان را مہمان نوازیافتند و یوانہ وار ہر سوستہ تا فتنہ
و ہر کرا از فرمانہ بان و ہر کجا آرا مش گاہ آن مہمان یافتند تا زار نہ گشتند و پاک نہ سوختند۔
روئے ازاں سوہرستا فتنہ۔

قلعہ دار اور ایجنٹ کا قتل | اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ چند گوشہ نشین فقیر جو انگریزی بخشش کی ٹھیل
معمولی مایحتاج سے بہرہ مند تھے۔ شہر کے مختلف حصوں میں جا بجا آباد تھے ان لوگوں
کو رزم و پیکار کے ہنگاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی اور ہوتی بھی تو ظاہر ہے کہ قدر کے
ہمہ گیر سیلاب میں ان کی حیثیت محض تنکوں کی سی تھی۔ وہ اس فتنہ کے انسداد میں
اپنے آپ کو عاجز و معذور سمجھ کر گھروں میں بیٹھ گئے۔
کے ازاں ماتم زدگان منم کہ درخانہ خورشید دم۔

میں نے شور مٹا اور اس کی علت بھی دریافت نہ کر سکا تھا کہ انگریز ایجنٹ اور انگریز
قلعہ دار کے مابین جانے کی خبر ملی۔ ہر طرف سواروں کے دوڑنے اور پیادوں کے پیچھے
کا شور مچ گیا۔ پھر تو۔

ہیچ مشقت خاکے نما نہ کہ از خون گل اندامان از غوان زار نہ شد۔ ہائے
آں جہاں دارین داد آموز و افشاندوز نیکو خوئے نکر نام آوازہ ازاں خاتونان پر ہی جبرہ
نازک اندام بارہمے چوں ماہ تنہ جوں سیم خام و دروغ آں کو دکان جہاں نادیدہ کہ در شگفتہ
روئی بہ لالہ و گل مے خندیدند۔ و در خوش خرمی بہر کسب و تدو آہستہ گزشتند کہ ہمہ یک بار
عیب نکالتے تھے
بہ گوداب خون فرد رفتند۔

عذر کی غائبی و مقصد میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے، لیکن اس ہنگامہ کو کون ایک لمحہ کے لئے بھی جائز قرار دے سکتا ہے ؟

آتشِ عذر کا اشتعال غالب لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے قتل کے بعد یانعیوں نے شہر میں جا بجا ڈیرے ڈال دیئے۔ قلعہ میں باغِ سلطانی کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنا لیا۔ اور شاہی نشیمن کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مختلف مقامات سے خبریں آنے لگیں کہ سپاہیوں نے اپنے سپہ سالاروں کو قتل کر ڈالا ہے۔ اس طرح سپاہیوں اور کسانوں کے جتنے یکدل ہوتے گئے۔ اگرچان کے درمیان کوئی ساز باز اور ٹھوٹی سمجھوتہ نہیں ہو سکتی لیکن سب نے ایک مقصد پر کمر باندھ لیا۔ گویا جھاڑو کی تیلیوں کی طرح سب ایک کمر بند میں بستہ تھے۔ بے شک ہندوستان کو آرائش و آسائش سے بالکل پاک کرنے کے لئے ایسے ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔

آسے رفت و رعب ہند بوم برائساں کہ آرائش و آسائش اگر جو بند باندازہ پرہ کا ہے نیا بند پہنچیں جادوب جیتی آشوب ہے خواست۔

نظم و ترتیب کا فقدان عذر کے تھوڑے ہی دن بعد دہلی میں عام بے نظم شروع ہو گئی تھی۔ ”داستانِ عذر“ میں جو چشم دید حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ غالب لکھتے ہیں کہ لشکر موجود تھے۔ لیکن لشکر آرا نہ تھے۔ سپاہ حاضر تھی لیکن سپہ سالار ناپید تھے۔ فریاد و آواؤں کی مصیبت اور ہندوستان کی ویرانی پر کیوں رونانا آئے۔

شہر ہائے بے شہر پار پراز بندہ ہائے خداوند چنانچہ باغبانے بے باغبان از درختاں

نابردمند رہزن از گبر و آزاد و بازندگان از تنخا۔ خانہ ہا ویرانہ ہا و کلبہ ہا خزانِ نیشہا،

گنہ گمان نہان خانہ نشین تاخریش را آرایند و شوقِ چشمی خویش بہ مردم نمایند و وہ برود چوں

مرثہ ہا بخیر ہا آختہ و نیک مران اسودگی گزیند و میکہ بہ رفتار آیند تا از خانہ بہ بازار

آئند ہزار جا سپر انداخت۔

روشن گھروں پر مصیبتیں | پھر فرماتے ہیں کہ چور لوٹ مار سے امیر بن گئے۔ اور محل و ریشم کے
اور ناکسوں کی شادمانیاں | بستروں پر استراحت کرنے لگے۔ روشن گھروں کے گھر میں تیل
بھی نہ رہا کہ چراغ جلا سکیں۔ رات کی تاریکی میں انہیں پیاس لگتی تو بجلی چمکنے کے منتظر رہتے
اور اسی روشنی میں کوزہ و پیالہ کو دیکھ کر پانی پیتے تھے۔ جو لوگ مٹی فروخت کرنے کے لئے
زمین کھودتے تھے۔ وہ زردار بن گئے۔ جنگی بزم میں آتش گل سے چراغ روشن ہوتے
تھے۔ وہ تاریک گھروں میں ناکامی کے دماغ سے جلنے لگے۔ قاصدوں نے خط لے جانے
تڑک کر دیئے۔ ڈاک کا سلسلہ دہم دہم ہو گیا۔ سارے قاعدے اُلٹ گئے۔ دلیر اپنے
سایہ سے ڈرنے لگے۔ سپاہی شاہ و درویش پر حکم چلانے لگے۔ کیا یہ صورت حال مزادار
ماتم نہ تھی اور اس زار نالی کی ہنسی اُڑاتا جاڑ ہے بد عیب، بات یہ ہے۔ کہ
ان مصیبت ناک واقعات سے ہزاری کا اظہار کیا جاتا تو لوگ ضعف ایدان اور
خرابی مذہب کے طعنے دینے لگتے۔

ہنگامہ عام | باغی شروع میں جو روپیہ اپنے ہمراہ لائے تھے، شاہی خزانہ میں داخل
کر دیا۔ آہستہ آہستہ ہر طرف سے سپاہی جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ شہر دہلی کے
اندراور باہر سوار و پیادہ کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نہ اتنے بڑے
لشکر کو قابو میں رکھ سکتا تھا، نہ اس کا انتظام کر سکتا تھا۔ لہذا خود لشکر کے قابو
میں آگیا۔

شاہ را در میاں گرفت سپاہ دیں گرفتن بود گرفتن ماہ

سلہ غالباً یہ واقعہ خود غالب پر گزرا تھا۔

سلہ میرا خیال ہے کہ یہ بیان بھی ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔

ماہ تو ایسے گئے گیسرد جزیرہ چاروہ نے گیسرد

شاہ ماہ گرفتہ را ماند نہ کہ ماہ دوہفتہ را ماند

گویا پادشاہ کی حیثیت اس چاند کی سی تھی جس کے گرد ہالہ پڑا ہوا ہو۔ باغی جہاں سے گزرتے تھے جیل خانوں کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیتے تھے۔ رہا شدہ قیدی پادشاہ کے حضور میں آکر سرداری کی درخواستیں کرتے۔ اور صوبیداریاں مانگتے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ ہر خواہشمند کو بار اور ہر پناہ طلب کو پناہ کیوں دیئے جاتے ہیں۔

باغیوں اور انگریزوں میں لڑائی انگریزوں کے قبضے میں صرف وہ پہاڑی رہ گئی تھی۔ جو شہر سے جانب شمال مغرب واقع ہے۔ اور زیادہ دور نہیں۔ انہوں نے اسی پہاڑی پر دمے اور مورچے بنا کر توہین چڑھالیں۔ ادھر باغیوں کے قبضے میں جو توہین آئیں شہر کی قیصل پر جا بجا نصب کر دی گئیں۔ لڑائی شروع ہو گئی اور رات دن پتھروں کی طرح گولے برسنے لگے۔

حکیم احسن اللہ خاں پر مصیبت | حکیم احسن اللہ خاں کے ایک پالک نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کر لیا تھا۔ حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے۔ پالک نے اپنی بددیانتی پر پردہ ڈانے کی غرض سے افواہ اڑادی کہ احسن اللہ خاں انگریزوں کا بھی خواہ ہے اور ان کے لئے جاسوسی کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں پادشاہ کے پاس موجود تھے۔ باغی تعاقب میں قلعہ پہنچے اور جاتے ہی حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا۔ اس طرح جان بچ گئی۔ لیکن باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا اور مکان کو آگ لگا دی۔ سارا مکان جل کر راکھ بن گیا، دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو گئیں۔ گویا مکان کے ماتم میں انہوں نے سیاہ لباس پہن لیا۔

لکھنؤ رام پور اور فرخ آباد کے حالات | دہلی سے باہر کے حالات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تفضل حسین خاں

رئیس فرخ آباد نے پادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی۔ خان بہادر خاں نے بریلی میں لشکر جمع کیا۔ ایک سو ایک اشرافی، تقریبی سازد سامان سے آراستہ گھوڑا اور ہاتھی کی تذر بدرگاہ شاہی میں پیش کی۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور دل سے انگریزوں کے دوست تھے۔ لیکن ہمسایوں کے طعنوں اور شرابی انگریزوں سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی مصلحتاً پادشاہ کی خدمت میں زبانی پیام ارسال کیا۔ لکھنؤ سے کچھ انگریز بھاگ کر محفوظ جگہوں پر پہنچ گئے۔ جو باقی بچے وہ بیلی گار دیں حصار بند ہو گئے۔ شرف الدولہ نے ان کے وجود سے بے پروا ہو کر واجد علی شاہ کے ایک وہ سادہ فرزند (برجیس قدر) کو تخت پر بٹھایا اور اسے پادشاہ ہند کا وزیر قرار دیا اور اپنے لئے وزیر کے پیشکار و ستیاز کا لقب تجویز کیا۔ پادشاہ کے لئے ایک گراں بہا نذر بھیجی جس میں دو گھوڑے اور دو ہاتھی تھے۔ ایک زرین کلاہ ارسال کی جو رنگ رنگ کے ناباب گوہروں سے مزین تھی نیز الماس کے بازو بندوں کی جوڑی اور بعض دوسری چیزیں اس نذر میں شامل تھیں۔

کشمیری دروانے پر یہ حالات لکھنے کے بعد غالب دفعہ ۱۴ ستمبر کے واقعات پر پہنچ گئے۔ انگریزوں کا حملہ جب انگریزی سپاہ نے کشمیری دروازہ پر حملہ کیا اور باغی شہر چھوڑ کر بھاگے۔ انگریزی حملے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مئی گزردہلی بروں بروداد ستمبر ستم برد، آورداد
پس از چار ماہ و پس از چار روز فروزندہ شد مہر گیتی فروز
تہی گشت دہلی زد یوانگاں بہ مردی گرفتند فرز انکاں

۱۵۔ ابتدائیں بیان دودہ شاہان دہلی کے وزیر تھے اور ان سب کو نواب زبیر احمد کہا جاتا تھا غازی الدین حید کے زمانے میں دہلی کے اثر و رسوخ کو کمزور کرنے کی غرض سے انگریزوں نے دودہ میں پادشاہی کا ڈول ڈالا اور غازی الدین حید کو نواب وزیر کے بجائے "شاہ کے لقب سے ملقب ہوئے۔ شرف الدولہ نے دہلی کے ساتھ پڑانے تعلقات کی تجدید کو پیش نظر رکھتے ہوئے برجیس قدر کو "شاہ" نہیں بلکہ "نواب وزیر" بنایا۔

اور دہلی دروازہ کے درمیان واقع ہے اور دونوں دروازوں سے قریباً یکساں
فاصلہ پر ہے۔ لوگ جوق در جوق شہر سے نکلنے لگے لیکن میرے دل میں نہ
گھبراہٹ پیدا ہوئی اور نہ میں اپنی جگہ سے ہلا رہا۔

نقتم کہ چوں گنہگار نیستم بہ سرزنش سزاوار نیستم۔ نہ انگلیسیاں، گناہ کش، نہ آب ہوائے
شہر ناخوش۔ مرا چہ افتاد کہ در اندیشہ ہائے تباہ افتم و افساں و خیراں براہ افتم
در گوشہ بے گوشہ، با خامہ سیاہ ہم زبانم نیم از مرثہ شور اب بار و ہم از رگ خامہ
خونبارہ فشاں ..

پڑتید ستم دے برگ خدایا تا چند

بہ سخن شلو شوم کایں گرا زہ کال من است

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ | ۸ اکتوبر کو شہر و قلعہ پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد۔

خونخاے زرد و کشت و گیر و دہ بدیں کوچہ نیز رسید و ہمہ را اندھیم دل و دھیم شد۔ بایہ۔

دانست کہ اس کوچہ ہز یک راہ و بیش از وہ دوازده خانہ دار و ہز دو چاہ دریں

کوے نیست۔ بیشتہ نزن و مرد بدیں نور و کہ زن را بچہ در آغوش است و مرد

نشوارہ بر دوش، بدر زدنہ و تنے چند کہ بجا مانده اند بہ ہمہ داستانی من ..

در زوروں بستند ویرا من آں سنگ بہ سنگ ہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سر نہ بود

در بستہ نیز شد۔

مہاراجہ پٹیالہ کی سچی | اسی کوچہ میں شریف خانی خاندان مقیم تھا۔ حکیم محمود خاں، حکیم

مرتضیٰ خاں اور حکیم غلام اللہ خاں جو حکیم شریف خاں کی اولاد میں سے تھے، سرکار

پٹیالہ میں ملازم تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے محاصرہ دہلی میں انگریزوں کی پوری امداد کی

تھی اور عہدے لے لیا تھا کہ فتح کے بعد حکیموں کے کوچے پر پٹیالہ کا پرہ بٹھایا جائے گا

تاکہ انگریزی لشکر اہل کوچہ کو گزند نہ پہنچا سکے چنانچہ ۱۸ اکتوبر کو مہاراجہ کے سپاہی اس

کوچہ کی حفاظت کے لئے پہنچ گئے۔

شہر کی حالت | غالب لکھتے ہیں کہ ۱۵ اکتوبر سے شہر کے تمام مکان اور دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ گندہ فروش تھا، جس سے دانہ خریدیں نہ دھوبی تھا جس سے کپڑا دھوئیں نہ حجام تھا جس سے اصلاح ہو آئیں، نہ خاک روپ تھا جس سے مکان صاف نہ آئیں۔ جب تک کوچے کا دروازہ کھلا تھا چیزیں لے آتے تھے لیکن جب دروازہ بند کر کے پھر چن دیئے گئے تو جو کچھ پاس تھا اسی پر قوت لایموت کا مدار رہ گیا۔ یہ سامان خورد و نوش ختم ہو گیا تو درائیں اور دون بھوکے پیاسے گزارے۔

پانی کی تلاش | جب مہاراجہ کے پہرہ دار آگئے تو انہوں نے بتایا کہ کوچہ میں پانی چوک تک تو پھر سکتے ہو، اس سے آگے جانا خطرناک ہے۔ چنانچہ دروازہ کھولا اور مختلف گھروں سے آدمی ڈول، مشک، پاکھال وغیرہ لے کر پانی لانے کے لئے نکلا۔ باب کے دو ملازم بھی ساتھ تھے۔ بیٹھا پانی دور تھا اور وہاں تک پہنچنا دشوار تھا، ناچار نیمہ شور پانی لے کر واپس آئے۔ جو لوگ پانی لانے گئے تھے انہوں نے واپس آکر بیان کیا کہ شکریوں نے چند مکانوں کے دروازے توڑے لیکن نہ آٹا ملا نہ گھی ملے آیا۔

بددستی کہ زندہ نیار زند کی میگڑانیم نہ کس سے آید کہ گفتارش بلوش خورد و نہ خود برون سے رویم تاویدہ دیدیندہ لکرو۔ ہر آئینہ سے تو اغم گفت کہ کوئیں سے کہہ رہے ہیں۔ کور دیرون ازاں گوگوسے و کشکش نان ماشیریں است و آب ماشورہ روز سے ناہاں برآمد و باران بارید پادریے بستیم و خے زیر آں نہادیم و آب گرفتیم گوید و آب زور دیر و دیر زمین فرو بار و دریں بار بار گرانا یہ آب آورو ہر آئینہ آنچہ سکندر در پادشاہی جست و نیافت ایں تلخ کام شور آسیم در تباہی یافت۔

یہ غالب کی حالت تھی جس کے کوچے کی حفاظت کیلئے مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہی

مقرر رستے کے پینے کو پانی میسر نہیں تھا۔ یہ نہ بڑا تو چادر باندھ کر اس میں مینہ کا پانی جمع کیا اور ملٹکا بھرا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ان غریبوں اور مسکینوں کی کیسا کیفیت ہوگی جن کا کوئی نگران و پاسباں نہ تھا۔ یہ کہ دہلی انوں نے جس طرح عشرت و شادمانی کے بہترین دور دیکھے اسی طرح بدترین دوروں کی تلخ کامیاں بھی برداشت کیں ان کی نگاہوں نے جہاں نعمت و جلال کے درخشاں مناظر میں صدیوں غواصی کی وہاں نادار شاہی ترکمان اور غلامی ہنگامہ آراہی کے خونین سیلاب بھی اپنے سروں سے گزاریے۔ آج کو ان اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کامیابیوں نے کیسے کیسے دکھ سہے ہوئے اور کیسی کیسی سختیاں اٹھانی موں گی۔

غالب سنہ ۱۸۵۷ء اپنی شاندار سیاحت بھارتی کی دیوانگی اس کا گھر بار لٹنے اور مرنے کے حالات بھی لکھتے ہیں۔ انگریزی درجہ کی تعینات بیاباں کر لیں بھی شامل نہیں کیا لیکن لکھتے ہیں کہ خود نگر بیڑوں پر سختیاں ہو چکی تھیں ان کے انتقام میں اگر وہ دہلی میں کتوں اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تو بجا ہوتا۔ تاہم انہوں نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور جو زیادتیاں کیں ان کی نسبت یوں سمجھ لو کہ جب کسی جگہ کو جنگ کے بعد فتح کرتے ہیں تو وہاں کے آدمیوں پر زما اس قسم کی سختیاں ہوتی ہیں۔

اب شہر کی پریشانیوں | بھر فرماتے ہیں :

از فردماندگان شہر بسیارے را مردوں را ندانند کے ہم چیں در بندیم دامید فردماندہ

اندر در مارہ ہمایان کرداں و بختہ کشیں بچ فرماں نیست مگر در دہروں رفتگان دروں

تفتگان را در مان نیست کاش روئیاں و مردنیوں را نہ در سب یک گراہی ہوئے

تا بے تابی و پرگاہی روئے نہ سوئے

غالب انگریز کرنیل کے پاس گئے اور اکتوبر کو چند گورے دیوار بچانہ کر اس کو چھپیں آگھنٹے جہاں غالب کا مکان تھا۔ ہمارا جہ پنیارہ کے سپاہیوں کی روک تھا مگر بی بے اثر رہی۔ وہ دوسرے

گھروں کو چھوڑ کر غائب کے مکان میں پہنچ گئے۔ لیکن سامان کو ہاتھ نہ لگایا۔ بلکہ
غائب کو باقر علی خاں حسین علی خاں بچند ملازموں اور دوسرے جمہوریوں سمیت کرنیل
براون کے پاس لے گئے جو دو تیر مرتبہ کے فاصلے پر قطب الدین سوداگر کے مکان
میں مقیم تھا۔ کرنیل نے نام پتہ اور حالات پوچھ کر اسی روز سب کو واپس کر دیا
خاندان لونا۔ دو تین ہفتے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب شہر فتح ہوا

تو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں اہل و عیال سمیت تین ہفتیوں
اور چالیس گھنٹوں کے ساتھ لونا۔ دو کی طرف روانہ ہو گئے۔ آرام کی غرض سے دو تین
روز کے لئے مہرولی میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں لشکریوں نے ان کا سارا سامان لوٹ
لیا اور صرف تین ہفتی باقی رہ گئے۔ بے وسامانی کے عالم میں دو جان پہچانے جہاں
کے رئیس حسن علی خاں نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو بادشاہ یہاں لے جایوں
کے ساتھ کیا تھا۔ کشتہ دہی کو ان کے حالات کی اطلاع تو امین الدین اور ضیاء الدین
کو اپنے پاس بلا لیا اور درشت گفتگو کی لیکن نرم جواب سن کر کچھ نہ کہا۔ ایوان خاندانی
کے پہلو میں قلعہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جو سامان ساتھ لے کر نکلے تھے وہ مہرولی میں
غارت گروں کی نذر ہوا۔ وہلی میں ان کے مکان میں پتھروں اور اینٹوں کے سوا کوئی
چیز باقی نہ رہی۔ زبردست اور گسٹرونی و پریشدنی کے نقصان کا اندازہ مشکل ہے۔

دوسرے روز ساکی گرفتاری دو تین روز کے بعد عبدالرحمن خاں والی جھجھ کو پکڑ لائے اور
دیوان عام ٹھہرایا۔ ۳ اکتوبر کو احمد علی خاں والی فرخ نگر کو لے آئے۔ ۲۰ نومبر کو بہادر
جنگ خاں والی بہادر گڑھ گرفتار ہوئے اور ۲۰ نومبر کو راجہ ناپیر سنگھ والی بلب گڑھ
اسیر ہو کر آئے۔ وہلی کے ماتحت سات جاگیردار باں تھیں جنہیں یا بہت سخت کاٹتے تھے

۱۰ بیان کیا جاتا ہے کہ کرنیل نے غائب پوچھا تھا کہ تم مسلمان ہو؟ جواب دیا کہ آدھا تمیز پیتا ہوں سو نہیں کہتا

تھے۔ یعنی لوہارو جھڑ۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ، فرخ نگر۔ دوجانہ اور پانڈونی۔ پانچ جاگیردار
پکڑے گئے بقیہ دو معرغیں بہیم میں تھے یعنی رئیسان دوجانہ و پانڈونی۔

حسام الدین حیدر خاں | مظفر الدولہ سیدت الدین حیدر خاں اور محسن الدولہ ذوالفقار الدین
کے نانداں کی تباہی | حیدر خاں حسین مرزا جو حسام الدین حیدر خاں کے فرزند اور شہر کے
معرز آدمیوں میں سے تھے اپنا بھرا بھرا چھوڑ کر زن و فرزند سمیت باہر نکل گئے۔ گھڑ لٹ گیا
بیش بہا ساز و سامان غارت گروں نے اٹھالیا، بعد ازاں مکان کو آگ لگا دی بارت ٹری
سے جو کچھ بچا تھا وہ آگ کی نذر ہو گیا۔

پاشاہ اور شہزادے | شہزادوں اور پادشاہ کے متعلق لکھتے ہیں،

از شہزادگان بیروں ازیں نتوان سرود کہ اندے را زد یات مرگ بہرمان زخم گلو ز تفتک فرد
بر دو چندے را جسم بند چا تو بہ گشاکش رس رواں در تن فسرد۔ افسردہ مند از مہر ندان
نشین، اندو شمر د چند ازاں دو دماں، آوارہ روئے زمین، بر باد شاہ، رگ آرم گاہ کہ ماتم زودہ تاب
توان است فرمان گیر و دار بہ اندازہ باز پرس روان است۔

یعنی شہزادے یا گولی سے مارے گئے یا پھانسی پا گئے جو باقی بچے وہ یا توفیق ہو گئے
یا چھپ چھپا کر بھاگ نکلے اور آوارہ و سرگردان پھر رہے ہیں۔ بادشاہ ضعیف و
ناتواں پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جھڑ، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے رُسا کو ایک ایک کر کے
پھانسی پر لٹکادیا گیا۔ غالب کس درد سے لکھتے ہیں :-
کوئی بد انسان کشتہ کہ کس نیار و گفت خون ریختند۔

مسلمانوں پر سختیاں | جنوری ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت
مل گئی لیکن غالب فرماتے ہیں :-

مسلمانان از خانماں آوارہ را از بسکہ از رستن سبزہ در و دیار خانہ ہائے آناں سبز است ہر دم

از زبان سبزہ سر دیو، ن این نوا بہ گوشے خورد کہ بجائے مسلمانان سبز است۔

مسلمانوں پر سختی کی کیفیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص نے
حاکم شہر کے پاس شکایت کی کہ شریف خانی خاندان کا مکان ۷۰ مارا بھ پٹیا لہ کی حفاظت
میں ہونیکے باعث مسلمانوں کی جاسے پناہ بن گیا ہے، ممکن ہے اس میں باغی بھی چھپے
بیٹھے ہوں تو ۲ فروری ۱۸۵۸ء کو سپاہیوں کا ایک سہ ماہی مکان پر پہنچا اور حکیموں کو ساتھ آدمیوں سمیت
لے گیا۔ ۵ فروری کو حکیم محمد خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور انکے علم راہ بھائی عبدالعظیم خاں عرف کا حکیم
صاحب یا ہو کر آگئے چند روز کے بعد کچھ اور آدمی چھوٹ آئے۔ بقیہ اپریل میں لے یا ہوئے۔
۲۴ فروری ۱۸۵۸ء کے حالات ۲۴ فروری کے واقعات میں لکھتے ہیں :-

چوں روز شب گشت و ازاں شب سہ پہر گزشت در دل داد و خراہاں ہر ماہ شب افروز
بد انسان راہ گرفت کہ نگرند کاں بے خواست فداں برداشتند کہ ماہ گرفت تادانی کہ دریں شہر
زندہ از شہر بیرون است نو خانہ اندرون دریں ہر دو جہاں فایہ مروج راہم در آوردند کہ پنداری پیکر پرکریہ ہے
خود شامہ، نال کہ زیں ہر دو بندی خانہ در مذلتے ہر گاہ یہ پیش پیمان جاں باختہ اند فرشتہ جانساں بے اند
غدار مئی ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ ۱۸ ستمبر کو انگریز دوبارہ دہلی پر قابض ہو چکے تھے لیکن
غالب ۲۴ فروری ۱۸۵۸ء کے حالات میں لکھتے ہیں :-

مسلمان در شہر از ہزار کس افزوں نیابی۔ نامہ نگار غالب (نیز در ان ہزار ایکے است :-
گو یا پانچ ماہ دس روز گذر چکنے کے بعد بھی مسلمانوں پر سختی کا یہ عالم تھا کہ شہر میں
ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ کچھ مسلمان اس قدر دور نکل گئے
تھے کہ گو یا دہ دہلی کے باشندے ہی نہ تھے۔ بہت سے شہر کے ارد گرد دو دو چار چار
کوس پر گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح سوئے پڑے تھے۔
قیمتی اثاثہ لٹ گئیں | غالب امیر آدمی نہ تھے۔ ان کا گزرا پینشن اور تنخواہ پر تھا۔ آمدنی
کے یہ دونوں ذریعے غار کے ساتھ ہی مسدود ہو گئے تھے۔ اثاثہ بیت میں سے جو
قیمتی چیزیں پاس تھیں۔ ان کی کیفیت سن لیجئے :-

کہ بانو (یعنی بیگم غالب) بے آنکھ بہ من گوید چیز مائے گراں از راز زبور درخت ہرچہ داشت نہانی
در خانہ کلے صاحب پیر زادہ فرستاد تا در آنجا در نہا نخلہ نگاہ داشتند و در بہ کل اپنا شستند
چوں لشکر آریاں شہر را کشودند و لشکر بایں فرماں بخیا یافتند راز دان آن راز با من در میان نہا
کل از دست رفتہ بود و دفعتن و آوردن را گنجائی نہ ماندہ۔ تن نرم و خود را بدار فریختہ کہ چون تھی
بود، نیک است کہ از خانہ من نہ رفت۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ پنشن کا سررشتہ گم ہے اور بھنے بچھونے کی چیزیں بیچ
بیچ کر تن پرور می کر رہا ہوں۔ دوسرے روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں۔ اب
اندیشہ یہ ہے کہ جب کپڑے ختم ہو جائیں گے تو برہنگی اور گرسنگی دونوں کا شکار
ہو جاؤں گا۔

بہادر جنگ اور لوہارو | بہادر جنگ خاں رئیس بہادر گڑھ کا فیصلہ ۱۸۵۶ء کو
والوں کا فیصلہ | ہوا۔ ان کی ریاست چھین گئی، ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن مقرر
ہوئی اور انہیں لاہور روانہ کر دیا گیا۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بیگناہ
ثابت ہوئے اور ان کی ریاست واپس مل گئی۔ لیکن یہ واقعہ و ستنبو میں مذکور
نہیں جو جولائی ۱۸۵۸ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے اور لوہارو کی جاگیر جولائی
کے بعد واگزار ہوئی۔

ناقابل بین مصیبتیں | اب اردو مکیاتیب میں غدر کے واقعہ مائلہ کی نوحہ خوانی ملاحظہ فرمائیے۔
ابتدائی تحریرات اگرچہ بہت مجمل ہیں لیکن بے حد درد انگیز ہیں مثلاً حکیم غلام نجف خاں
کو لکھتے ہیں اور اردو میں غدر کے متعلق غالب کی شاید یہ پہلی تحریر ہے

میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے۔ کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔
نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمہ میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں
نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

پھر ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں،

انصاف کرو لکھو تو کیا لکھو؟ کچھ لکھ سکتا ہوں یا لکھنے کے قابل ہے؟ تم نے جو کچھ کو
لکھا تو کیا لکھا، دراب میں جو لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں۔ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک تم ہم
جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔

۹ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک مکتوب میں حالات دہلی کی بے یقینی کا نقشہ ان

لفظوں میں کھینچتے ہیں،

جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے گیا
کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لئے برجی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔
اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے، ورنہ نالہ و انالہ راجعون۔

ہولناک انقلاب | غدر ایک زلزلہ تھا جس نے سب کچھ زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ غالب
کے دل پر اس انقلاب کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ غدر سے پیشتر کے دور اور بعد کے دور
کو دو الگ الگ عالم سمجھنے لگے تھے، یا کہ نا چاہیے کہ ہندوؤں کے اسلوب تعبیر کے مطابق
دون بدل گئی تھی، جنم تبدیل ہو گیا تھا، ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں،

ساحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم
باہم دوست تھے، اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے شعر
کہے دیوان جمع کئے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے، وہ ہمارے تمہارے دلی دوست تھے۔

منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات
نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند رات کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا، اگرچہ صورت اس جنم کی تعبیر

مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا، اس کا جواب آیا، ایک خط
تمہارا کہ تم بھی موسوم پر منشی ہر گوپال و متخلص بہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں، اس کا
نام دہلی اور اس محلے کا نام بلی ماراں کا محلہ، یکس ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے

میں پایا جاتا۔

پھر اپنی حالت لکھتے ہیں کہ میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں رہتا ہوں بلکہ یہ دیوار یکسوں کے گھر میں جو راجہ نرندر سنگھ والی پٹیا لہ کے ملازم ہیں :

راجہ نے صاحبان عالی شان سے عہد کیا تھا کہ بوقت غارت دہلی یہ لوگ محفوظ رہیں گے چنانچہ بعد فتح راجہ صاحب کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوہ محفوظ رہا اور نہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں ۔

ہم گہر ویرانی | ویرانی شہر کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں :
مبالغہ نہ جانتا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار پیش در دولت منداہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور واروگیر میں مبتلا ہیں مگر وہ لوگ جو اس ہنگام میں نکلے ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں :

غدر سے بے تعلقی | غالب نے اگرچہ غدر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا تاہم قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق بہ ہر حال موجود تھا۔ اس لئے اپنی بے گناہی اور سرکشوں سے بے تعلقی کا پہلو ابھارنے کے لئے اس ویرانہ تعلق کو بھی حقیقت ظاہر کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں :

میں غریب شامزدوس رس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دیتے پڑھیں ہوا ہوں
خدا ہی اس کو نوکری بھجو خواہی مزدوری۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں نے
دخل نہیں دیا۔ اور نظرائی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں
ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف باد ساسی دفتر میں سے یا مخبروں کے ہاں
سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہذا ابھی میں ہوں۔ ورنہ چہاں بڑے بڑے جاگیردار ہلاک
کئے۔ (مثلاً نوٹار و والے) یا پکڑے ہوئے (مثلاً جھڑ بلب گڑھ، بہادر گڑھ، فرخ نگر،

والے) اُسے میں میری کیا حقیقت ہے۔

ماریشل لاء | شہر کی ویرانی کا قرحہ ایک اور جگہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نہیں جا سکتا۔ سو رہا ہوں۔
 تو بڑی بات ہے۔ یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں سڑکوں پر۔
 کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ بزم سیاست پائے جاتے ہیں۔ بریلی بن و دست باہر۔
 یازدہم مئی سے آج تک مئی شنبہ پنجم: ممبرانہ نمک۔ پوسٹ۔ پتہ کچھ نیک باد
 کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ منور ایسے امور کی طرف حکام رنجیدہ ہی نہیں۔
 دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

قاریم نوں میں تیار ہی اچھو دھری عبور الغفور میں نور مارا۔ سرور مئی کو لکھتے ہیں:

میں معزن و فرزند بہ وقت سی تیرہ ماہ تدریس حوں کا ستہ در تیار ہوں۔ دروازے
 سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پائیا گیا۔ نہ فید ہوا۔ نہ مارا گیا۔ کیا مرض کردوں میرے خدا نے
 مجھ پر کسی عنایت کی۔ ویکس مٹھ سٹھ۔ ماں و امرو میں: کی فرقہ نہیں با

اندر ہوا۔ میں نے نہ ملے۔ انما لب نے غیر کے بعد خود بھی کسی نگہ پر افسر سے ملنے

کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ دار و گیر نے زمانہ میں اکثر لوگ اس پتہ بچاؤ کے ساتھ

جھوٹے افسانے بنائے کہ حکام کی اندروں میں انتخابات جس سر پر ہے لکھتے۔

جہاں ساز مجبوروں کا بہت زور ہو گیا تھا۔ تاثیر کے ان مجبوروں جو کی مدد پرانہ

کے باعث بھانسی پاسے۔ غالب لکھتے ہیں:

فردی نہیں ہوں۔ رہ پوتی ہیں، بلایا نہیں تیار۔ روگیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی

مارہیں۔ اندر ملایا بکس کا۔ گھیر مار جیسا بلایا ہیں چاند بھی۔ دوست غار میں تیار۔

کسی حاکم سے ہیں ملا جلا کسی کو نہیں مانتا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی مئی سے

پانچن بند سے کہو یہ دس مہینے گزر گئے۔ ہر گز۔ انجام کچھ نہیں تاکہ لیا ہوگا۔

مسلمان بدست تم تھے جیسا کہ ”دستبنو“ میں بیان ہو چکا ہے مسلمانوں پر سب سے بڑا ہکر سختی تھی۔ غالب فرماتے ہیں :-

واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیہ کیا غریب کیا اہل حرقہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہندو البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں :-

یعنی شہر سے نکلنے میں ہندو اور مسلمان برابر تھے لیکن آبادی میں ہندوؤں کے ساتھ رعایت برتی گئی اور مسلمانوں پر یہ دستور سختی اور شدت جاری رہی ایک درجہ لکھتے ہیں :-
ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں :-

بلا اجازت قیام کی ممانعت | غدر کے بعد کچھ مدت تک یہ حالت رہی کہ نہ باہر سے کوئی شخص بے اجازت شہر میں آ سکتا تھا اور نہ بے اجازت قیام کر سکتا تھا۔ اسی زمانے میں چودھری عبد الغفور خاں سرور مارہروی نے غالب سے ملنے کے لئے دلی آئے گا قصد کیا لیکن چودھری صاحب کے چچا نے انہیں روک دیا۔ یہ حالات غالب کو معلوم ہوئے تو لکھا،

آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے زہار کبھی گمان نہ کیجئے گا کہ دلی کی عملداری میرٹھ، آگرہ یا بلاوہ شہر قیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے، نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جوراٹے ہو وہ دیسا ہی عمل کرے :-

دہلی والوں پر مسلسل جو سختیاں ہو رہی تھیں ان کی کیفیت ایک مکتوب میں یوں بیان فرماتے ہیں :-

رنج فتنہ و فساد اور بلاوہ میں مسلم یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بڑے ٹھہر گئے ہیں۔ یہ داغ ان کی تبیین حال سے عموماً مرٹ نہیں سکتا :-

میر ہمدی مجروح نے پنشن کے متعلق پوچھا لکھتے ہیں :

کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ،

ہے موجزن اک قلم خوں کا ش یہی ہو

آٹا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے

آرزندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی ۔

شہر سے باہر کے مسلمانوں کو مدت تک شہر میں آنے کی اجازت نہ ملی ، ناچار بعض نے

مکانوں کا انہدام شہر سے باہر مکان بنانے شروع کر دیئے ۔ لیکن حکم ہوا کہ یہ مکان

منہدم کر دیئے جائیں ۔ غالب لکھتے ہیں ۔

کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے

ہیں انہیں گرا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج تک یہ صورت ہے

دیکھئے شہر کے بسنے کی کونسی صورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا

جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آئیں ۔ اللہ اللہ واللہ

شہر کی آبادی کی افواہ ۱۸۵۸ء میں افواہ اڑی تھی کہ جنوری ۱۸۵۹ء سے

سب لوگوں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل جائے گی ۔ غالب کہتے ہیں ،

خلق نے اڑوئے قیاس جیسا کہ دہلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے ۔ یہ بات اڑادی ہے

اور سارے شہر میں شہرہ ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد

کئے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیئے جائیں گے ۔ خیر آج

بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے ۔ اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا

دن ہے اگر چیتے ہیں تو دیکھ لیں گے ،

یہ افواہ غلط نکلی ۔ کافی دیر کے بعد پہلے یہ حکم ہوا کہ صرف مالکان مکان شہر میں

آباد ہوں ، کہ یہ دار آباد نہ ہوں ۔ بعد ازاں کرایہ داروں کو بھی آبادی کی اجازت ملی

غالب ۹ نومبر ۱۸۵۹ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

اُسے حکم تھا کہ ماٹن مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں پیرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی ہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی رہیں مگر سرکار کو کرایہ دیں۔

شہر کے دروازوں پر پیرے | انگریز ۱۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے۔ لیکن جنوری ۱۸۵۹ء تک شہر کے دروازوں پر پیرے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب اواخر جنوری ۱۸۵۹ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کیلئے میرٹھ گئے تھے۔ تین چار روز کے بعد واپس آئے، تو ایک خط میں مجروح کو لکھتے ہیں :-

روڈ اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں۔ لاہوری دروازہ کا کھانا دار مونڈھا بچھا کر مٹک پر بیٹھتا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یادوروں پر جبر مان لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔

ان کو آٹھ کا اندازہ کیجئے اور سوچئے کہ اہل شہر کی کیا حالت ہوگی :-

ایک اور خط میں جو اواخر مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے، فرماتے ہیں :

اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی، آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس پہلے میں برابر وہی سورت ہے۔

پھر لکھتے ہیں :

شہر کی آبادی کا چھوٹا ہوا۔ کرایہ کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہو گئے تھے کہ پندرہ

۵۵۵ مرت گیا۔ اب حد جانے کیا دستور جاری ہو رہا ہے۔

میر جوں کے بڑاگ | دسمبر ۱۸۵۸ء کے آخر میں مسلمانوں کی ملکیتیں و گزائر ہوئیں۔
غالب فرماتے ہیں،

مسلمانوں کی املاک کی داگڑاشت کا حکم عام ہو گیا ہے جس سے لڑائی پڑائی میں ان کو مزید
معاذ ہو سکتا ہے۔ آج ایک شہر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ وہاں پر تھا جس کا نام یہ ہے۔
مخرج کو یہ خط اکھڑا ہوں اگر مناسبت جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پا کر پاپا ہو
یہیں رہو، چاہو چلے جاؤ۔

شراب ناہید تھی | غالب کے لئے خدر کے بعد ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ شراب
نہیں ملتی تھی یا بہت گراں ملتی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں،

نہ کہیں جانے کا ٹھکانا ہے نہ کوئی میرے پاس آنے والا ہے۔ وہ خرب جو بہ قدر
ضرورت طاقت خائے رکھنا تھا، میر نہیں۔

۱۴ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں بابو گووند سہاسے کو لکھتے ہیں،
دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس تین اور ایک دلڈ نام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا
اور یہ دونوں قسم ہیں روپے چار ہیں روپے درجن آتی تھی اب یہاں پہلے تو نظر ہی
میں آتی تھی۔ اب پچاس روپے اور ساڑھے دس روپے درجن آتی ہے۔ وہاں سے تھوڑا
کر داس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کر دو کہ ہر طریق ڈاک پہنچ سکتی ہے۔ یا
نہیں۔ جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلف ہے۔ یہ گڑبھاں کی شراب میں نہیں پیتا۔
یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔

۵۵۶ ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں

شراب قندی بڑوستان و ماظم سوخت
دوسری جگہ لکھتے ہیں،

غالب شرب قندی بندہ دماغ سوخت
نہیں بعد بادہ داسے گوارا کشیدہ باد

محکمہ معاوضہ | یہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک محکمہ معاوضہ قائم ہوا تھا،

ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے قائم ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ رعیت کا مال جو کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب وہ ایک دس روپے میں سے ایک روپیہ) سرکار سے ہوگا یعنی ہزار میں سے ایک سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہر اور محل ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ کالوں کے ہاتھوں وہی لوگ نئے ہوں گے جو انگریزوں کے وفادار تھے یا جن پر وفاداری کا شبہ ہو سکتا تھا۔ ان کو معاوضہ ملا جو لوگ گوروں کے ہاتھوں نئے وہ زیادہ تر بے قصور تھے۔ غدر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ البتہ وہ دہلی کے باشندے تھے۔ اور غدر ہو جانے پر بھی شہر کی سکونت ترک نہیں کی تھی۔ مثلاً خود غالب کے بھائی کا مکان لٹا، بیگم کا زیور اور دوسری قیمتی چیزیں لٹیں۔ یو یار و والوں کا گھر لٹا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی انگریزوں سے باغی نہ تھا۔ اور نہ غدر میں کسی نے سرکشوں کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہ ملا۔

دوستوں کے مفارقت کا قلق | غالب کو ایک بڑا رنج اس بات کا تھا کہ ان کے اکثر دوست اور ملنے والے غدر میں مارے گئے یا تباہ ہو گئے۔ فرماتے ہیں،

کوئی یہ نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان رو سیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ بندوستانوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ مائے اتنے یار مرے کہ

جواب میں مردوں کا تو میرا کوئی رشتہ والا بھی نہیں ہو گا۔
پھر لکھتے ہیں :-

بھائی وہ انہی سب کو سینکڑوں عزیز رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ
کہ انکی عزت و قیمت کی خبر نہیں جو دوپارہتی سب سے پیدا جاتے کہاں ہیں کہ تم انہی کو دیکھنے کو کہتے ہیں۔
ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

ہزار ہا دوست مر گئے کس کس کو یاد رہا اور کس کو یاد رہا، جیوں کوئی غمخوار نہیں وہ مردوں کوئی عزت دار نہیں۔
ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس بائیس برس میں مر گئے خصوصاً اس فقیر و آشوب میں
دندریں تو شاید میرا کوئی جاننے والا نہ بچا ہو۔

غالب بہت معزز تھے تمام حکام ان سے دوستانہ تھے لیکن وہ ہیں ہر شے متطلب و شہر
تہ وہ حکام جن کو میں جانتا تھا نہ وہ عملہ ہی سے میری ملاقات تھی نہ وہ عدالت کے قواد ہیں جن
کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا بزرگ روزگار کا تاشاد بکھرا
ہو یا حافظ و یا حفیظ و دروڑاں ہے۔

فقیر اور صحابہ اسلحہ پر پابندی آج بھی اس پر بند ہیں اٹھ گھنٹہ شہر میں آج وقت کی اجازت
سگنی تو تیرہوں اور ہتھیاروں کو اس اجازت سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔
فقیر اور ہتھیار میں پس ہو وہ نہ آئے باقی چند مسلمان عورت مرد سوار چارہ ہر حال ہے چھوڑا
چھوڑا آئے مگر بغیر اجازت کے رات کو شہر میں رہے نہ پاسے۔

شہر میں کوئی تھا اس زمانے میں فشی شب و رات آرام نہ آئے تھے انہی کے تھکاؤ و خستگی سے
بھی استدعا کی تھی کہ پھر خریدار فراہم کئے جائیں۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے :-

وہاں آدمی کہاں ہیں کہ انہی کے خریداروں میں صاحبین و گھڑیاں بستے میں وہ ڈھونڈ سکتے ہیں کہ گھوڑا
کہاں سمیتے ہیں بہت سخی ہو گئے تو جنس پوری دیں گے کاغذ، خبر، پیسے، کیوں مہربانیں گے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار روپے چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نہ رہے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دسے اور ٹکٹ لے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے ٹکٹ آبادی درون شہر۔ شرط ادغال جرمانہ بقدر روپیہ کی حاکم کی رائے پر آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے کل نوار تعطیل ہے۔ پرسوں دو شنبہ سے دیکھئے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جاتے نہیں۔ مگر یہاں آباد ہونا۔ تھانوں پر حکم پہنچ گیا تھا کہ دیانت کرو تو کون کون بے منت تقسیم ہے: تقاضوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا بعد اس سے اس معنی میں نے کہا تھا تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ رکھ۔ عبارت یہ کہ: اسد اللہ بنسن در شہر سے حکیم پیار رائے کے بھائی کی حویلی پر رہتا ہے نہ کاروں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے وقت میں نکلا اور نہ لایا۔ کرنل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے کہ پرسوں یہ عبارت جہدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوڑا لی بھیج دی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں ان دنوں دو جاہ میں تھے۔ انہوں نے غالب کو دو جاہ کی دعوت دی۔ جواب میں فرماتے ہیں، کہ ٹکٹ کے بغیر باہر نکلنا ممکن نہیں، پھر میں کسوں کو آؤں۔ یوسف میرزا کے نام کے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۵۷ء سے پہلے کا نہیں، لیکن اس کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔

سنو کے رزم بابا غیبوں کی حمایت کے متعلق غالب کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ تھی۔
 لیکن کسی نے کہہ دیا کہ غالب نے بہادر شاہ کے سکے کے تھے حالانکہ یہ سکے ذوق نے
 شاہ مرحوم کی تخت نشینی کے موقع پر ۱۸۵۷ء میں کہے تھے اور اسی زمانے میں مولانا
 محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار میں چھاپ دیئے تھے۔ غالب
 کو غدر کے بعد اس اخبار کے فائل کی ضرورت پیش آئی۔ تاکہ اپنی بے گناہی کی قطعی
 شہادت پیش کر سکیں۔ زمانہ اتنا نازک تھا کہ مکالم جس کے خلاف شرکت غدر کا
 الزام سن لیتے، اسے جلد سے جلد مرزا دینے کی کوشش کرتے۔ غالب چودھری
 عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

مولوی باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار مہینے میں چار بار نکلتا ہے جسے پڑھنی اردو اخبار
 بعض اشخاص سنین مافیہ کے اخبار جمع کر رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان آپ کے یا آپ کے کسی دوست
 کے پاس جمع ہوتے پہلے آئے ہیں۔ نو اکتوبر ۱۸۵۷ء سے وہ چار مہینے کے آگے پیچھے کے دن
 جن میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر ہو۔ اور میاں ذوق کے دوست کے ان کے نام کے
 کہہ کر نہ کرنے کا ذکر مندوب ہو۔ بے شک وہ اخبار چھاپنے کا بجنہ میرے پاس بھیج
 دیجئے۔ معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں تا سترہ ۱۸۵۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے
 ہیں اور ذوق نے اسی مہینے میں یاد دایک مہینے کے کہہ کر گزارنے ہیں۔ اقیاناً
 چار پانچ مہینے کے اخبار دیکھ لئے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے۔ کہ اگر
 بہ نسل کسی اور شہر میں کوئی صاحب آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس کا علم ہو۔ تو
 وہاں سے منگوا بیجئے۔

چودھری صاحب نے بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ غالب نے جامع جہاں نما
 والوں کو بھی لکھ کر کہا۔ لیکن اردو اخبار کا مطلوبہ فائل وہاں سے بھی ہاتھ نہ آیا۔ اور
 قسطنطنیہ بدستور باقی رہا۔ چودھری صاحب ہی کو لکھتے ہیں :-

سکہ دار تو محمد پرایا چلا۔ جیسے کوئی چھریا گراب۔ کس سے کہوں، کن کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں لکے گئے ہیں۔ ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزارے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں سے تھے۔ انہوں نے دلی اردو بازار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے عرصہ دو سو سو بائیس جنہوں نے اس خطے میں مرشد آباد رکھنے میں سیکے گئے ہیں۔ ان کو بد ہیں۔ یہ دونوں سکے زرہ بک بہت سے لکے ہوئے اور گزارے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلعہ ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ وہ مجھ سے۔ ہا۔ پنشن بھی گیا اور دیریا ست کا نام و نشان خدمت و رہا بھی مشاخیر جو کچھ ہوا چونکہ سنی و شیعہ اپنی ہے، اس کا کھد کیا ہے۔

یعون جنیش سپہر بہ فرمان اور است

یہ داد نمود آنچہ ب ز آسمان مد

یوسف میرزا کو بھی اردو اخبار کی تلاش کے لئے لکھتے ہیں۔

اپنے دل کی تسلی دینے کا طریق یہ ہر حال یہ معلوم ہے کہ غالب نے سکے نہیں کہے تھے۔ لیکن ثبوت نہ مل سکتے کی صورت میں انہوں نے اپنے دل کی تسلی کے لئے بعض غدرات تلاش کر لئے تھے۔ یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:

میں نے سکے نہیں کہا۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا، یہ کنا نہیں ہے اور اگر گناہ بھی ہے۔ ترکیب ایسا سنگین ہے کہ ملکہ مغربہ، سنہبہ، دغوغام، بھی اسے مشاء سکے، سبحان اللہ گور انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا۔ بنک کھر اور میگزین کا کوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ان صاحب گور انداز کا بہنوئی نہ دگا رہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

آخری فقرے میں کیسا بلیغ نمکدار شاد فرمایا ہے۔ بہنوئی کو اپنی بیوی کے بھائی کی موت یا مصیبت پر کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو لیکن وہ اس رنج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو سارے کو بہن کے غاوند پر آفت نازل ہونے کی حالت میں ہو سکتا ہے۔ غالب اپنے خطروں میں اس قسم کے بلیغ جملے عموماً بے تکلف لکھ جاتے ہیں۔

چنگی کا انتقام | فتح دہلی کے بعد پہلی مرتبہ شہر میں چنگی غلے مقرر ہوئے۔ غالب

فرماتے ہیں :

شہر کا حال جانوں کیا ہے۔ پون ٹوٹی کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے
 نانچ اور آپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محضوں نہ لگا ہو۔
 ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں :-

پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں، نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگرم خزا پنچ
 چھ ماہ، ہمیشہ اس، ان تینوں شخصوں کو یہ کام بہ طریق امانی سپرد ہوا ہے نئے اور آپلے
 کے سوا کوئی جنس نہیں جس پر محضوں نہ ہو۔

غلام کی گرائی | اس زمانے میں غلام بہت گراں ہو گیا تھا۔ اس کی کیفیت غالب کی زبان
 سے سنئے :-

غلام ہے، موت انداز ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی وال آٹھ سیر۔ بارہ
 بارہ سیر، گیسوں تیرہ سیر، چنے سو سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری ہنگلی۔

ذرا اپنے زمانے کی حالت سامنے رکھ کر اس گرائی کا اندازہ فرمائیے۔ غالب کو
 کیا معلوم تھا کہ آئندہ چل کر گرائی کے یہ نرخ ارزانی و فراخی کا ایک آزد و انگیز نشان
 رہ جائیں گے۔ اور واقعی میوہ کے مول اناج یکے لگے گا۔

سے ٹون ڈیرٹی؟

چراغاں | یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو دہلی میں چراغاں کا حکم ہوا۔ غالب فرماتے ہیں :-

فقیر بھی اس تہیہ سستی میں کدھارہ مہینے سے پیش مقرر نہیں پایا۔ اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

مختلف عمارتوں کا انہدام | انگریزی قبضے کے بعد شہر دہلی کے مختلف حصوں کا انہدام شروع ہو گیا تھا۔ نئی سڑکیں نکاتے کی تجویز تھی۔ ریل کی سڑک بننے کی افواہ تھی۔ غالب بریاری کا جو منظر پہلے دیکھ چکے تھے، اس کے بعد انہدام شہر ان کے قلب حزیں کے لئے ایک نئی فاق انگیز ضرب بن گیا چناںچنانچہ اس واقعہ پر ماتم و فغاں سے لبریز ہیں۔ لیکن یہ زارنالی زیادہ تر انہی غلوں میں ملے گی جو یا تو دہلی کے رہنے والوں کو لکھے گئے یا ان لوگوں کو بھیسے گئے جو شہر کے حاکم سے پوری طرح آگاہ تھے۔

جامع مسجد کے گرد میدان | میر حسدی مجروح کو لکھتے ہیں :

جامع مسجد کے گرد بحیثیت بچہ دھڑ کوں میدان نکلے گا۔ دکانیں جو لیلیاں بھائی جانی ملی۔
دارالافتاء ہوجائیگی ہے نام نہاد۔ خان چنڈہ کو چہ شاہ بولالکے بڑیٹ ہے گا دونوں طرف پھاوٹھ چل رہا ہے

کشمیری کٹہہ گر گیا | پھر فرماتے ہیں :

کشمیری کٹہہ گر گیا ہے زہ ادبچے ادبچے دراور وہ بڑی کوٹھڑاں دورویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں
آہنی سڑک کا آنا اور سنی رہ گزرا صاف ہونا بتوڑا بتوڑی ہے۔

دکانوں کا انہدام اور کوئیں کی بندش | پاکست خط میں لکھتے ہیں :

لوسنواب مہاراجہ دتی کی بایں ہیں بچوں بن سلیم کے بات کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو گٹھواں تھا، اس میں سب و نہایت دال کرسند کر دیا۔ بی ماراں کے دروازے کے پاس کٹی دکانیں ڈھاکر سستہ چڑا کر دیا۔

جامع مسجد کے پاس مفتی عبداللہ آزاد مرحوم کی قائم کی ہوئی درسگاہ تھی جس کا نام دارالافتاء تھا۔

دہلی کے ہنگامے ایک جگہ فرماتے ہیں:

بھائی کی پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ۔ چاندنی چوک۔ ہر روز
جمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر منہ سیر دنیا کے پل کی ہر سال میلہ پھول داؤں کا۔ یہ پانچوں ٹائٹل
اب نہیں، پھر کہو دہلی کہاں: ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔
میر مہدی نے اپنے آنے کا ذکر کیا تھا۔ انہیں لکھنے ہیں:-

تم آنے ہو تو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی اور خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھتے جاؤ۔
بلائی بیگم کے کوچے کا ڈھنا اور جامع مسجد کے گرد شہر کا میدان نکلا سن جاؤ۔

غبار چشمہ کی علت | مجروح کی آنکھیں لکھنی آگئی تھیں۔ غالب اس آزار کو بھی دہلی کے
انہدام کا نتیجہ قرار دیتے ہیں:

تمہاری آنکھوں کے غبار کی دیہہ ہے کہ جو مکان دہلی میں ڈھائے گئے اور جہاں شریں
نکلیں۔ جتنی گرد آڑی اس کو آپ نے ازراہ محبت اپنی آنکھوں میں بگہ دی۔

دہلی کی زبان | مجروح نے ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کے منقطع کا مصرعہ یہ تھا:

میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے

اس مضراب نے غالب کے ساز درد کا بزنار چھیڑ دیا۔ فرماتے ہیں:

اے میر مہدی مجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے، اسے اب اہل دہلی ہند وہیں
یا اہل حردہ ہیں یا خاکی ہیں یا پتھر ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے؟
لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی برقی کے کال روٹ موجود ہیں۔

غالب کا جو روزنامہ خراج حسن نظامی صاحب کے مرتب فرمایا ہے اس میں اس اعتبار سے غالب کی حیات کا ثبوت قرار دیا گیا
ہے۔ اور آپ کے اناہ مخالفین نے کئے ہیں۔ بلاشبہ غالب کو دہلی سے انتہائی محبت تھی۔ لیکن اس کا ثبوت وہ نہیں
جو خراج صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ آنکھیں میر مہدی کی لکھی تھیں کہ غالب کی۔ آشوب چشم کی یہ شاعرانہ ترجمہ پیدا
کر نیوالے یقیناً غالب تھے۔ لیکن اس کی مورد مجروح تھے:-

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں،

قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کوئیں یک قلم کھاری ہو گئے خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کوئل کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسی جامع سے راج گھاٹ دروازے تک لے سب لکھ، ایک صحرائے قو ووق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہو کر مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گور کے باغیچے کے اس طرف کوئی بانس نشیب تھلا ب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ تفصیل کے لنگو سے کھلے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ ب۔ ہنسی سڑک کی واسطے ملکہ دروازہ سے گا بی دروازے تک میڈن ہو گیا۔ پنجابی کٹر دھوبی کٹر لاجی گنج سعادت خاں کا کٹر ہرنیل کی بی بی کی حویلی راجی اس گرم والے کے مکانات صاحب ام باغ اور حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر کا صحرا ہو گیا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی تو ہر تاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

شہر نہیں کیسے ہے | یہ تمام حالات بیان کر نیچے بعد پھر اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دہلی والے اب بھی اس شہر کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں،

لے بند خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دہلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں کیسے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر

دہلی کی صورت میں اس خوفناک تغیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر کیا کہا جاسکتا تھا کہ اب یہ شہر نہیں ہے، کیسے چھاؤنی ہے۔ عزیز الدین کو لکھتے ہیں،

صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے پورتنی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی تھی۔ قاسم جہاں کی گان خیراتی کے پھانک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھانک تک بے چراغ ہے ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب

عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔

اہل فوج اور اہل قلم کا اختلاف | بعض حصوں کے انہدام میں فوجیوں اور مولوں کا اختلاف بھی تھا مثلاً غالب ماتے ہیں

فیل خانہ فلک پیر لال ڈگی کے ہی ذی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بدلتی سیم کا کوچہ بنوا میں، اہل فوج

(ملٹری والے) ڈھایا چلتے ہیں، اہل قلم (سول والے) بچاتے ہیں۔ پایاں کار دیکھئے کیا ہو۔

آغا باقر کا امام بارہ | آغا باقر کا امام بارہ ایک مشہور پرانی عمارت تھی اور ہوائے کا حکم ہو گیا غالب لکھتے ہیں۔

آغا باقر کا امام بارہ اس کے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنا قدیم رفیع و مشہور اسکے انہدام کا غم

کس کو نہ ہوگا، یہاں دو سڑکیں ڈرتی ہیں ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک مٹی سڑک محل انکا لگ لگ اس سے بڑھ کر

یہ بات ہے کہ گوروں کا بابک بھی شہر میں تھا، اور قلعہ کے آگے جہاں ل ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائیگا

پھر متفرق عمارتوں کے انہدام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

کیوں میں دلی کے ویرانہ سے ناخوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ بے شہر کو لیکے کیا چولیسے میں ڈالوں

سڑکوں کی افواہیں | انہدام عمارات کے وقت مختلف افواہیں سنی جا رہی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ

سڑکیں نکلیں گی غالب فرماتے ہیں،

شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی جھاڑنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ مرہٹ کر

ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔

نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں،

میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ ایک کیمپ ہے مسلمان

اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔

دلی کا نقشہ | دستنبو اگرہ میں چھپی تھی۔ اس کی چند جلدیں حکام کی نذر کے لئے عمدہ

بنوائی منظور تھیں۔ نقشہ کو لکھا کہ اگرہ میں جلدیں بھی بنوادو۔ ان کی طرف سے جواب

آیا کہ یہ کام اپنے سامنے دہلی میں کر لیجئے۔ اس پر فرماتے ہیں،

میرزا قنبرہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے

ہو۔ یہاں نیچے بند تو میسر نہیں۔ صحاف اور نقاش کہاں؟

تیشہ اور کلند کی طغیانی | ایک اور خط میں لکھتے ہیں،

علی اس عمارت کے انہدام کا فیصلہ ہوا تھا، لیکن یہ فیصلہ عمل میں نہیں آیا تھا۔

یہاں شہر ڈھرا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار و خاص بازار اردو بازار اور خانہ کا بازار کہ ہر ایک بجلے خود

ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان اکٹہ دو کا کین نہیں بنا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں

تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھرینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔

دہلی اور لکھنؤ کا موازنہ | ایک مکتوب میں لکھنؤ اور دہلی کا موازنہ یوں کرتے ہیں،

بھائی لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری (یعنی ملکی حکومت) میں ایسا امن و امان

ہوگا نہ اس قدر فساد و غدر ہے پہلے مگریزی عملداری میں چین ہوگا۔ امر و شرف سے حکام کی ملاقاتیں قدر

و عظیم و توقیر و نشان کی تقسیم و عمر و آبادی کا حکم عام لوگوں کو دل رومی اور مطلق سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

مولانا بونکلام فرماتے ہیں، لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان اب جو میدان ہے یہاں دہلی کے سب سے زیادہ گنجان محلے آباد

تھے قلعہ کے دہری دروازہ سے نکل کر جامع مسجد کی طرف جاتے تھے تو ایک ٹپے پر دہلی بازار میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ اردو

بازار کہلاتا تھا یعنی فوج کا بازار خانہ کا بازار بھی اسی طرف قلعہ کی خندق سے لیکر شرک تکاب کھلا میدان، اس میدان میں بھی محلے

آباد ہو گئے تھے۔ زیادہ تر امر کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں قلعہ میں انہیں لزبت بہ لزبت حاضر باش رہنا پڑتا تھا اسلئے یہیں کائنات

نہمید کرتے تھے قلعہ محلوں و عمارتوں کے احاطہ سے چھپ گیا تھا جب تک خندق پر نہیں پہنچتے تھے قلعہ کی دیواریں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

سرسبز و بہارے دستی دکا، سہ پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انکی زبان نقل کرتے ہیں کہ میر خاندانی مکان قلعہ اور مسجد کے درمیان تھے

اس خانہ دہلی کے بعد ایکس فوج کے افسر اور سپاہی پہنچے اور بچے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ فوراً گھر خالی کر دو یہ نام محلہ منہدم کر

دیا گیا ایک گھنٹہ کے اندر صدیوں کے بسے ہوئے گھر چھوڑ کر باہر نکلنے پر لوگ مجبور ہو گئے اور نام محلے بارود سے اڑا دیئے

گئے میدان کا یہ حصہ شرک سے کئی فٹ بلند واقع ہوا ہے یہ بلندتی، سی تہ ہوئی ہے کہ مکانوں کا نہ پھیلا کر بچھا دیا گیا۔

قلعہ کی اس شرک پر کشمیری دروازہ کی طرف اود گئے بڑے بڑے دریل کاپل آتا ہے اور بائیں طرف دیوے شیش کی جانب

جہنے کی سڑک تھی ہے یہاں پنجابی کٹر آباد تھا جسے وسط میں اورنگ آبادی کی بڑی خوبصورت مسجد تھی مولوی عبداللہ اور خانہ دان

یہیں رہتا تھا مولانا ندیر حسین مرحوم نے اسی مسجد میں درس حدیث دینا شروع کیا تھا غدر کے بعد یہ تمام محلہ بھی اڑا دیا گیا۔

اب فیہ صورت حالات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس محلہ کے اندام کے بعد مولانا ندیر حسین حبش خاں کے پھانک میں چلے آئے اور آخر تک وہیں مقیم رہے۔

قلعہ سے کچھ لگے بڑھیں تو دہلی جانب شیب میں ایک پرانی عمارت نئی عمارتوں کے اضافوں کے ساتھ کھڑی ہے گی۔ یہ ارشکوه

کا کتب خانہ تھا۔ اسی کے قریب اسکی ایک حویلی بھی تھی جسکا ذکر فرخ میر اور احمد شاہ کے زمانے کے واقعات میں ملتا ہے۔

بایک جہاں کدورت بازاریں خرابہ جو نیست

گو یاد آتی میں نہ حکام امر و شرف سے ملنا پسند کرتے تھے نہ ان کی مناسب توقیر و تعظیم پر متوجہ تھے نہ پنشن داروں کو پنشنیں ملتی تھیں نہ آبادی کا حکم عام تھا اور نہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور تلافی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

سیف الحق سیاح ۱۸۶۰ء کے وسط میں لکھنؤ گئے تھے۔ انہوں نے غالباً اکھا تھا کہ لکھنؤ میں بھی عمارتیں ڈھائی جا رہی ہیں جو اب میں غالب لکھتے ہیں، لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم یاد رکھو کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک گون ہو گا یعنی وہیں وسیع ہو جائیں گی بازار چمے نکل آئیں گے جو دیکھے گا دوسرے گا۔ ولی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے بونقلہ کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے، سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔ اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر بہت سختیاں ہونے لگی تھیں۔ غالب نے لکھنؤ کے موازنہ میں بھی اس کیفیت کو دروانگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں،

وہاں (لکھنؤ) کے صاحب کشنر بہادر نے جو دیکھا کہ عملہ میں ہنود بھرے ہوئے ہیں۔

اہل اسلام نہیں ہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا

یہ آفت تو دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی | غدر کے الم نامہ کا ایک خوشچکاں باب کا بر علم و جاہ کی مصیبتیں ہیں۔ غالب کے مکاتیب میں اس موضوع پر بھی کافی مواد موجود ہے مولانا فضل حق خیر آبادی دور آخر میں معقولات کے امام تھے ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولوی فضل امام خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادر سے حدیث پڑھی چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ دہلی میں عدالت کے سررشتہ دار تھے۔ قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ جب سررشتہ داری سے مستعفی ہوئے تو نواب فیض محمد خاں الی بھرنے

پانسو روپے ماٹانہ مقرر کر دیئے۔ دہلی سے روانگی کا وقت آیا۔ تو بہادر شاہ نے جو اس
 زمانے میں ولیعہد تھے مولانا کو طلب کر کے دو سالہ ملبوس خاص ان کے کندھوں
 پر رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھرا لئے اور فرمانے لگے :

شامے گوئید کہ من خست مے شوم۔ مرا جز اینکه پذیرم گزیر نیست۔ اما یزدانا دانند کہ لفظ
 وداع از دل بہ زبان نے رسد لایہ ہزار جبرِ ثقیلؐ۔

عذر کے بعد مولانا بھی باغیوں کی اعانت سے مستہم ہوئے اور انہیں حبس دوام
 کی سزا دے کر انڈیمان بھجوا دیا گیا۔ غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال ہوا
 بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا
 بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میاں داد خاں سیاح سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو غالب انہیں ہم اکتوبر
 ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں :

ہاں خان صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق
 کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی؟ وہاں جزیرہ
 (انڈیمان) میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے؟

مولانا فضل حق نے انڈیمان ہی میں ۱۳ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء
 کو وفات پائی۔ نامہ غالب میں ایک موقع پر مولانا کے ایک رسالہ سے

اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے: "فخر الفضلا" ختم العلماء امیر الدولہ مولوی محمد فضل حق رحمۃ اللہ علیہ

مفتی صدر الدین آزادہ مفتی صدر الدین آزادہ کے اکابر و افاضل میں غیر معمولی

فضیلت و جامعیت کے بزرگ تھے۔ آپ کے والد غالباً تجارت کے سلسلے میں کشمیر سے

دہلی آئے مفتی صاحب کی ولادت دہلی میں ہوئی علوم نقلیہ کی تکمیل مولانا شاہ عبدالعزیز مولانا

شاہ عبدالقادر اور مولانا شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں کی معقولات کا درس

سہ مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں۔ والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا فضلی کی خدمت میں کی تھی استادس میں اکثر انکا ذکر جاتا تھا فرماتے تھے میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر میں نہ کوئی نہیں دیکھا جس کی تقریر اور درس علم کی تقریر دونوں میں بے مثل تھے کسی ایک تقریر میں جو پرستی رہ مشہور ہوئی نہ دور سے اہل علم اس کی سماعت کیلئے شہر حال آتے تھے۔

لیکن جہاں تک مذہبی عقائد و اعمال کا تعلق ہے ان کا مشرب رسم پرستی و بدعت خوانی کا تھا۔ اس باب میں نہایت غلو رکھتے تھے مولانا اسماعیل شہید نے جب تحریک اصلاح شروع کی تو اسکے مخالفوں میں یہ سب زیادہ نامور ہوئے مولانا شہید نے تقویٰ لایمان میں لکھ دیا ہے کہ اگر غد چاہے تو ایک پل میں کروڑوں آنحضرت معلّم کے امثال پیدا کر دے۔ یہ بات ان پر (مولانا فضل حق پر) بہت شاق گزری اور حقوقات کی رنگ تیزیوں سے ایک تقریر اس کے رویں لکھی۔ دعویٰ یہ کیا کہ نظیر خاتم النبیین کا پیدا ہونا مستحکماً ثابت ہے۔ اور پھر قدرت اور مشیت کا فرق فراموش کر کے سارا معاملہ مشیت کے حص میں لے گئے۔ ساری تقریر محض جمل و منطابہ کا ایک لفظی گورکھ دھند تھا مولانا اسماعیل غازی نے جامع مسجد جارحہ تھے کہ وہ میں انہیں یہ تقریر پڑھائی بعد مسجد ہی میں بیٹھ گئے اور کاغذ و قلم منگو کر ایک پورا رسالہ اس کے جواب میں قلمبند کر دیا تو نہ ایک ہی دن میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے "یک ذری" کے نام سے مشہور ہو گیا پھر مولانا صدیق بن نے بھی اس پر ایک تحریر لکھی۔ یہ دو نزل رسالے "بصائر الحق الصریح" کے حاشیہ پر چھپ گئے ہیں۔

انہوں نے مرزا غائب سے بھی ایک مثنوی مولانا اسماعیل کے رد میں لکھوائی تھی جو دیوان میں موجود ہے۔ استغناء و توسل قبور استغناء بہ حرف نداء ایصال ثواب بہ طریق رسمی و رسمی مسئلہ متعلق نظیر خاتم النبیین وغیرہ مسائل میں بیان کئے گئے ہیں آخری مسئلہ اس درجہ بے معنی تھا کہ مرزا غالب کا جس سے قبول نہ کر سکا اور ایک لطیفہ سیرایہ میں وہی بات کہہ گئے جو مولانا اسماعیل کہتے تھے لیکن پھر چونکہ مولانا فضل حق نے بہ شدت انکار کیا اسلئے چند نئے اشعار کہہ کر بحث کا رٹ بدل دیا۔

گر دو صد عالم بود خاتم یکے است

مولانا فضل حق نے جزائر اندیمان میں ایک مختصر غزلی رسالہ غدر کے حالات اور اپنی اسیری کی سرگزشت میں لکھا تھا جو اس وقت تک شائع نہیں ہوا میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی سے لیا۔ سرکار انگلشیہ نے آپ کو دہلی کا صدر لکھنؤ و بنادیا
تھا۔ مشہور ہے کہ ایک موقع پر آپ کے سامنے غالب کے خلاف قرض کا مقدمہ پیش ہوا
تو مدعا علیہ نے حاضر ہو کر جواب دعوے کے بجائے یہ شعر پڑھ دیا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کڑاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب مسکرائے، غالب کے خلاف قرض کی ڈگری دے دی، لیکن
سارا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔

آپ نے جامع مسجد کے پاس "دارالبقا" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس
میں دور دور سے طالب علم بغرض تحصیل علوم آتے تھے۔ اکثر طالب علموں کے لباس
و طعام کا انتظام مفتی صاحب فرماتے تھے۔ اس طرح "دارالبقا" فیضان علوم دین کا
ایک وسیع سرچشمہ بن گئی۔ غدر میں آپ سے بھی فتوے جہاد پر دستخط لئے گئے
تھے۔ جب اندریز دہلی پر دوبارہ قابض ہوئے تو آپ پر بھی مقدمہ بنا۔ پھر یہ تہمات
میں آئے۔ ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد ضبط ہو گئی۔ تحقیقات کے بعد بری ہوئے تو
جو جائیداد بک چکی تھی اس کا کوئی معاوضہ نہ ملا باقی ماندہ جائیداد و اگزاں ہو گئی۔

مفتی صاحب نے اس ابتلا کے بعد بھی درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخری
ایام میں فالج گرا۔ اکاسی برس کی عمر میں ۲۴ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۵ جولائی
۱۸۶۸ء کو بمبھرات کے دن علم و فضل کا یہ جامع پیکر اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔
مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات لکھی۔

چوموڑا تاسہ صدر لدین کہ دیکھر	امام، حنظلہ آخر زمان بود
ہر روز پنجشنبہ کرد درجاست	کہ این عالم نہ جاست با وداں بود
ربیع الاول دبست و چہارم	وداع او سوئے دارالجنان بود

ظہورِ افسوس آلِ استادِ میِ قدر پدرِ وارم ہمیشہ مہرباں بود

چراغِ ہست تاریخِ ولادت
کنوں گفتم چراغِ دو جہاں بود

غالب مفتی صاحب کے خاص دوستوں اور نیاز مندوں میں سے تھے۔ ان کی داستانِ مصائب یوں بیان کرتے ہیں :-

مقدم پیش ہوا۔ رو بکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری قوت جایداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترجمہ نصف جایداد و انکراشت کی۔ اب نصف جایداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی و انکراشت شدہ جایداد کا کرایہ صرف چالیس روپیہ ماہانہ تھا۔ لیکن ان کی نیک دلی اور اقربا پروری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض متعلقین کی اولاد کی پرورش بھی اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ اور ذمہ داری کے اس بوجھ کو عسرتنگدستی کے عالم میں بھی بہ دستور اٹھائے رکھا۔ غالب لکھتے ہیں :-

اگرچہ یہ امداد (کرایہ) ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس چالیس مہینے کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عسرت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، لہذا فراغِ مالی سے نہیں گذرتی۔ ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے اخیر میں ہیں (یعنی ۸۰ برس کے قریب عمر ہے) خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں :-

سہ یعنی تاریخِ ولادت لفظِ چراغ سے نکلتی ہے (سلسلہ) اور تاریخِ وفات "چراغِ دو جہاں بود" اس حساب سے مفتی صاحب مرحوم نے اکاسی برس کی عمر پائی :-

۱۳ دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ دسمبر کو حضرت مفتی صاحب
پرفالچ گرا تھا بیاچ چھ برس اسی حالت میں گزرے۔ اعلیٰ درجے کی فراخی اور امارت
کا دور بھی انتہائی سلامت روی گزرا اور زندگی کے آخری بارہ سال بھی جو شدید بیماریوں
کے سال تھے صبر و استقلال کے ساتھ پورے گئے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:

کمال علم و ذوق شعر | والد مرحوم کے نانا مولانا منور الدین رکن الدین اور مولانا شید الدین
مفتی صاحب کے پردوس میں رہتے تھے یہ زمانہ دہلی کے محاصرہ اور انگریز دور اور مرہٹوں کی لڑائی
کا تھا۔ لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور مولکر کی فوجوں کو دہلی کے سلسلے میں آخری شکست
دی۔ اس لئے سمجھنا چاہیے کہ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۲ء کا زمانہ ہوگا۔ تحصیل علم کے شوق اور
شاہ صاحب (شاہ عبدالعزیز) کی شاگردی کے دلولہ نے مولانا منور الدین کو گھر سے نکال دیا۔
بزرگوں اور عزیزوں پر جدائی شاق تھی اس لئے سفر کے روادار نہ تھے۔ مجبوراً بغیر کسی کو خبر دیئے
پوشیدہ نکل کھڑے ہوئے اور قصور سے دہلی تک کا سفر پاپیاءہ کیا۔ دہلی کے حوالی میں کئی بند گرفتار
ہوتے ہوتے پکے۔ ایک مقام پر ایک گوجر کی خدمت کر کے اسے اپنا حامی بنایا۔ دہلی پہنچے تو شاہ صاحب
کے ملقاہ درس میں مفتی صدر الدین اور مولوی رشید الدین شامل ہو چکے تھے۔ یہ بھی شناس ہو گئے
شاہ صاحب نے اپنے ایک عربی مکتوب میں اس عہد کے محروکوں کا حال بیان کیا ہے۔
انگریزوں کی فوج کو مشرقی فوج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ پورب (بنگال بہار) انکا مرکز تھا
مشرقی فوج کے سردار کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کا نام ہندی میں قمل (دھوں) کا مفہوم رکھتا ہے
یعنی ایک۔ یہ ہر حال مفتی صاحب چونکہ مولانا منور الدین کے ہم درس رہے تھے اس لئے دونوں
میں برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ دہلی پہنچنے کے بعد انہوں نے دہلی ہی میں شادی کر لی اور
مقیم ہو گئے۔ اس معاملہ میں بھی مفتی صاحب کے ایثار و مشورہ کو دخل تھا۔

والد مرحوم نے مفتی صاحب کی سبیل کی تھی۔ ان کے فضل و کمال اور جامعیت کے بعد
معترف تھے۔ فرماتے تھے ان کا سب سے بڑا انتخاب ما اپنے خاص عزیزوں سے ہوتا ہے عید
کے دن ہمارے یہاں آتے، تو سب اپنے عزیزوں کا بیور میڈی کے کچھ دیا کرتے ہیں۔ ایک
اشرفی میرے لئے بھی ضرور لاتے، اور وہ ہوتے ہیں بہ شرفیوں پر تبرکات جمع رکھو۔

فضل و کمال علمی کے ساتھ ساتھ ان کی زبانوں میں تھا۔ عربی، فارسی
اُردو و ہندیوں کی زبانوں کے ساتھ ساتھ ان کا اردو عام بہت اچھا ہے۔ اس کے انتخاب
ہے اور ان کے پایہ بلند کے لئے ان کے لئے سب سے بڑا انتخاب ہے۔ مثلاً تھے جو ہیں
ان کی غزل نے تمام کا پرشاد ہے۔ یہ سب چیزیں اور ان کے لئے "مفتی صاحب" تھے۔
و اس میں کیا تو بہت دیر ہے۔ یہ سب چیزیں اور ان کے لئے "مفتی صاحب" تھے۔
یہ شعر بھی جو ہمیشہ میں ان کے لئے تھا۔ ان کے لئے تھا۔

کمال اس زہاد سے آگاہ تھے۔ ان کے لئے تھا۔ ان کے لئے تھا۔
والد مرحوم اپنے چچا کا جنہوں نے مدینہ منورہ میں انتقال کیا، جب کہیں ذکر کرتے تھے۔
مفتی صاحب کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

آزادہ مرے کو چاہا، میں رہ گیا دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر لے
والد مرحوم فرماتے تھے کہ اب عربی کا فون ان سے بڑھ کر میں نے وقت کے کسی فاضل نہیں
پایا۔ حاسہ کے پیکر، شعائر، زبان تھی۔ جنتی کا درجہ سب سے پہلے انہوں نے ہی دیا شروع
کیا ورنہ اس کا کلام دس کی چیزوں میں نسل نہ نکھار انہوں نے تبتانی کی ایک طرح بھی لکھی تھی۔
افسوس ہے ان کے منمنات غد میں ضائع ہو گئیں۔ صرف ایک عربی رسالہ "اشد زوال"
کے متعلق میری نظر پڑا۔ گزرا اور ایک نثر پر مسئلہ انسانیت پر ہے۔

مسلمانوں میں برادری کی ایک اور پہلو ہے۔ انگریزی دوست، نامہ لکھنے والے و ثقافت کا عام مسک۔
انگریزوں کا کوشش نہیں ہے۔ ان کے لئے یہی ملازمہ ہے۔ اسے اجتناب پر جانے۔۔۔ لیکن

کلاں ریزیڈنٹ کو لکھا گیا کہ امرا شہر اور پادشاہ سے مشورہ کر کے کسی ایسے شخص کو صدور الصدور مقرر کریں۔ جس کی وجاہت اور علم و فضل مسلمانوں میں مسلم ہو۔ ریزیڈنٹ نے پادشاہ اور امرا شہر سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے ہوئی کہ اگر مولوی صد الدین منظور کریں تو ان سے بہتر کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پادشاہ اور امرا و اعلیٰ کے متفقہ اصرار سے انہوں نے یہ منصب قبول کر لیا۔

دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسیں اٹھارہویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امرا کے سیلون اور ڈرائنگ رومز کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہ یہی حال دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی اہیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و سرگام گزین جاتا تھا۔ اور اس حلقے کے بے ٹھیک ٹھیک ایک علمی ادبی اور فنی طلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم ان دیوان خانوں کی مجالس کے جو اہم نے سنایا کرتے تھے، کاش وہ قلمبند کئے جاسکتے۔ نہ بگھنے والے چراغ کا یہ آخری اُجالا تھا۔ دہلی مرحوم کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گوشانِ بشکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے۔ لیکن بٹتے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہدِ مانسی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جاسکتی تھی۔ والد مرحوم شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کی صحبتوں کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے :-

تمتع من شمیم عرار نجد

فما بعد العشیت من عرار

فرماتے تھے مفتی صاحب دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات، کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فاضل و کمال کو بیک وقت دیکھ مجلس دیکھ لے تو وہ میدھا مفتی صاحب

کے دیوان خانہ کا سرخ کرتا !

مفتی صاحب کا فتوئے [جب غدر ہوا تو مفتی صاحب خانہ نشین آگئے۔ مگر حالات کب انہیں بے تعلق رہنے دیتے تھے۔ قلعہ میں جانا اور دربار میں شریک ہونا پڑا۔ ان سے کہا گیا کہ بدستور عدالت کا کام جاری رکھیں مگر انہوں نے عذر کر دیا پھر جب بریلی سے بخت خان آیا تو اس نے علما و مشائخ سے جہاد کا فتویٰ لکھوایا خالقہاء والوں کو بھی مجبور کیا کہ جامع مسجد میں آکر اس کا اعلان کریں مفتی صاحب کو دستخط کرنا پڑا لیکن انہوں نے دستخط کے نیچے کتبہٴ بالخیر لکھ دیا تھا۔ عربی میں اس طرح کے حملے خانہ عبادت میں لکھے جاتے ہیں مگر الخیر پر انہوں نے نکتے نہیں دیئے تھے۔ غدر کے بعد حبان کی دوبارہ می ہوتی۔ اور فتویٰ پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا تمہیک ہے۔ مجھے دستخط کرنا پڑا کہ مجبور تھا تو پگوار نہ تھا کہ مقابلہ کرنا ہے۔ یہ صاف لکھ دیا کہ کتبہٴ بالخیر جبر و تشدد سے دستخط کرایا گیا ہے! یہ محض لطیفہ تھا مفتی صاحب نے بالقصد جملہ لکھا تھا اور بالقصد نقطے نہیں کئے تھے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ [غالب کے ایک نہایت عزیز دوست اور مختص قدر دان نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے جو ایک بلند پایہ امیر ہونے کے علاوہ زہد و اتقا، علم و فضل اور ذوق شعر و ادب کے اعتبار سے بھی دور آخر کا ایک نہایت گرانیہ وجود تھے۔ وہ عظیم الدولہ مرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ کے صاحبزادے تھے ۱۸۳۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی فتح کی۔ تو نواب مرتضیٰ خاں بہادر کو سن ۱۸۵۷ء کے صلے میں ہوڈل پلوال کا علاقہ بطور جائگیر ملا۔ ۱۸۵۸ء میں جہانگیر آباد کا علاقہ جہانگیر لکھنؤ دس۔ سن کی ملکیت بھی خرید لیا۔ نواب مرتضیٰ خاں کا انتقال ہوا۔ تو ہوڈل پلوال کی جائگیر واپس لے لی گئی اور اس کے عوض ارکان خاندان کی جائگیریں مقرر رہی گئیں جو ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ جہانگیر آیا۔ کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں نے اپنی مدد کی تھی۔ اب اس علاقہ کے نام منٹنل کر دیا تھا۔ ۱۸۵۵ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں مصطفیٰ خاں نے حج کا سفر اختیار کیا جس کے

۱۔ ملحقاً از مقدمہ کجیات حشری و شیفتہ مرتبہ جناب نظامی بدایونی۔

رسم و راہ ہو گئی تھی اور شاید ان سے فارسی کی بعض چیزیں پڑھی بھی تھیں۔ غلام کے بعد وہ سکندر جہاں بگیم کے پیشکار ہو گئے۔ ان کی آئندہ ترتیبوں کا یہ پہلا نہینہ تھا۔ ان کے ایک دوست مومن علی خاں صدرالعدد و میرٹھ تھے۔ شبیہ زئیے غالب کو لکھا کہ اگر مومن علی خاں کے نام بھوپال سے سفارتی خط آجائے تو ان کی حشک آسان ہو سکتی ہے غالب نے صدیق حسین خاں کو لکھا اور انہوں نے مومن علی خاں سے سفارش کی۔ اس کے بعد جب بٹاگیر کی وزارت کے لئے رافضیہ کیا گیا تو نواب صدیق حسین خاں کو بٹاگیر و بٹاگر کے لئے کارنامہ بنانے میں نے دوبارہ مل لکھا اور اس طرح علاقہ بھی چھوڑ دیا گیا۔

مختلف رزسا، بی کے رور کی کینیت و سٹیٹ کے رور سے بیان ہو چکی ہے۔ اردو کا تیب میں لکھتے ہیں :-

آگے کے درباروں میں سب بٹاگر و سٹیٹ کے ان کا نام سب دربار ہوتا تھا۔ پھر بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دو جانا، پاٹودی، لوہار و چار سدوم محض ہیں (اول الذکر چار) جو باقی رہے، ان میں سے دو جانا و لوہار تحت حکومت ہانسی حصار۔ پاٹودی حاصر۔ اگر ہانسی حصار کے کشتہ بہادران دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رہیں ورنہ ایک رہیں۔ دربار عام واسے بہا جن لوگ سب موزید۔ اہل اسلام میں عمرت تین آدمی باقی ہیں :- میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی زئی، رونی و در لیں۔ بی ماروں میں گٹ ناموسوم بہاتہ۔ تینوں مردود، ملود، محروم، مغموم :-

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سلو پھر ہم کو کیا

آسمان سے بلوہ کلفام گو برسا کرے

میکش [غالب کا ایک عزیز شاگرد احمد حسین میکش تھا۔ اس بیچارے سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا تھا۔ غالب، فردوسی شاعر کے ایک خط میں میکش کے متعلق لکھتے ہیں :-

میکش چہن میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین
 بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دس سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور رٹکے کو بہرام پور
 میرزا بیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا بیٹھتا ہے۔

اسی حالت میں وہ غریب گرفتار ہوا اور پچانس کی سزا پا لیا۔ غالب ایک خط میں فرماتے ہیں:-
 احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؛ ممنوق ہوا اور پچانس پا گیا، گو اس نام کا آدمی
 شہر میں تھا ہی نہیں۔

ایک خط میں دوستوں کو یاد کرتے ہوئے میکش کا تذکرہ خاص طور پر فرماتے ہیں:-
 اس چرخ کچر گرفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا، ملک مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک
 گوشہ دو شہر تھا، چند منسل دے نو ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے:-

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ اے نلک

اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

کل سے میکش مجھ کو پتہ چلا ہے۔ سو صاحب اب تم (میر مہدی مجروح) ہی بتاؤ کہ میں تم کو
 کیا لکھوں۔ وہ صحتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی مجھ سے، خ پر خدا لکھواتے ہو
 آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر ملاتی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔

غلام فخر الدین | علی بخش خاں رنجور کے صاحبزادے غلام فخر الدین خاں بھی گرفتار ہو گئے تھے
 اس لئے کہ وہ بہادر شاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم تھے۔ اور بادشاہ کے حکم کے مطابق
 وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہے تھے۔ غالب لکھتے ہیں:-

غلام فخر الدین خاں کی دو روپیاں ہوتی ہیں۔ صورت اچھی ہے خدا پالے تو رہائی ہو جائے۔

چنانچہ وہ رہا گئے۔ حکیم غلام نجف خاں نے لکھا کہ دوبارہ زندگی پائی۔ غالب

لکھتے ہیں:-

ہاں غلام فخر الدین خان کی رہائی زندگی دوبارہ ہے۔ خدام کو مبارک کرے۔

بہادر شاہ | بہادر شاہ غفران مکان کے متعلق غالب کے اردو مکاتیب میں صرف دو جگہ ذکر آیا ہے۔ اول میر مہدی مجروح نے پوچھا تھا کہ ”دستیو“ میں پادشاہ کے دہلی سے رخصت ہونے کے حالات کیوں نہیں لکھے؟ فرماتے ہیں:-

بھائی میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۲۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور حاتمہ میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خان کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی مدانگی کا حال کیوں کر کھتا ان کو جاگیر گست میں ملی، بادشاہ اکتوبر (۱۸۵۸ء) میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔

دوسری جگہ بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ہے۔

۱۲ نومبر (۱۸۵۷ء) مطابق ۱۲ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن بونصر منرج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

دیکھنے کو یہ چند الفاظ ہیں۔ لیکن ایک ایک لفظ کی تہ میں درد و حزن کا دریا موجزن ہے شاہی خاندان | خاندان شاہی کے افراد کے متعلق بعض تحریریں اور پرگزر چکی ہیں۔ مثلاً بہت سے شہزادوں کا مارا جانا، بعض کا قید ہونا، جو تلوار سے پکے تھے ان کا پانچ پانچ روپے پنشن پانا، خواتین کا گونا گوں مصائب میں مبتلا ہونا، غالب ان حالات سے بے حد متاثر تھے اور معمولی سا بہانہ مل جانے پر بھی اظہار درد کے لئے مضطرب رہتے تھے۔ تفتہ نے اپنی کتاب ”سنبلستان“ چھپوا کر بھیجی۔ چھپائی اچھی نہ تھی۔ غالب نے اسی کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بد حالیوں کے ماتم کا بہانہ بنایا۔ فرماتے ہیں:-

اجی میرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھو یا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ مے کیا بری کالی ہے۔ اس کالی کی مثال جب تم پر کھتی کہ تم یہاں مجھے اور بیگمات

تقدیر کو پھرتے چہنہ دیکھتے۔ صورت، ہر دو ہفتہ کی سی در ہر سہ مہینے پانچے لیر لیر جوتی ٹوٹی
یہ مہانہ نہیں بلکہ بے تکلف مسندستان ایک معشوقہ خوب رو ہے مگر بد لباس ہے۔

تاج محل میم | ایک اور خط میں لکھتے ہیں،

تاج محل بیگم بہادر شاہ مرحوم، مرزا قینہ، مرزا ابوال بخش کے سلسلے ولایت علی بیگ بت پوری
کی زوجہ ان سب کی والدہ آباد سے رملائی ہو گئی۔ دہلی سے کیمپ میں رہیں یا لندن
جائیں۔

میرزا الہی بخش، دوسرے اکابر و احباب کے اور اپنے حالات یوں فرماتے ہیں :-
میرزا الہی بخش چوتھوں میں ہیں۔ کو ظلم کیا جی بدد جان ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں
دیکھتے کیا ہو حکیم بی کو دیکھ حسن اسد خاں، ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان
مکانوں میں جا رہے ہیں۔ ان کا نام کو دستا کا ہے۔ ماہر نہ جائیں۔ رہائیں ج
تو بے کسی و غریبی ترا کہ مے پر مسد

نہ جزا نہ سزا نہ غریبی نہ اندیشہ نہ عدل نہ ظلم نہ لطف نہ قہر نہ ہندو نہ دن پہلے تک
دن کو روٹی اور رات کو تراب مٹی ہی اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ کیرا یا مہاراجہ کا بنا ہوا
بھی ہے اس کی کچھ فکر نہیں۔

ایک اور خط میں میرزا الہی بخش کے متعلق تحریر فرماتے ہیں،

میرزا الہی بخش کو حکم سراجی مندر بنانے کا ہے۔ وہیں پکڑی ہے سلطان حمی میں رہتے
ہیں۔ مندر کر رہے ہیں۔ دیکھتے یہ جبر ٹھ جانے یا یہ خود بخود نہیں۔

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں،

یہ وہی الہی بخش ہیں جنہوں نے بہادر شاہ کو گھر بنا کر دیا تھا۔ وہ جنہیں بہادر شاہ
مصنف، سوانح لارڈ لارنس دہلی کا ٹریڈر لکھتا ہے۔ مسلمانوں نے ان کی حالت انٹیلوں
میں اشارہ کیا ہے قاتلوں کی اس نے خوشنودی کے لئے اور ضرورت ہو تو وہ اپنے باپ

کو بڑا دوسے پورے اندر کے بعد گورنمنٹ پابندی تھی کہ قلعہ کے خاندان کا کوئی نام و نشان
 دہلی میں نہ رہے اس لئے ان کی جائز جیسے خاندان فروش کو بھی دہلی میں دیکھنا نہیں پڑتی
 تھی۔ ہر حال کچھ دنوں کی زارنالی کے بعد انہیں قیام کی اجازت مل گئی اور وہ خاندان
 شاہی کے ہیڈ قرار پائے۔ عید کے دن انہوں نے چایا تھا کہ پارکھروں کی گاڑی میں
 بیٹھ کر عید گاہ جائیں۔ ڈپٹی کمشنر کو اطلاع ہو تو چوبدار بھیج کر ممانعت کر دی کہ یہ تہیاب
 قلعہ کے تہذیبوں کو مصل تھا اب وہ زمانہ گیا۔

عظیم حسن اللہ خاں | حکیم احسن اللہ خاں کے متعلق حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں،

میں تم کو مبارک ہو کہ حکیم ہی پرستے وہ سب ہی جوان کے اور متوجہ تھے، اٹھ گیا اور ان کو حکم
 ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو نہ شہر میں۔ مگر باہر جانے کا، گھر نصدرہ دو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتہ
 میں ایک ہاتھری میں حاضر ہو کر دینا چاہو وہ اپنے ناسخ کے کچھ دوسرے مذاہب لے کر
 میں آ رہے، ان کے لئے اور عبادت جملہ اندرونی متبایا نہیں جاسکتا۔

بعض دوسرے شمس کے متعلق فرماتے ہیں،

پہلے بعد اس کے قیامی مالی اس وقت سہ ماہی کے وہ خاں صاحب کے پاس آئے ہیں
 یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے یہاں نہ رہیں گے۔ عدم سرپرستی اور نہ ہی
 حج ہاتھوں میں ہے کہ جملہ امور مع تباہی و تاراج رہتے ہیں۔ یہ مقصود وقت

سے حکیم احسن اللہ خاں سے بعد ان کی عبادت ہے۔ انہوں نے اپنے لئے لدوئی سرت کی مارش کے باعث دہلی میں سے خود اس مقام
 پہلے خواب میں جس خاں کے پاس مدد مانگے تھے انہوں نے انہیں جواب نہیں دیا کہ پاس چلے گئے ان کے انتقال پر ان کا روبرو نہیں
 ہوئے۔ پھر کہ شاہ کے روبرو میں مدد مانگے وہ عذرتوں کے ساتھ جواب دیا۔ پھر شاہ نے اسے مدد دی تات، ملک کا
 خطاب یا خدر کے بعد حکیم صاحب جے پور میں مدد مانگے تھے اور گاہ دہلی آئے تھے مگر ان کو دہلی میں اس
 درجہ گرجے تھے کہ انہیں غلام کے سامنے آسے یہاں نہیں ہوئی تھی یا حال خاں تھیں۔

۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں بڑا دوسہ میں عالم دین و نابانی و درویش بنے۔ وہ خواب میں

احمد خاں نے حکیم غریب کے الفاظ سے تاریخ وفات کالی

۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں بڑا دوسہ میں

اپنی ساونت کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں۔ اس طسرح کہ محل سرا میں زندہ

اور ویران خانہ میں مردانہ

مختار کا ہیرا پچس فرماتے ہیں،

ہے یہ کیوں کر لاکھوں حکم رخی الدین احمد جلا کو قتل عالم میں ایک خاک لے گولی مار دی اور

اللہ حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی سی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے

ٹونک سے رخصت کرے کر آئے تھے، غدر کے سبب جاز سکے یہیں رہے اور بعد فتح دہلی

دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پرتھویں ہے کہ

مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر محمد نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین دہلی

شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کا یہ ہے کہ جہاں سب کا بر شہر سے بھاگے تھے وہاں

وہ بھی بھاگ گئے تھے بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے

سال گزشتہ جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جاں بخشی

روشن الدلہ کا۔ رہے جو عقب کو توالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل مانی مہم

رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ اٹلاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور بعد کالے صاحب

کے میاں نظام الدین صاحب کی قرار پاکر ضبط ہوئیں۔ اور نیلام کاروپہ سرکار میں داخل

ہوا۔ ہاں قاسم جاں کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں

وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن

گئے ہیں۔ شاید بہاولپور بھی جائیں گے۔

خاندان فخر عالم | شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی اپنے عہد کے مشہور و قابل التہ تھے۔ ان کا مقبرہ

لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان میدان میں ہے۔ پادشاہی زمانے میں مقبرے

کے آس پاس ایک اچھا گاؤں آباد تھا جس میں شیخ مرحوم کی اولاد رہتی تھی۔ اسی

خاندان میں مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ مرید تھے جنکے پوتے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں

بہادر شاہ کے پیر تھے۔ میرابراہیم علی خاں سورتی نے شیخ کلیم اللہ کی کتابیں اور قطب الدین ابن مولانا فخر الدین کے حالات مانگے۔ غالب لکھتے ہیں :-

خود نہ نعمت کیا تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھتے ہو جو حضرت کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو ؟ ایں دفتر کا ڈنڈا ڈنڈا گاؤں گاؤں اقصا بے رود قصاب در راہ مرد بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جہاڑ و پھیر دی کا غذا کا پرزہ سونے کا تار پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مسقیرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی بادی تھی۔ اس کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر کوئی ست پتے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جبکہ وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں ؟ کیا کروں ؟ کہیں سے یہ بدعا حاصل نہ ہو گا۔

حسام الدین حیدر کے فرزند | مبارز الدولہ ممتاز الملک نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ دہلی کے ایک بڑے امیر تھے۔ بلیماروں میں جہاں غالب رہتے تھے، ان کی عظیم استان حویلی تھی۔ نواب الہی بخش خاں معروف کے گھر سے دوست تھے، اسی وجہ سے غالب کو بھی اپنے عزیزوں میں شمار کرتے تھے ۱۸۳۶ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے معین الدولہ عمدۃ الامر آصف الدولہ سید ذوالفقار الدین حیدر نظارت خاں بہادر ذوالفقار جنگ جو حسین مرزا کے نام سے مشہور ہیں غالب کے

گھر سے دوست تھے حسین میرزا، آغا حیدر میرزا ناظر بہادر شاہ کے داماد تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظارت کا کام حسین میرزا کے سپرد ہوا تھا۔ غدر میں ان پر جو آفت نازل ہوئی اس کی کیفیت ”دستبنو“ کے حوالے سے اوپر بیان ہو چکی ہے یعنی وہ اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اہل و عیال کو لے کر شہر سے نکل گئے۔ ان کے بھرے مکان کو پہلے بوٹا گیا، پھر آگ لگا دی گئی مظفر الدولہ اور سے پکڑے آئے اور گورگانوہ میں انہیں گولی مار دی گئی حسین میرزا بیچارے دہلی سے نکل کر پہلے لکھنؤ پھر کلکتہ چلے گئے۔ شاید اس غرض سے کہ واجد علی شاہ سے ملکر وظیفے کا بندوبست کرائیں۔ اسی اثنا میں غالب کو اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

حسین میرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے۔ خدا بان آوارگان دشت غربت کو جمعیت تو جب چاہے عنایت کر، مگر صدیق مرتضیٰ علی کا تندرست رکھ: اللہ تہ حسین میرزا کی ڈانٹ ہی سفید ہو گئی یہ شدت ختم درنج کی نو بیاں ہیں۔

حسین میرزا کی امداد ایک وقت تھا کہ غالب حسین میرزا کے والد کی وساطت سے قرض لیتے تھے۔ لیکن جب حسین میرزا پر آفات و مصائب کا طوفان نازل ہوا تو غالب حصول قرض کے لئے حسین میرزا کے وکیل بنے۔ ایک خط میں حسین میرزا کو لکھتے ہیں:-

ابھی جتنی لال تمہارا قرض خواہ آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ سچ چھوٹ کہہ کر اس کو روک دیا۔ پر لایا ہوں کہ سود و سود و پیسہ تم کو بھیج دے۔ بنیوں کی طرح تقریر اس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے۔ اس کو پانی دیتے ہیں حسین میرزا تمہارے کھیت ہیں۔ پانی دو اناج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمہارے مکان کا پتہ

لکھو کر لے لیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے راجی داس سے صلاح کر کے جواب
تھمرے کی آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ رہے یہ بھیج دے تو کیا کہنا ہے۔ اور اگر وہ مٹا لکھے
درقم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ اسد اللہ سے بوقلم سے کہا ہے وہ سچ ہے
اور وہ امر ظہور میں آنے والا ہے۔

نوب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے یوسف میرزا نے غالباً مرزا سب کے انوہ
میں اپنے نانائانی کے عہد کی خوشحالی کا ذکر کیا تھا۔ غالب انہیں لکھتے ہیں :-

نانائانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے تھے وہ اپنی اجل سے مرے ہیں بزرگوں کا مرنا ہی دم
نی میث ہے نہ نام یہ پہنتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوئے اور اپنی آبرو کو دوتے ہاں
منظر الدرد دینوسف میرزا کے ماموں کا غم بخمد واقعات کو بلانے معلیٰ ہے بدواغ
نامہ جیسے جی نہ مٹے گا۔

تجویم ریح و غم | پھر یوسف مرزا ہی کو لکھتے ہیں :-

حال سوئے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے
سودائی ہو جاتا ہے۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس تجویم غم میں میری قوت متفقہ
میں فرق آگیا ہے تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باد رہ کر ناغضب ہے ہو چھو کہ کیا غم
ہے، غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو
گفتا ہوں۔ مظفر الدولہ میرزا ناصر الدین، میرزا ماسو، سیک میرزا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا
انہیں برس کا ہے۔ مسطفیٰ خاں بن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے رضیہ خاں اور مرثیٰ خاں
قاضی فیض اللہ کیا ہیں، ان نو پنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا، اسے لو بھول گیا
حکیم رضی الدین خاں میرزا محمد حسین سینس۔ اللہ اللہ لو کہاں سے لائن، غم فرو
حسین میرزا یوسف میرزا، میرزا محمدی، میرزا فرید حسین، میرزا صاحب، خدا ان کو جینا
رکھے۔ کاش یہ موتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھبران کے بے چراغ وہ خود دارہ

سجاذ اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ یہاں اقلیٰ و امرا کے دلا دوازدواج بھیک مانگتے پھر میں اور میں دیکھوں !

سچی ہمدردی | حسین مرزا نے ایک موقع پر پریشان ہو کر لکھا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ اس پر غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

تمہارے ناموں (حسین مرزا) کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے۔ وہ کس زبان سے ادا کروں۔ ہے ہے حسین مرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا سرا انجام نہ ہو سکے؟ بہت بڑا آسرا تھا اور سرکار کی خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی، علاقہ نہ سہی، سوڈ پڑھ سورو پیہ در ماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔ دلی کے آدمی خصوصاً امرا شاہی ہر شہر میں بد نام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سارے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکار تھی۔ حیدر آباد بہت بڑا گھر ہے۔ مگر بے ذریعہ دواسطہ کیونکر جائے اور جائے تو کس سے ملے؟ ناچار وہیں رہو۔ کسی طسرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے۔

آخری فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین مرزا کلکتہ گئے، سوئے تھے اور واجد علی شاہ کے ہاں کوشش کر رہے تھے۔

فرخ آباد کی ریاست ضبط | غدر کے بعد فرخ آباد کی ریاست بھی ضبط ہو گئی تھی اور افضل حسین خاں دلی فرخ آباد کی جان بخشی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے جائیں جتنا بچہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے عرب چلے گئے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :-

مجھ کو رشک آتا ہے۔ جزیرہ نشینوں کے حال پر یعنی انڈیان کے قیدوں پر، عموماً اور میں فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب پر چھوڑ دیا۔ اٹا اٹا :-

پڑیے گریہ تو کوئی نہ ہوتا رہا۔

اور اگر مر جائیے تو خود خواں کوئی نہ ہو

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں :-

”نواب نجمل حسین خاں اور ان کے بھائی نواب تفضل حسین خاں والد مرحوم کے نانا رکن المدارس کے مرید تھے۔ غدر میں تفضل حسین خاں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا اور لکھنؤ کے سقوط کے بعد حبیب برہیس قدری فوج نیپال کی طرف ہٹنے لگی۔ تو نانا (ڈھونڈ و پتھ) کی فوج کے ساتھ یہ بھی اسی طرف آگئے۔ پھر دو معرکوں کے بعد انہوں نے اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس شرط پر کہ انہیں مکہ معظمہ بھرا دیا جائے۔ چنانچہ فوجی حراست میں جدہ پہنچا دیئے گئے۔

والد مرحوم کہتے تھے کہ تفضل حسین خاں بہت شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھے کشمیر کے تاجر پہلے ان کے پاس جاتے، پھر لکھنؤ کا رخ کرتے۔ لیکن جب مکہ معظمہ پہنچے تو یہ سماں تھا کہ چھینٹ کا ایک میلہ اچھلا، ان کا جسم پر تھا۔ یہ حال دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ ان کی ضروریات کا انتظام کر دوں، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے نہ کہ لینے کی۔

یہ ہر حال چند دنوں تک مہمان رہے۔ پھر والد مرحوم نے شریفیت سے انہیں ملا دیا۔ اس بے دلائی کی حالت میں بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ بغیر کسی تحفہ کے ملیں۔ ایک قیمتی تیسع ان کے پاس رہ گئی تھی وہی بطور تحفہ پیش کر دی۔ کئی سال کے بعد حبیب شاہجہاں سلیم والیہ بھوپال جج کے لئے گئیں تو والد مرحوم نے ان کے حال پر توجہ دلائی انہوں نے ربار مکہ کی سالانہ رقم کے ساتھ ایک رقم ان کے لئے بھی مقرر کر دی تھی۔ ان کا آخر تک یہ معمول رہا کہ ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آتے تھے۔ پھر عشاء پڑھ کر گھر

واپس جاتے۔

عام تباہی ایک اور مکتوب میں عام تباہ عالی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

امرار اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ اور نانا کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخش محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخش ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا کا غذا، انجام کا مر گیا۔ تہا سے چچا (زاد) فیاض الدین احمد خاں کی سرکار سے تھمیز و تمہین ہوئی۔ اجا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگر چہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھئے چھٹا ہے یا ضبط ہو جائے۔ بدست صاحب ساری ملاک سچ کر نوش جان کر کے بیابانی دروگوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کے پاس سو روپے کے اٹاک اگر اشت ہو کر پھر قرق ہو گئے۔ تباہ و برباد لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھئے کیا ہو۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔

لوہارو والوں کے لٹ جانے کا حال اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ غارت زدہ اشیار کی بیش بہائی کا کون اندازہ کر سکتا ہے؛ صرف کتب خانہ بیس ہزار روپے کا تھا جن میں غالب کی نظم و نثر کے قلمی مجموعے بھی شامل تھے۔

۱۷۔ بخشیدوں کا خاندان دہلی کا بلند پایہ خاندان تھا۔

۱۸۔ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں۔

۱۹۔ نواب غلام محی الدین خاں عرف بڑے صاحب دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے، ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن تھی۔ تین سو روپیہ ماہانہ بھرت پور سے ملتے تھے، پانچ سو روپیہ ماہانہ کرایہ تھا۔

۲۰۔ حکیم رکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے تھے وہاں سے پکڑے آئے لیکن بے قصور ثابت ہوئے۔ ۲۱۔ اردوٹے معنی صفر ۱۲۰۲۔

حامد علی خاں | نواب حامد علی خاں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، بہادر شاہ کے وزیر رہ چکے تھے۔ غدر میں ان پر بھی آفتیں نازل ہوئیں۔ ساری جائیداد ضبط ہو گئی۔ غالب ایک جگہ حسین مرزا کو لکھتے ہیں :

مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو۔ وہ قومیت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا
بانع کی صورت۔ بہ نئی محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں۔ اب پھانک اور
سرتا سرد کانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا
مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا ملوکہ و مقبوضہ
ایک مکان ڈھادیا ہے۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں کہ حامد علی خاں کراہیہ کے مکان میں رہتے ہیں۔
عام سختیاں | دہلی میں غدر کے بعد حکام کی سخت گیر لوہاں کا یہ عالم تھا کہ کسی کوتلانی کی بھی
امید نہیں رہی تھی۔ غالب بہ حسین مرزا کو لکھتے ہیں :

تم اب تک سمجھے نہیں کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ احکام کہ دہلی میں ہیں وہ
احکام قضا و قدر ہیں ان کا کوئی ممانعہ نہیں۔

ایک لطیفہ | غالب نے انگریز حکام کی بے خبری اور اہل ہند کے احوال سے ناواقفیت
کے متعلق ایک عجیب لطیفہ لکھا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد جن لوگوں
کو سزائیں دی گئیں یا جن کی جابیہ دیں ضبط کی گئیں ان کے مفروضہ یا نتیجی جرائم کا
امتحان کرنے والے اور ان پر حکم لگانے والے کس دل و دماغ کے تھے۔ دہلی کے
آدمیوں میں ایک حافظ محمد بخش تھے جو حافظ مموں کے نام سے مشہور تھے۔ غدر میں
پکڑے گئے۔ لیکن بے گناہ ثابت ہوئے۔ اور رہائی پا گئے۔ بعد ازاں انہوں نے املاک کی
واگزارشت کے لئے درخواست کی۔ ان کا قبض و تصرف ثابت تھا۔ سرت حکم کی دیر تھی
لیکن جب مقدمہ پیش ہوا۔ مسل سامنے آئی تو :

حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں، پھر پوچھا کہ حافظ مومن کون؟ عرض کیا کہ میں؛
اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ مومن۔ مومن۔ مشہور مومن۔ (صاحب نے) فرمایا یہ کچھ بات نہیں
حافظ محمد بخش بھی تم، اور حافظ مومن بھی تم، سارا جہان بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم
مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں مومن اپنے گھر چلے آئے۔

جامع مسجد | غدر کے بعد جامع مسجد بھی سرکاری قبضے میں چلی گئی تھی، شاید اس وجہ سے کہ شہر پر
انگریزوں کے حملے کے وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے جامع مسجد سے نکل کر
حملہ کیا تھا، اور انگریزی فوج کو مار کر پیچھے ہٹا دیا تھا یا اس وجہ سے انگریزوں کے دل
میں خیال بیٹھ گیا تھا کہ مسجد مسلمانوں کے لئے تبلیغ جہاد کا خاص مقام ہے۔ یہ برہان
بعض انگریزوں نے تجویز پیش کی تھی کہ مسجد کو گر جا بنا لیا جائے۔

سرپرٹ ڈپٹی غدر کے بعد دہلی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں چاندنی چوک
اور جامع مسجد کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ چاندنی چوک ایشیا بھر میں ہنرین بازار تھا، اور
مغلوں کے عہد عروج کی ساری شان و شوکت اس میں سمٹ آئی تھی لیکن غدر کے بعد
اس پر ایک گونہ افسردگی و پڑھردگی طاری تھی۔

جامع مسجد بجا طور مسلمانوں کی تعمیر کردہ عبادت گاہوں میں سے بہترین سمجھی جاتی تھی لیکن
اس میں سکھوں کی ایک بٹالین بھجادی گئی تھی۔

مسلمانوں کو شش کر رہے تھے کہ مسجد و اگزار ہو جائے۔ غالب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء
کے ایک مکتوب میں سیاح کو لکھتے ہیں:-

مسجد جامع کے باب میں کچھ پریشانیوں سے آئی ہیں۔ لیکن ہے کہ دائرہ رسی کا حکم آئے
اور وہ مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بہ دستور پہرہ لگا ہوا ہے۔ اور کوئی جاسے نہیں پاتا۔

۱۰

۱۰ ہندوستان میں میرے زمانے کے افراد و واقعات مصنفہ سر چرٹو ڈپٹی مل صفحہ ۱۳۰

دسمبر ۱۸۶۲ء میں مجروح کو لکھتے ہیں :-

مسجد جامع و گزشت ہو گئی۔ جتنی تبرکی عرف سیر مسیحوں پر کبھیوں نے دکانیں بناہیں۔ انڈیا مرغی
 کبوتر کھنے لگے۔ آئی امی ستم ٹھہرے۔ میرزا الہی بخش مولوی عبداللہ بن فضل میں غائب ہیں یہ سات اور۔
 گویا ستمبر ۱۸۶۲ء سے لے کر دسمبر ۱۸۶۲ء تک مسجد انگریزوں کے قبضے میں رہی۔
 شہر کی برائی [فاضل عبدالحکیم برہنوی نے اسی زمانے میں غالب سے نذر و نظر کے مجموعے مانگے
 تھے۔ جواب میں لکھتے ہیں۔

یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ انتہائی باقی۔ سدا ب فروشوں سے کہہ رہی نظم و نثر کے
 رسالوں میں سے کوئی سادہ مانے گا۔ فودہ مور لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے۔
 اکابر شہر اور خود غالب کی مصیبتوں کے اور بھی کئی مرقع ہیں۔ لیکن وہ پیش کی بندش
 کے بیان میں پیش ہوں گے۔

مرچھیتیں [سوائف آق یہ کہ غدر کے بعد دہلی پر پے در پے مصیبتیں نازل ہوتی رہیں مثلاً
 ایک دفعہ بیضہ پھیلا، ایک مرتبہ خشک سانی کے باعث کال پڑا، ایک سال برسات اس
 شدت سے ہوئی کہ بہت مکان گر گئے اور فصلیں خراب ہو گئیں۔ غالب ان تمام مصیبتوں
 کا تذکرہ مجملہ اور برسات کا تذکرہ مفصل ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

برسات کا نام گنا سوچا تو مجھ پر ایک غصہ ہوا، بہت شکر مرگروں کا، ایک غصہ اندام کا
 کا۔ ایک آفت۔ مائی۔ ایک سہاگن کال کی اس برسات میں جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج
 اکیسواں دن ہے۔ آج صبح سے آج تک نہ بار پڑا۔ نہ جھڑپیں۔ نہ چمکاتی تھیں۔ رات کو اگر کبھی کسی کے
 دکھائی دینے ہیں تو وہ بڑے کو بھونکھونکھتے لگے ہیں۔ نہ چھری راتوں میں چورس کی بنائی۔ نہ کوئی دن
 نہیں کہ دو چار گھر کی چورس کا حال نہ نہ مانا جائے۔ بالذات سمجھتا ہوں کہ ان حالتوں کے سبب ان آدمی
 جا بجا بکھر گئے۔ کوئی، یہ ہے۔ تھوڑے مختصر وہ ان کا کھٹا کر پانی نہ برسا۔ تھوڑے پیدا ہوا۔

اسے یہ مضمون خواجہ ظہیر نیشاپوری نے بھی باندھا ہے :- آفتاب امروز چوں برقی اردیا رماز شست

”پن کاں ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بونے ہوئے دانے بہ گئے، جنہوں نے ابھی نہیں بریا تھا وہ بونے سے رو گئے۔“

پانچ لشکر | ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

پانچ لشکر کا حملہ پہلے درپہ اس شہر پر ہوا۔ پہلا یاغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار ٹٹا۔ دوسرا خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آسمانی مرام ٹٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی مجھ کے مرے۔ چوتھا لشکر سیفے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طانت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ سے جتنا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا (باقی علی غام) ایک داروغہ۔ (کلو) خدا ن دونوں کو جلد صحت دے۔

وبا | میر مہدی نے غالباً پوچھا تھا کہ اب سیفے کی کیفیت کیا ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر انداز قضا کے زکش میں یہ بھی ایک تیر باتی تھا۔ قتل ایسا عام ہوٹا۔ ایسی سختی، کال البابڑا، دبا کیوں نہ ہو، لسان انیب (غالب) نے دس برس پہلے فرمایا ہے:-

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور سے،

وفات کی پیشگوئی | غالب نے پیشگوئی کر رکھی تھی کہ میں ۱۲۷۷ھ میں مرجاؤں گا، بلکہ ایک قطعہ تاریخ بھی خود مرتب کر لیا تھا:

من کہ باشم کہ جب اوداں باشم چوں نفیری نہ ماند و طائب مرد

در یہ پرسند در کد ایس مرد غالب؛ بگو کہ غالب مرد

لیکن یہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔ اسی سال سیفے کی وبا پھوٹی۔ غالب کو نہ مرنے کا

سلحہ خاکیوں سے مراد انگریزی فوج ہے اور یہ تسمیہ غالباً انگریزی فوج کی دردی کے رنگ پر مبنی ہے۔

ایک دلچسپ عذر ہاتھ آ گیا۔ مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

میاں شمس الدین کی بات غلط نہ تھی۔ گرد بائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رنج فساد ہوا (ہیفن) دیکھا جائے گا۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ شمس الدین میں نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔

اسی زمانے میں صاحب عالم مابودی نے غالب کی مدح میں چند اشعار کہہ کر بھیجے تھے۔

انہیں جواب میں لکھتے ہیں کہ دبائے عام میں صرف اس لئے جیتا بچا۔ کہ آپ کی مدح کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہو سکوں۔

غالب کا نقطہ ادبی پرانگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد شہر کی جو حالت ہوئی تھی اس کا نقشہ غالب نے چند اُردو اشعار میں بھی کھینچا تھا، لیکن یہ اشعار ان کے مطبوعہ اُردو دیوان میں شامل نہ ہو سکے۔ البتہ نسخہ حمید یہ میں اُردوئے معلّے سے لے کر شامل کر دیئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ اشعار غالب کے دوسرے کلام کے خلاف عام اشاعت نہ پاسکے اس لئے میں انہیں یہاں درج کرتا ہوں :

ہر سلحشور انگاستاں کا	بسکہ فعال مایہ ریہ ہے آج
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا	گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
حُرموتہ بنا ہے زنداں کا	جو کہ جس کو کہیں وہ قتل ہے
نقشہ خوں ہے ہر مسلمان کا	شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
آدمی داں نہ جاسکے یاں کا	کوئی واس سے نہ آسکے یاں کا
وہی روزناتن و ول جاں کا	میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
سوزش دانہا سے نہیہاں کا	گاہ چل کر کیا کئے شکوہ

گاہ رو کر کہہ کئے یا ہم ماجر ادیدہ ہاے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب

کیا مٹے دل سے داغ بجاں کا

عذر کے سلسلے میں غالب کے ماتم و عزاداری کی یہ داستان غم میری رائے میں کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس کا ایک حصہ ابھی باقی ہے، جو پیش کی بندش سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ مگر عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے تاثرات کی تصویر ہے۔ انہوں نے انگریزوں کی بے جا خوشامد نہیں کی اور نہ ان کی کسی منہتی یا شدت پر پردہ ڈالا۔ جہاں "کالوں" کی ورازدستیوں کی مذمت کی، وہاں "گوروں" کی زیادتیوں کو بھی صاف صاف بیان کر دیا۔ عذر کی وجہ سے دہلی پر جو آفتیں آئیں وہ اوپر کے خونچکاں مرقع میں تفصیل کے ساتھ پیش ہو چکی ہیں۔ جہاں بے گناہ انگریزوں بالخصوص بچوں اور عورتوں کا قتل غالب کے لئے رنج افزا تھا، وہاں اکابر و رؤسا و عوام دہلی کی برباد ہوں اور پادشاہی خاندان کی مصیبتوں نے بھی انہیں بے طرح تڑپایا اور ان کے ساتھ تاثر سے ایسے خون آلود نوے پیدا کئے، جنہیں سنکر آج بھی ہر حساس انسان بے اختیار اشکبار ہو جائے گا۔ آخر میں اتنا اور کہہ دینا چاہیے کہ غالب شاعر تھے۔ کسی خاص گروہ، خاص جماعت اور خاص قوم کے شاعر نہ تھے بلکہ مشرب و طریق کی وسعت اور تاثرات و احساسات کی ہم گیری کے باعث کائنات انسانیت کے شاعر تھے۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ ایک مخصوص گروہ و جماعت کے مخصوص تاثرات کے پابند ہو جائیں۔ ان کی نظروں میں تجاوز بہ ہر حال براتھا خواہ اس کے مرتکب ہندوستانی ہوئے یا انگریز اور الم نامہ عذر کے ہر صفحہ پر غالب کی یہ خصوصیت آشکارا نظر آرہی ہے۔

گیارہواں باب

پنشن کے لئے سعی سفارش

پڑھتی دستم و بے برگ خدایا پند
بہ سخن شاد شوم کایں گہرا ز کان من است

غالب کی مالی حالت کا نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے ان کی آمدنی محدود تھی لیکن خرچ امیرانہ تھا۔ غدر کے آغاز پر ان کے گھرانے کے مستقل ذریعے صرف دو تھے۔ قلعہ کے پچاس روپے اور خاندانی پنشن کے ستر روپے۔ یہ دونوں دروازے غدر کے ساتھ ہی بند ہو گئے۔ قلعہ کی تنخواہ اس لئے مسدود ہوئی کہ غدر بپا ہونے ہی غالب خانہ نشین ہو گئے اور انہیں قلعہ سے کوئی سروکار نہ رہا۔ دیکھتے ہی اس ہنگامہ عام میں ایک شاعر باتا رنچ نگار کی تنخواہ کا کسے خیال آسکتا تھا اور انگریزی حکومت دہلی سے غدر کے ساتھ ہی ان کے لئے بھی سب انگریزی اقتدار دوبارہ قائم ہوا تو غالب پر باغیوں کی طرفداری کا الزام عائد ہو گیا۔ اس بنا پر وہ نہ محض خاندانی پنشن ہی سے محروم ہوئے بلکہ خلعت و دربار کا اعزاز بھی کھو بیٹھے۔ پنشن کا پورا روپیہ تین برس کے بعد اپنی ستر روپے ایک مشت ملا اعزاز کی بجالی کے لئے

نہیں مزید چند سال انتظار کرنا پڑا۔

جن دوستوں سے اس افتاد میں دستگیری کی امید ہو سکتی تھی وہ خود مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ گھر میں غالب کے پاس کوئی قیمتی اثاثہ نہ تھا صرف زیورات تھے جنہیں بیگم نے غدر کے آغاز ہی میں بغرض حفاظت شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کے مکان کے تہ خانہ میں رکھوا دیا تھا جہاں اور بھی کئی گھروں کی قیمتی چیزیں جمع ہو گئی تھیں۔ اس تہ خانے کے تمام محفوظات انگریزی فوج کے ہاتھوں لٹ گئے۔ غالب کے پاس صرف کپڑے یا بعض معمولی اشیاء باقی رہ گئی تھیں جنہیں بیچ بیچ کر یا قرض لے لے کر وہ قوت لائیت کا انتظام کرتے رہے۔ جولائی ۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں مرحوم والی رام پور نے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور کسی قدر سہولت کی صورت پیدا ہوئی لیکن اس سے پستیز قرض کی بھاری رقم ان کے ذمے ہو گئی تھی اور رام پور کا وظیفہ ان کے گزارے کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس کا کوئی حصہ ادا کئے قرض میں صرف ہونا۔

یوں تو عہد طفلی کو چھوڑ کر غالب کی زندگی کا ہر دور کشائش و مجمع کے سامان سے بالعموم تھی دامن رہا۔ لیکن غدر کے بعد تین برس بالخصوص بڑی پریشانی اور عشرت میں گزرے۔ پینشن سے کہیں زیادہ انہیں خلعت و دربار کی بندش کا قلق تھا جسے وہ ذاتی اعزاز اور خانہ دانی و جاہت کا زوال سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے مکانات بے طور خاص درد سے لبریز رہے۔

حکامہ سے بے تعلقی | غدر میں پہلے باغیوں نے پھر انگریزی فوج نے شہر پر جو مصیبتیں نازل کیں ان سے غالب کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ وہ اس درجہ افسردہ خاطر تھے کہ ابتدا میں انگریزی حکام کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ ہر کو پاں تفتہ کو ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں رقم فرماتے ہیں۔

مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں، نہ قید۔ نہ رنجور ہوں، نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں، نہ ناخوش۔
 نہ مردہ ہوں، نہ زندہ، جئے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب
 گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے۔
 جو تقریر سے برسبیل حکایت ہے۔

پنشن کے لئے سلسلہ جنبانی اوقات گزر جانے پر رنج و الم کی شدت کم ہوئی اور احتیاجات
 نے تنگ کیا تو پنشن کے لئے جدوجہد شروع ہوئی۔ لیکن ہر طرف مایوسی کی تیرگی
 نظر آتی تھی۔ میر ہمدی مجروح کو لکھتے ہیں :-

دیکھا اس پنشن قدیم کا حال۔ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کو پنشن سے بھی بڑھ خلعت و دربار کا
 قلق تھا۔ مجروح نے غالباً لکھا تھا کہ پنشن کے لئے گورنر جنرل کے پاس مرافعہ
 کرنا چاہیئے۔ جواب میں لکھتے ہیں :

بے مے نکلند در کف من خسارہ روائی

مرد است ہوا آتش بے دود کجائی

میر ہمدی صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ نیگبٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے،
 دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں۔ پٹے آتش سیال (شراب)
 کہاں کہ جب رد جبرے پیئے نورگ دیئے میں دوڑ گئی۔ دل تو ماہو گیا، دماغ روشن
 ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساتی کوثر کا بندہ اور نشہ لب ہائے
 غضب اٹائے غضب !!

میاں تم پنشن پنشن کہہ رہے ہو۔ گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر
 صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر جب ان تینوں نے جواب دیا ہو
 تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالچے پر طعنے ہوئے

ہیں، تم کو پنشن کا فکر ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں،

میرا دربار اور خلعت دریا برد ہو گیا۔ نہ پنشن کی توقع، نہ دربار و خلعت کی صورت

نہ سزا، نہ انعام، نہ رسم معمولی قدیم۔

دوسرے پنشن داروں کے حالات | بعض دوسرے پنشن داروں کے اور اپنے حالات بیان

کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

اے لائٹی دن ہوئے حیدر خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں،

حوالات میں ہے، دیکھئے حکم خیر کیا ہو۔ . . . جو کچھ ہونا ہے ہو رہا ہے، گارہر شخص کی

سرفروشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں نہ کوئی قازن ہے، نہ قاعدہ، نہ نظیر کام آئے نہ

تقریر پیش جائے۔ ارتفعئے خاں بس مرتفعئے خاں کی پوری دوسو روپے کی پنشن کی منظوری کی

رپورٹ آگئی اور ان کی بہنوں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے

بھائی بھرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بہ طریق ترجمہ دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترجمہ یہ

ہے تو تغافل کیا قہر ہو گا؟ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کار و شناس . . . ۵۳ برس

کی پنشن، تقریر اس کا بہ بخوبی لارڈ لیک وہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے

گا، خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی گاندہ ہوں، اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا، اس وقت

کلہ (داروغہ) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض

کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل

پنشن کے لیے سعی کی روداد | اب پنشن کے لئے سعی کی روداد ملاحظہ فرمائیے،

عرفی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرفی

مع کو غلط فہم نہ سائل کہ بھجادی جائے اور یہ لکھا اجائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی

کے پیش کردہ، اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موثق دستویر کے خط لکھتا۔ یہ

نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر چائیس انڈس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کی پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے پاس آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعینل اس حکم کی نہیں کی ہے۔ یوں تو ان کے ہاں یہ رو بکاری آتی ہے۔ دیکھتے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں دفتر کہاں رہا ہے جو اس کو دیکھیں گے۔

”دستنبو“ کی طباعت میں ”دستنبو“ کے چھپوانے میں بھی اسی غرض سے عجلت کی گئی تھی۔ عجلت کی غرض کہ کتاب کے ذریعہ سے حکام کے ساتھ تجدید روابط کی مناسب صورت پیدا ہو جائے۔ چودھری عبدالغفور خاں سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں،
 راہ درسم مراسلت حکام عالی مقامت بہ دستور جاری ہوگئی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر
 غرب دشمال (اگرہ و اورہ) کو نسخہ ”دستنبو“ بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی شعر
 تحسین عبارت و قبول صدق و ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہار تہنیت
 دست بھیجا گیا اس کی رسید آگئی۔ وہی خاں صاحب بسیار صربان دوستان، القاب
 اور کاغذ افستانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ رابرٹ منگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر
 تلمر و پنجاب کی مدح میں بہ تو وسط حیف کستہ بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی
 خوشنودی نامہ بہ تو وسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔
 جب ملے گی حضرت کو اطلاع کر دی جائے گی۔

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے کوٹوال سے کیفیت طلب کی گئی تھی فرماتے ہیں :-

پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوٹوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔
 خواتین اسنادی | خائب برائے خوش اسناد تھے۔ صاحب نے بڑا یا اچھے انداز میں لفٹنٹ

کی اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب پنشن ملنے والی ہے۔ لکھتے ہیں،

ہفتے کے دن ساتویں اگست ۱۸۵۸ء کی مجھ کو اجمرٹن صاحب نے بدایا کچھ سہل سواں مجھ سے کئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے

کہ پندرہ مہینے پہلے بھی ملتے ہیں یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے۔

حالانکہ اس کے بعد بھی پنشن کے حصول میں کم و بیش پونے دو برس صرف ہوئے۔

”دستنبذ“ کے نسخے مختلف حکام کے پاس پہنچے اور رسیدیں آنے لگیں تو پھر غالب کی کشت امید میں آبیاری کا سامان ہوا۔ اوائل مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

صاحب کشنر بہادر دہلی یعنی جناب سائڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو دیا پنجشنبہ ۲۴ فروری

کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اٹھا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔

کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چاردرق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب

پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط بہ حاکم بہر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں،

ان کا حال دریافت کر کے ماکہ۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملک معظمہ سے خلعت کیا

مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھو اور دیا، پھر پوچھا تم نے

کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک کتاب میکلورڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی

ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا کل حاضر کروں گا۔ پھر پنشن کا حال پوچھا وہ گزارش

کیا۔ اپنے گھر آیا۔ اور خوش آیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے خوش اعتقادی کی بنا پر غالب نے انہی استفسارات

کو نئی خوشگوار امیدوں کا بیج بنالیا۔ فرماتے ہیں:-

دیکھو میری حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر؟ کتبوں سے کیا اطلاع؟

پنشن کی پرسش سے کیا مدعا ہے؟ استفسار بہ حکم گورنر جنرل بہادر ہوا ہے اور یہ صورت

مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔

دوسرے روز وہ کتابیں لے کر گئے۔ لیکن سائنڈرس صاحب باہر چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ کتابیں منشی کے حوالے کر دی جائیں۔ ایک دن کا وقفہ ڈال کر غالب پھر ملاقات کے لئے گئے۔ سائنڈرس صاحب نے بہت انتہات سے باتیں کیں۔ غالب نے گورنروں کے سرٹیفکیٹ دکھائے میکلوڈ صاحب کے نام ایک خط لکھوا کر لے گئے تھے۔ وہ سائنڈرس صاحب کو دیا کہ دستبنو کے ساتھ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ پھر پنشن کے متعلق گفتگو ہوئی تو سائنڈرس صاحب نے کہا کہ اجمرٹن صاحب سے ملو۔ اس تحریر کا آخری حصہ غالب کی خوش اعتقادی کا ایک ورد پچسپ مرفح ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بس تمام مصیبتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور صبر و ثبات کی آزمائش پوری ہو گئی ہے۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ پنشن ملنے والی ہے۔ بلکہ اس انداز میں کہ فرماتے ہیں کہ تو یا سارا روپیہ ان کی جیب میں پیش کر چکا ہے،

دیکھو سید (میر محمدی) مد اللہ الغائب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو اس طرح بچا۔ بائیس ستمبر تک (بتدائی ۱۸۵۹ء سے لے کر اواخر فروری ۱۸۵۹ء تک) بھوکا سا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس حکم سے کہ وہ آج سلطنت دہندہ ہے میرے تعلق کا حکم بھجوا۔ حکام سے بچو اور سوائے میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا شاہراہ تھا میں کہا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا۔

لیکن اس کے بعد بھی سرت و ذلت مستی کے چوردہ مینے گزرنے والے تھے۔ افسردہ کے حالات کی جستجو اس زمانے میں وہ مختلف افسردہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت مندرجہ ذیل تھے کہ شاید کوئی ایسا افسر آجائے جو ان کا شناسا

ہواد حکومت میں اچھی رپورٹ پیش کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ مکاتیب میں جا بجا مختلف دوستوں سے مختلف افسروں کے متعلق استفسارات ملتے ہیں۔ مثلاً منشی شیونراٹن کو لکھتے ہیں:-

وہ نمبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا اس میں ایڈمنسٹن صاحب کے لفٹنٹ ہونے کی اور بہت جلد اگر وہ آئے کی خبر لکھی تھی۔ یہاں مجھ کو کئی باتیں پوچھنی ہیں ایک تو یہ کہ یہ چیف سکریٹری گورنر جنرل کے تھے۔ جب یہ لفٹنٹ گورنر ہوئے تو اب چیف سکریٹری کون ہوگا؟ یقین ہے کہ ولیم میور صاحب اس عہدے پر مامور ہوں۔ پس اگر وہ نہیں ہے تو ان کے محکمہ میں چیف سکریٹری کون ہوگا؟ دوسری یہ کہ میرمنشی ان کے تو وہی منشی غلام غوث خاں ہیں گے؟ تیسری یہ کہ گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے میرمنشی ایک بزرگ تھے، بلگرام کے بننے والے منشی سید جان خاں۔ آیا اب بھی وہی ہیں یا ان کی جگہ کوئی اور صاحب ہیں؟ ان سب باتوں میں سے جو آپ کو معلوم ہوں وہ اور جو نہ معلوم ہوں ان کو معلوم کر کے مجھ کو لکھئے اور جلد لکھئے اور ضرور لکھئے۔

ایک خط میں خواجہ غلام غوث خاں پنجبر سے اس قسم کے متعدد استفسارات کئے ہیں مثلاً گورنر جنرل کا چیف سکریٹری ایڈمنسٹن کی جگہ کون ہوا؟ لفٹنٹ گورنر کے سکریٹری کا کام کس کے حوالے کیا گیا؟ گورنر جنرل کا دورہ کب شروع ہوگا؟ دستنبو کی رسیدوں پر خوشی اؤستنبو کے نسخے جا بجا بھیجتے جاتے تھے اور جب کہیں سے رسید آتی تھی، پھولے نہیں سالتے تھے۔ اگر کسی کی طرف سے اطلاع نہیں ملتی تھی تو پھر وہ ہو جاتے تھے پنجبر نے لفٹنٹ گورنر کے نام پارسل پہنچنے کی اطلاع بھیجی تو اس پر

۱۔ سر جارج فریڈرک ایڈمنسٹن ۱۹ جنوری ۱۸۵۹ء سے لیکر ۲۴ فروری ۱۸۶۳ء تک موجود تھے۔ لفٹنٹ گورنر ہے

۲۔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۱

خوش ہو کے لکھتے ہیں :

اس نامہ نمبر نے دیکھا جو پارہ برکات خشک سے کوئے یعنی خط اوپر رس کا پہنچ جاتا۔ بسا
 نہیں کہ اس سے خبر کو نہ بخت کی رہائی و سپان گزارہ ہوں۔ یہ تو غم کا لمحہ ہے۔
 کہ وہ سر پاس، خط معاً اس خط کے ساتھ بالیہ اور کم کو تو ان کہتے ہیں اس نامہ پر شدہ اس
 واسطے کہ اس خط میں حکم غلطی کے نام و ضمن ہوتا ہے۔ مانتا ہوں کہ حکم ایک اور ک
 ایک اور اور یہ اس دنوں کا تھا۔ اس دنوں کے اس نامہ اور ک

کہ نہ مانیں گا۔ جب اس حضرت اس سر رسنے سے معلوم کر کے لکھیں۔

ایڈیٹسٹن صاحب گورنر بن کر آئے۔ تو غالب نے انہیں بھی دیکھا۔ پھر
 گورنری کی تنہا ہے ایک فارسی قصیدہ غرض کیا جواب ہے ایک فارسی خط آیا جو
 کتاب کی رسید، نظم، کتب میں پر مشتمل تھا۔ بعد ازاں غالب نے پہلی ایک لفافہ لکھا۔
 سر رایت نمبروں کو بھی ایک قصیدہ بہار میں فرماتے ہیں :

یہ نامہ باب میں ابھی کچھ حکم نہیں، اسباب وقت رہا۔ مانتے ہیں اور یہ
 یہ نامہ کھانا ہی نہیں ہوں۔ اس سیر گوشت ان کو اور بائے بھر رہا۔ ان کو
 ملے جاتی ہے۔

حکام و اہل کی مخالفہ رپورٹ امجد م ہونا ہے کہ دہلی کے ادارہ نظم و نسق نے غارتہ سے کہہ دیا
 رپورٹ بھیجی تھی اور صاف لکھا تھا کہ ویشن کے مستحق نہیں ہیں بلکہ حکام و
 نے ویشن کی منظوری دے دی۔ غالب خود فرماتے ہیں :

گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حکام کی رائے میری ویشن کے جواب کا حکم دیا
 ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

میر دار دگر سے پختا کر امت اسد نفی بہان میں دیا گیا تھا۔ پھر
 لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز ویشن پانے کا مستحق نہیں۔ حکام صدر مجد کو ویشن دوا دے اور

پورا دلوائے۔

نور زحران کا حکم ۱۸۹۶ء مارچ سہ ماہ کے ایک کتب میں فرماتے ہیں :

نواب نور زحران بہادر نے مالک پنہاں، علیا کوہاڑا ہی سے فدا شدہ شخص کی پیشگی پیشکش کے چرچے سے
ہوئے روپے کے ایک منہ مت پانے کی اور آئندہ ۱۰ ماہ بہادری کی رپورت منگوا کر اپنی منظوری
لکھ کر ہمارے پاس بھیج دینا کہ عالم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی
تعمیل بہ طرز مناسب ہوئی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا۔

مدخرج | جن لوگوں کے لئے پیشکشوں کی منظوری ہو چکی تھی یا جن کے حق میں ابھی رپورٹیں
ہوئی تھیں اور توقع تھی کہ انہیں ضرور پیشکشیں مل جائیں گی انہیں ساری چڑھائی ہوئی رقمیں
ملنے سے قبل ۱۸۵۹ء میں قریباً ایک ایک سال کی رقمیں علی الحساب دی گئی تھیں۔
غالب فروری ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں :

علی بخش نماں بپاس روپے مہینہ باندھے ہیں۔ بائیس مہینے کی (دہائی ۱۸۵۹ء) نا جنوری
۱۸۵۹ء گیارہ سو ہوئے ہیں۔ ان کو مجھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔
آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پیش دار بائیس
مہینے کے بائیس سو دوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو
روپیہ مہینہ، بائیس مہینے کے تین ہزار تین۔ وہ دوتے ہیں اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔
مناجمدار اس روپے مہینے کا سکہ لیر سال بھر کے ایک سو بیس روپے ملے آیا۔ اس طرح
پندرہ سو روپیہ آدھوں کو ملا ہے۔

مدخرج | اس کا نام مدخرج تھا۔ اور صرف ان لوگوں کے لئے منظور ہوا تھا جو
بے گناہی کے علاوہ مالی بے مقصدوری کے متعلق چار گواہ پیش کر دیں۔ فروری ۱۸۵۹ء
میں دوسرے پیش داروں کو مدخرج ملا تو غالب نے بھی اس کے لئے کوشش کی۔
حتیٰ کہ وہ خطوں پر خط لکھے۔ بڑی دیر کے بعد کوٹوال کے نام حکم آیا :

اسد الشفاں پیش دار کی کیفیت لکھ کر وہ بے سفا اور محتاج ہے۔ نہیں۔ کو تو اس سے
موافق حساب کے مجھ سے چا گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کو تو انی۔ بدترہ جائیں گے اور
سیری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ۔ سمجھو کہ بعد نسبت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ
مل جائے گا نہ صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہرے گا چھ مہینے یا
برس دن کا روپیہ ملے الحساب پانے کا۔

غالب کو اس وقت کچھ نہ ملا اور پورا ایک سال گزرنے کے بعد پیش کی منظوری
ہوئی۔ صرف دفتری کارروائی کی تکمیل باقی تھی۔ کمشنر نے حکم دیا کہ اگر علی الحساب سو روپیہ
لینا چاہو تو اسے لو۔ غالب نے اس وقت بھی سال بھر کے روپے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جواب
ملا کہ جب سارا روپیہ جلد ملے والا ہے۔ تو اتنی بڑی رقم علی الحساب لینے کی
کیا ضرورت ہے۔

تین سال کا روپیہ مل گیا | غرض ۳۴ مئی سنہ ۱۸۵۷ کو تین سال کا روپیہ ایک مشت ملا۔ اور
آئندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کا حکم ہوا۔ ۱۴ مئی سنہ ۱۸۵۷ کے خط میں لکھتے ہیں:
نہ سہ سالہ مجموعہ سزائوں کہیں سے نہ ایسا سو پچاس پاناموں میں برس کے دو ہزار
دو سو پچاس سوٹ۔ سو روپے بے۔ خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات
میں گئے۔ بہت دو ہزار روپے، میرا مختار کا ایک بنیا ہے سادریں اس کا قرضدار قدیم
ہوں۔ اب جو دو ہزار روپے لایا اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور مجھ سے کہا میرا حساب
یکہٹے۔ سات۔ کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متصرف کا اسی سے
حساب کرایا کیا۔ سو کٹی رہے وہ نیلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو سوٹے۔ اصل میں
یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھانا وہ کہتا ہے کہ پندرہ سو میرے دسے دو پانسو سات باقی تہ
لے لو میں کہہ جوں متفرقات گیارہ سو چھ دیتے تو باقی نو سو ہے آدھے نو لے آدھے مجھے دسے
برسوں پر تھی (۳۴ مئی سنہ ۱۸۵۷) کو وہ روپیہ لایا کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی

تھیں گزاردو ایک مہاجن بچہ میں۔ دھننے بھریں جھکڑا فیصل ہو جائے گا۔
بالکل بھی تفصیل میر مہاراجی مجرور کو لکھنی۔ مختار کے ساتھ فیصلے کے بعد ایک خط
میں لکھتے ہیں :

پنشن بے کم ۵۰۰ روپے جاری ہوا۔ زر مجموعہ سد سارہ یک مشت مل گیا۔ بعد ازاں حقوق
چار سو دینے باقی رہے۔ در مستاتی رہ پئے گیارہ آنے مجھے بچے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ با تو مختار نے اپنے قریبی کے سود میں کمی کردی تھی یا اس کا
تھوڑا بہت روپیہ باقی رہ گیا۔ اور غالب نے اسے عام "حقوق" میں شامل نہیں کیا تھا۔
نوٹ کیا دو وجہیں | پنشن کار روپیہ مل جانے پر خوشی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قرضخواہوں سے
کم از کم تھوڑی سی مدد کے لئے بہتات مل گئی۔ دوسری وجہ تھی کہ عزت نہ گئی اور حاد مل
لے لے اغراض کی بنیاد پر۔ فیصلہ ہی۔ وہ خود فرماتے ہیں :

ات ہائی بہت رہ گئی۔ ہاں مدد، موت آئی، اور سب شاد ہو گئے۔ یہاں ہرکا

سب، جب تک جوں ۱۰۵ ایسا ہی رہوں گا۔

خلعت و دربار | پنشن کا قہیہ ملے ہو گیا تھا۔ میں غالب کے خاندانی اعزاز کی ایک بڑی چیز
ہوئی۔ پنشن سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ دربار و سماعت کی عزت تھی۔ اس کی بحالی کے
لئے مزید جہد و جہد کرنی پڑی۔

گورنر جنرل نے نشست کے آغاز میں میر محمد میں دربار کیا تھا۔ غالب متوقع تھے کہ
حسب معمول انہیں بھی وہاں بلایا جائے گا۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ سب
انتظار کے بعد درخواست کی کہ سابقہ قاعدے کے موافق دربار میں بلایا جائے۔
جو اس بار نہ ہو سکیں۔ اور دوبارے بعد گورنر جنرل دہلی آئے۔ تو غالب سب

معمول کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچے۔ سواری اظہار حسین صاحب میر نقش سے ملے۔
چیف سکریٹری کو اطلاع کرائی۔ جواب ملا کہ فرصت نہیں دوسرے روز پھر گئے۔ اور
اطلاع کرائی۔ لیکن میر نقش نے جواب دیا کہ "ایام غد میں باغیوں سے اخلال
رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"
غائب فرماتے ہیں:

اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خزانہ کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ
کہ باغیوں سے میرا خدائیں مطمئن نہیں۔ امید داروں کہ اس کی تحقیقات ہو
تاکہ بری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ملا۔ اب
ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۹۴۷ء میں پنجاب سے ملک سے جواب آیا کہ رڈ سب اور
فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔
ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

میر نقش صاحب سے ملا۔ ان کے خیمے میں اپنے نام، کلمات، کارڈ، صاحب سکریٹری بہادر
نے، میں بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدار کے دنوں میں پادشاہی باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔
اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم سے ممنوع نہ ہوا
جب تک کہ صاحب بہادر لکھتے پہنچے۔ میں نے قسیدہ حسب معمول بھیج دیا۔ مع اس
حکم کے کہ وہیں آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔

جیون لال کارونناچ | میرا خیال ہے کہ محض غائب ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے اکابر پر بھی
غدر میں شرکت یا باغیوں سے اخلال کا جواز لازم لگا تھا اس کی بنیاد نقش جیون لال

یہی قسیدہ ہے جس کے متعدد یوسف میرز کو لکھنے میں کہ وہ جسے دن رات غور جگر کھایا اور ایک قصیدہ جو قصیدہ بیت کا
ملا۔ یہ قصیدہ مستور کو دیا۔ وہ بھی اس پر کچھ لکھ کر دیا۔ اس میں انرا اپنی بہترین شہرت لکھی ہے۔

کے روزنامہ پر تھی۔ منشی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ غدر کے دوران میں دہلی میں انگریزوں کے خاص جاسوس تھے اور شہر کے حالات کے متعلق روزانہ رپورٹیں بھیجا کرتے تھے جن میں بعض رپورٹیں بڑا ہتہ غلط ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر غالب کے متعلق مرقوم ہے کہ انگریزوں پر فتح حاصل ہونے کی خوشی میں بہادر شاہ کے روبرو قصیدہ پڑھا۔ حالانکہ غالب غدر میں گھر سے باہر نہیں نکلے تھے۔

اعزاز کی بجالی | بہر حال پنشن کھل گئی۔ لیکن دربار و خلعت کی بجالی کے سلسلے میں تحقیقات ہوتی رہی۔ جب غالب بے گناہ ثابت ہوئے تو مارچ ۱۸۶۳ء میں خلعت و دربار بھی بحال ہو گئے۔ غالب لکھتے ہیں:

دوشنبہ ۳ مارچ (۱۲۶۳ھ) کو سوا دسہر مخیم خیام گورنری ہوا آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی انجم حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت یہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کہ حضرت نے کہا کہ حاکم مال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقہ کے سب کا غذا انگریزی و فارسی دیکھے اور یہاں جلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت یہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔

دوسرے دن سر رابرٹ ٹنکری لفٹنٹ گورنر پنجاب نے بلا کر خلعت دے دیا۔ اور کہا کہ اگر گورنر جنرل کے دربار انبالہ میں شرکت کرو گے۔ تو وہاں بھی خلعت ملے گا۔ غالب اگرچہ لفٹنٹ گورنر صاحب سے کہہ آئے تھے کہ انبالہ کہاں جاؤں گا۔ لیکن مصارف سفر کا انتظام نہ ہونے کے باوجود جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس سے چند ماہ قبل ان کے ہاتھ پر پھنسی نکل آئی تھی، جس نے سخت تکلیف دہ صورت اختیار کر لی۔ اس بنا پر انبالہ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

سر سید مرحوم کی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ غالب کی پیش اور دربار و خلعت کی نکالی کے لئے سر سید احمد اہل مرحوم نے خاص کوشش فرمائی تھی۔

سر سید اور غالب کے درمیان آئیں۔ اکبری کی تقریظ کے وقت سے ایک گونہ کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ اور میں جوں کے مراہم ختم ہو گئے تھے، وہ پہلی مرتبہ رام پور گئے۔ تو سر سید اس زمانے میں مراد آباد کے صدر الصدور تھے۔ اگرچہ ذاب و ایاب میں مراد آباد سے گزریے لیکن سر سید کو اطلاع نہ دی واپس ہوتے ہوئے سراسے میں ٹھہرے تو سر سید کو کہیں سے خبر مل گئی۔ وہ فوراً سراسے میں پہنچے۔ بہ اصرار غالب کو مکان پرے گئے اور ایک دو روز ٹھہرایا اس کے بعد کشیدگی رفع ہو گئی۔

پانکی سے اترتے وقت شراب کی بوتل غالب کے ہاتھ میں تھی۔ جسے انہوں نے سر سید کے مکان میں السی جا۔ پر رکھ دیا جہاں ہر آتے جاتے کی نہ پڑتی تھی۔ سر سید نے اسے بہ نظر احتیاط اسباب کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ غالب کو بون نسر نہ آئی تو بہت پریشان ہوئے لیکن سر سید نے اس پریشان دلایا اور اسباب کی کوٹھڑی میں لے جا کر بوتل دنگری۔

اس موقع پر سر سید کو غالب کی پریشان حالیوں کی پوری کیفیت معلوم ہو گئی۔ اور انہوں نے پیش اور دربار و خلعت کے لئے سعی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا ہوگا۔ چونکہ پیش حکام دہلی کی رائے کے خلاف حکام صدر کے احکام سے بحال ہوئی تھی۔ اس لئے اغلب ہے یہ سر سید کی مخلصانہ سعی کا نتیجہ ہو۔

غالب اور غدر [مناسبت مضمون کا تقاضا یہ ہے۔ کہ لارڈ کیننگ، سر رابرٹ ٹننگری اور بعض دوسرے انگریزوں کے نصیحتیں ہیں اپنے اور غدر کے باب میں جو کچھ غالب نے لکھا ہے اسے بھی یہاں درج کر دیا جائے۔

لارڈ کیننگ کے قصیدے میں فرماتے ہیں :

بہ کو کی شدہ ام ریزہ چین خوان نوال
وے ازاں بہ مال و منال توقیع
نہالم از ثمر پیش رس بہ بار آمد
کم است آنچه بہ تحویل خاکسار آمد
زیات جرعه فزوں مے فرد نرفت بہ خلق
بہ پیرم ز نقا صاع طبع اورچ گراے
پھر فرماتے ہیں کہ ملکہ دکنوریہ کی مدح میں قصیدہ بھیجا۔ وہاں سے خوشنودی کے خط
آئے۔ لیکن آسمان کہہ رہا تھا کہ دیکھیں تو کس طرح گوہر مقصود حاصل کرتا ہے۔ اسی
اتنا میں غدر برپا ہو گیا۔

بہ نا گرفت چناں صرصرے وزید بہ دہر
شرارہ بار غبارے ز غر خاک انگیخت
کزاں بر آئینہ آسمان غبار آمد
سیاہ رو سپہے کاندہیں دیار آمد
تو گوئی آہ من آں را غبار مے گیرم
دریں جگر گس آشوب کو صوبت آں
سپاہدار سپہری بہ ز شہار آمد
بہیں بس است کہ ہر گزہ رستگار آمد
گواہ دعوی غالب بہ عرض بے گنہی

خطاب خلعت پیش ز شاہ مے خواہم
پس از سہ سال کہ در سچ و بیچ و ناب گزشت
ہم از نخت بدیں وایہ ام قرار آمد
سرگزارش اندوہ انتظار آمد
منشگرمی کے قصیدے میں لکھتے ہیں :
نوکراہیں فتنہ کہ بر خاست زانہو سپاہ
چوں دریں شہر ستم بہر کہ نامش دہا است
بندہ مے خواست کہ بیرون و داما بہرود
ماندو آئین و فاداشت در آن عہد و ہنوز
بہ زبانی کہ قلم رات سرا سردارو
دیدم آشوب کہ ہنگامہ محشر دارو
توانست کہ از گوشہ قدم بردارو
نیز آن قاعدہ با خویش مقرر دارو

جز شنائے و دعائے کہ ہے گفت نگفت
 و اگر ای نیز قصور است کہ تدبیر نہ کرد
 بود بایندہ در ای روز و ہم روز بجا
 خود بریں قول کہ ماقم زده و مردہ دل است
 بہ گواہان و گر نیز گرفتار حاجت
 از توجہ داد نخواہم کہ در آئین و داد
 ہوس کار و گزینست بہ جز شعر و شراب
 اس قصبہ کے آخر میں بھی یہی لکھتے ہیں۔ کہ ملکہ و کٹوریہ کا قصبہ دیکھ کر بھیجا۔ وہاں سے
 دو خوشنودی نامے آئے۔ نیز گورزدوں کے خط پہنچے۔

ایڈمنسٹرن کے قصبہ سے میں فرماتے ہیں:

از حدیث شہدائے خاطر نشان بن بود
 ناگہ ز تند بائے کاں خاست در قلمرو
 در وقت فتنہ بودم غلبین و بود بامین
 عاشقا کہ بودہ باشم باغی بہ آشکارا
 از تہمت کہ بر من بستند بد سگالان
 در پیریم ازین نم جز مرگ چارہ نبود
 در مز و مدح سنجی سد کونہ کا مراڈ
 بر ہم زد آن بتار انیرنگ آسودانی
 زاری و بیہ لوائی، پیری و ناتوانی
 عاشقا کہ کردہ باشم زک و فانی تہانی
 حکام راست بامین یک، گونہ مرگ رانی
 خود پیر گشتے من بود سے اگر جوانی

دارم شکرت حالے از مرگ و زلیست بیروں
 جاں گر چہ ہست شیریں تلخ است زندگانی

بارہواں باب

عوارض اور وفات

ہزار خستہ درنجور درجہاں داری

یکے ز غالب رنجور خستہ تن یاد آ

خواجہ عالی مرحوم فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے غالب کو جوانی میں دیکھا تھا۔ ان سے سنا گیا ہے کہ عصفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے، قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے، لیکن آخری عمر میں خوراک کی قلت اور امراض کے ہجوم کی وجہ سے بہت نحیف و کمزور ہو گئے تھے۔ تاہم چونکہ ہار بہت چمکا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے۔ اس لئے اس حالت میں بھی نووارد تو رانی معلوم ہوتے تھے۔

تالیف غالب نے ایک خط میں اپنی تصویر الفاظ میں کھینچی ہے جس سے ان کی جوانی اور بڑھاپے دونوں زمانوں کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ میرزا حاتم علی بیگ کو لکھتے ہیں :-

تمہارے کشیدہ قامت ہونے پرچہ کو رشک نہ آیا۔ کس و سنے کہ میر تقی میری میں نگشت تھا ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ سب میں جتنا اٹھا یعنی عالم جوانی میں تو میرا رنگ چنپٹی تھا اور دیدہ و دلورگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جب کہ وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے۔ تو بھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا۔ اور میں نے خون جگر کھایا تو اس کلمہ پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں :-

تا دسترم بود ز دم چاک گریبان

شرمتی از خم تیر پشیمند تا دم

جب ڈاڑھی مونچہ میں ہاں سفید آ گئے، تیسرے دن صوبائی کے انٹے گاؤں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مٹی بھی پھینڈ دی۔ اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بونڈے شہر میں ایک وردی ہے وہ ملاقات۔ بسا اسی نیچا بند۔ دھولی، ستھا، بھٹیاریہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر ڈاڑھی، سر پہ بال، نقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اس دن سر منڈا ہوا۔

یہ مکتوب ۱۸۵۹ء کے اوائل ۹ ہے، کیوں کہ اس کے آخر میں جاریج فریڈرک ایڈنٹائن لفٹنٹ گورنر صاحب سبکدشت منعمہ کو دوستیوں، نذر، بھیجنے کا ذکر ہے۔ جس کی طباعت نومبر ۱۸۵۸ء میں مکمل ہوئی تھی اور ایڈنٹائن صاحب جنوری ۱۸۵۹ء میں لفٹنٹ گورنر بنے۔ اس سے ظاہر ہے کہ:

(۱) غالب کشیدہ قامت تھے۔

(۲) ان کا رنگ چنپٹی تھا۔

(۳) جوانی میں ڈاڑھی منڈاتے تھے۔

(۴) جب سراورڈاڑھی میں سفید بال آ گئے تو سر منڈانا شروع کر دیا اور ڈاڑھی پھوڑ دی۔

(۵) جوانی میں مستی استعمال کرتے تھے۔

(۶) بائیسھ زبیر بس کی عمر تک ان کے آگے کے دودانت ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مستی چھوڑ دی تھی۔

میر صفیر بگرامی ۱۸۶۵ء میں غالب سے ملے تھے۔ لباس اور حلیمہ کے متعلق ان

کا بیان یہ ہے :-

”پاجامہ سیاہ بونے دار درائیں کا کی دار نیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ و سفید، منہ پر وارھی دوانگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے۔ قد لمبا، لائقی صورت، پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں۔ اور کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔“

ابن ابی صحت بہت بھی تھی | غالب کی صحت شروع میں بہت اچھی ہو گئی، اس ٹے کے ابتدائی تجربہ میں خرابی صحت کے شکوکوں سے عام طور پر پاک ہیں۔ کہیں کہیں ان عوارض کا ذکر آتا ہے جو طبی اثرات کے ماتحت قریباً ہر شخص کو وقتاً فوقتاً لاحق ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام کے ایک خط سے جو سفر گلگتہ کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں باندہ کے قیام میں بخار آ گیا تھا۔ فرماتے ہیں :-

”اللہ اکبر! زحمت صدر (دوسرا) دمی (بخار) ہم از باندہ اثرے در طبع نہ گذاشتہ۔ ضعف اگر باقی است ترو دے نیست، چہ اس رفیقے است کہ از وطن کریم ہر ہی بستہ است۔“

تپ و رزہ | اردو خطوط میں سب سے پہلے بیماری کا ذکر نقشبی برگوپاں قفٹنہ کے نام کے ایک خط میں آیا ہے۔ جو مارچ ۱۸۵۴ء کا مرقومہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۲۴ فروری ۱۸۵۴ء کو بعارضہ تپ و رزہ بیمار ہوئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

میں چار دن سے رزہ میں مبتلا ہوں اور رزہ یہ ہے کہ جس دن سے رزہ چڑھا ہے رکھنا

مطلق نہیں کھایا۔ آج پیر شنبہ پانچواں دن ہے۔ کہ نہ دن کو کھانا میسر ہے نہ رات کو شراب
حرارت مزاج میں بہت ہے۔ تا چارہ متراز کرتا ہوں۔ بھائی اس طرفہ کو دیکھو کہ پانچواں دن
ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی، اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں۔
بعض خصلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حفظ صحت کی غرض سے سہل لے لیا کرتے تھے۔
لفظہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں،

پیر سہل میں ہوں۔ نہ بھوک نہ سہل ہوں۔ حفظ صحت کے واسطے سہل لیا ہے۔

توینچ **۱۵** مئی **۱۸۵۸** میں توینچ کا صحت حملہ ہوا۔ لفظہ کو لکھتے ہیں،

بھائی وہ خط پہ لازم کو بھیج چکا تھا کہ میرا ہو گیا بیمار کیا ہوا توینچ زلیست کی۔ یہی توینچ اور پھر کیا

شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا گیا۔ آخر عصارہ، ریوند اور رائی کا نیل پیا۔ اس وقت

توینچ گیا۔ مگر قصہ قطع نہ ہوا مختصر کرتا ہوں، میری غذا قائم بناتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس

دن میں دوبارہ آدمی، صحت غذا کھائی گویا دس دن میں ایک بار غذا نساں فوٹی بکلا ب اور اٹی بھنا

دراؤ بھارا کا افشردہ، اس پر مدار ہا۔ کل سے خوشدگ کیا ہے اور صورت زلیست کی نہ آتی ہے۔ آج صبح کو

دس **۱۵** مئی **۱۸۵۸** بعد دو اپنے کے نم کو خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا **۱۵** دسمبر **۱۸۵۸** میں قلم بناتے وقت چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔

فرماتے ہیں :-

قلم بنانے میں میرا ہاتھ زخمی ہوا ہے۔ پس سے زخمی ہو گیا، اور ورم کر آیا۔ چاروں روٹی بھی مشکل سے

کھاٹی ہے۔ یہ ہر حال اب اچھا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب کی صحت شراب سے تباہ کی۔ ان کا جسم قوی تھا۔ جوانی کے عالم میں

شراب کے بُرے اثرات نہا ہر نہ ہوئے۔ لیکن جب زندگی کا آفتاب زوال کی طرف

مائل ہوا۔ اور بڑھاپا آنے لگا۔ تو جسمانی طاقت گھٹتی گئی اور بیماریاں بڑھتی گئیں۔

مختلف آلام مستقل ہوتے گئے۔ زندگی کے آخری نو دس سال کا کوئی حصہ ایسا نہیں۔

جس میں ان کو اپنی صحت کے متعلق یک لمحہ کے لئے بھی اطمینان نہ لگتا تھا اور مالی پریشانیوں کے اسی ہجوم کے باعث وہ آخری عمر میں موت کی بہت آندھ لگاتے تھے۔
۱۸۶۱ء سے ان کے خصوصاً میں ضعف، نقابہ، قلت غذا اور ہجوم امراض کا ذکر ایک عام چیز بن گیا تھا۔ میاں سیف الحق سیاح کو ۳۱ دسمبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

نا توانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے کہا کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرا تھانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پڑا تھا ہے۔ بڑا سفر دور دور زور پیش ہے۔ زاوراہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر تا پر سیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سفر مقرب ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دو برج جاو بد ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
 مرے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

۱۸۶۱ء ستمبر ۱۸۶۱ء کے ایک مکتوب میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:
 روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں سے ملے مرا ہیں، کہ وہ بہت قریب ہے۔ جاتا ہوں تو ہنستا ہوں
 گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے۔ اور سی عاں دیوان خانہ میں آکر ہوتا ہے۔ والی دام پور نے
 مرشد زادہ کی نادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔
نومبر ۱۸۶۱ء کے خط موسومہ سیاح میں مرقوم ہے:-

۱۔ یہ شعر ذوق کا ہے۔

۲۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم کے منہج صاحبزادہ سید جید علی خان بہادر کی شادی کا ذکر بت جو ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔ غالب کو بھی اس مبارک تقریب پر بلایا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ سب نہ صرف جانہ سکے۔ اور تہنیت کے طور پر دو قیصے بھیج دیئے۔ جو ان کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہیں (ملاحظہ ہو کلیات صفحہ ۳۱-۳۲)

ان دنوں صحت دماغ اور دوران سر میں اتنا مبتلا ہوں کہ وہی رام پور کا بہت سا کام بھی
یوں ہی دھوا ہوا ہے۔ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔

۱۸۶۲ء میں ہاتھ پر پھوڑا نکل آیا جس نے نہایت تکلیف دہ صورت
اختیار کر لی۔ اس کے علاج میں ہندوستانی برائوں سے مایوس ہو کر غائبانہ انگریزی
ڈاکٹر کی طرف توجہ کی۔ میر مر فراز حسین کو لکھتے ہیں :-

جب کہ مہینے میں میدھے ہاتھ پر پھنسی ہوں گا پھر پھوڑا نکلے گا جو بگڑ کر
فار ہو گیا، اب یہ قدر ایک کھنکھستہ دستہ نہ نشت مردار ہوئی۔

۱۸۶۳ء ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں فشی تبا و نراٹن آرم کو لکھتے ہیں :-

جسٹا مینڈے کہ میدھے ہاتھ میں ایک پھنسی سے دوڑے کی صورت پیدا کی، پھوڑا پک کر پھٹا
اور پھوڑا کو ایک زخم، زخم کا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا بگڑتا رہا
دو مہینے سے گئے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ اُسٹرو سے گوشت کٹ رہا
ہے۔ بیس دن سے افاق کی صورت نہ آ رہی ہے۔

اس کے بعد فیشن کے کھانے، جمع شدہ روپیہ کے ملنے اور دربار و ملت کے کہاں
ہونے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخر فروری ۱۸۶۳ء میں اسٹنٹ گورنر
پنجاب دہلی آئے۔ چہرہ اسی بھیج کر بلایا :

میرا یہ حال ہے کہ علاوہ اس دائیں ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک
ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب نہ آتا اور :- ٹھنڈا بیٹھنا دشوار ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان پھوڑوں کے زخم پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ غائب کا سارا
جسم پھوڑوں سے بھر گیا۔ بالخصوص تانور کے پھوڑے کافی دیر تک ان کے لئے
ویال جان بنے رہے۔

۱۷ اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں فشی تبا و نراٹن آرم کو لکھتے ہیں :-

ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرور چراغاں ہو گیا۔ ملاقات نے حساب دے دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھانے وقت پلنگ پر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھانا ہاتھ دھو کر نہ پاتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے پاس رہتی ہے۔ انزک پریشاب کہ جاتا ہے۔ بیت اسخدا جاتا ایک مصیبت ہے۔ بلشتیج کی بھی مگر کشی قدم جانا، پھر آنا کیا آساں ہے۔ ایک کہ ستر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات جاتا ہوں۔ بہت جیا۔ کہاں تک جیوں؟

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں:

شہور و اورام مرض فنام اور رنج عام، یہ ایک عجاں۔ دوسرا اجماع سمو کہ مبینہ مہر سے صاحب فراش ہوں۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، محلہ سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان ہے جہان کوں۔ صبح، تو بچے کھانا نہیں جاتا ہے۔ پلنگ سے کھسک پڑا ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتا۔ پھر ہاتھ دھوٹے۔ حق کی پلنگ پر جا پڑتا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا۔ اور پڑ رہا۔ مدتوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد آتا ہے، اس صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم، دم تقاضا سے بول کر دیکھو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو تسلسل بول کا عارضہ تھا جو قریب بیٹیس پرداں ہے۔ پھوڑوں کا مدت تک اچھا نہ ہونا بھی اسی خیال کا موڈ ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک دفعہ جاتا ہوں مگر صعوبت کے تصور کرو۔ ایک پھوڑا دائیں پیچھے میں جس کو ساعد کہتے ہیں۔ دو پھوڑے بائیں پیچھے ہیں۔ یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کف پاپشت پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک درم اور درم بھی سخت۔ روادعات و محلات دما د کو ہٹانے اور تنجیل کرنے والی دوا میں سے کچھ نہ ہوا۔ اب تجویز ہے کہ نیم کا بھرتا

باندھئے۔ جب پکے، پھوٹے، تب مرہم لگائیے۔ کبرکف پا میں جراحیست کا عمل ہوا تو
قیام کا کہاں ٹھکانا۔

پھر لکھتے ہیں،

برسوں سے فساد خون کے عوارض میں مبتلا ہوں۔ بخورہ اور صم سے درد پامیوں۔ برسوں میں
"بلع" بنے بہتے روح تحلیل ہو گئی نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی در پھوڑے تو تیرے
دروں پنڈلیوں میں بائیل کے قریب ڈھوڑے ہیں "خار ہوا" اور پنڈلیوں کی پتیاں حوائج میں دروں
پھٹنے لگیں۔ بائیں بانو پر کف پاسے سماں وہ بھوڑا ہے۔ پنڈلی پر درم ہے۔ رات دن پرار نہا ہوں۔ پینڈ
پاس حاجتی لگی رہتی ہے کھسک بڑا بعد درم حاجت پھر لیت رہا۔ اسی صورت سے روزی لکھتا ہوں۔ سدا
کی اصلاح یک قلم سو قوف خطوط ضروری بنے لکھتا ہوں۔ در خط جو، بھری صاحب کے آئے اور ملک خط
شاہ عالم کا اور دو خط مضرب صاحب کے آئے (یعنی صاحب عالم مارہروی) جواب دے لکھے سکا۔ آج
اپنے کو طعنے دے کر مرد بنایا جب یہ عبارت لکھی۔

ایک خط میں فارسی شاعری کی مختلف طرزوں پر بحث کرتے ہوئے اردو کے
چند اچھے شعر نمونہ لکھے ہیں جن میں ایک شعر میر تقی کا ہے "دوسرا سودا کا، تیسرا
حاتم کا اور چوتھا مومن کا پھر لکھتے ہیں :-

ناتخ کے ہاں کستر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ نیز نشتر موجود ہیں مگر ان کا کوئی شعراں
وقت یاد نہیں آتا۔ یاد کیا آئے۔ لیٹا ہوا ہوں۔ دم بہ دم بانو کے درم کی ٹیس ہوش
اڑائے دیتی ہے۔

قاضی عبدالجلیل صاحب بریلوی کے نام کے ایک خط میں بھی ان آلام کا ذکر ہے

غالب نے اپنی موت کے متعلق پیشگوئی کی تھی اور تاریخ وفات بھی نکال لی تھی،
سو اتفاق سے اسی سال دہائی میں بیضہ کی وبا پھیلی۔ انہوں نے اپنی پیشگوئی کی تخلیط
پر ایک دوست کو ازراہ تفنن لکھا کہ وبائے عام میں مرنا میرے لئے باعث ہشک
تھا۔ قاضی عبدالجلیل کو لکھتے ہیں ۔

۱۲۷۷ھ میں میرزا مرزا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حذرا ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۱ھ میں لکھا گیا تھا، ہر روز مرگب نوکامزا
پکھنار ہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔
روح اب میرے جسم میں، جس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں کوئی شغل، کوئی
اختلاط، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔
جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

حرم آں روز کنیز منزل ویراں گزرم
فتق کا آغاز | نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں کہ بائیں پاؤں میں ورم کفر پائے
پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک چلا گیا ہے۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے
لگتی ہیں۔ کھانا دیوان خانہ میں منگا لیتا ہوں۔ لیکن :

پیشاب کو کیوں کر نہ اٹھوں۔ عابستی رکھ لی۔ بغیر اوکڑو بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پانخانہ کو
اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ
لو کہ کیا گزرتی ہوگی۔ آغاز فتق مزید علیہ یا مستزاد ع۔

پیری و صد عیب جنبیں گفہ اند

اپنا یہ مصرعہ بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

پھوڑوں اور پھنسیوں سے شفا یاب ہوئے تو ضعف اور بھی بڑھ گیا۔ قاضی عبدالجلیل

کو لکھتے ہیں :-

اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا بھنسی کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ صبح کی پناہ
 زرِ ضعف کیوں کرنے ہو۔ برس دن سے صاحب فراش ہوں۔ بسترِ برس کی عمر ہے۔ جتنا خون
 بدن میں تھا بے مبالغہ ادھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن کھن جو اب پھر تندرست رہ رہ کر صبح ہو
 بہر حال زندہ ہوں اور ناتوان اور آپ کی پرستش سے دوستانہ کامنوں احسان

۱۸۶۵ء | مختلف خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۱۸۶۵ء تک فسادِ خونِ احتراق
 میں مبتلا تھے۔ مثلاً حکیم غلام نجف خاں صاحب کے نام کے ایک خط میں پتھروں
 اور ناطاقی کا ذکر ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ ضعیف تھا کہ پتھروں پہنچ گیا ہے
 جواب انور الدین و رہ بسا اور کو لکھتے ہیں :-

نہ تپ نہ کھانسی نہ اسہال۔ نہ فوج نہ نفوہ، اس سب سے بدتر یک صورت پر کدورت
 یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، سر پہ رسہ پر ایک رسہ
 ہر زخم پر ایک غار۔ ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھا۔ نے دروازہ بھر مریم درکار۔ نو ذرا جینے
 نہ۔ درو شاہ رہا ہوں اور شب دروازے تاب۔ راتیں یوں گزرتی ہیں کہ اگر کبھی ٹکڑے ٹک
 نکلی دو گھنٹی غفل رہا ہوں کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس نکلی جاگ اٹھا، ترڑا کیا
 پھر سو گیا۔ پھر بوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں نین سب سے اسی گزرے۔ پتھر خفیف موٹ
 لگی دو تین جینے لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح غالب میں آئی۔ اس نے
 میری سخت جانی کی قسم کھائی۔

اسی خط میں آگے چل کر اپنی حالت یوں بیان کرتے ہیں :-
 جو اس کھو بیٹھا۔ حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں۔

قد آدم دیوار اُٹھے۔

نواب نور الدولہ نے کسی سے سُنا تھا کہ غالب کا انتقال ہو گیا ہے اس واقعہ کا ذکر انہوں نے خط میں بھی کر دیا غالب فرماتے ہیں،

آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا میری خبر نہ لی میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلہ میری یہ تحریر آدمی سچ اور آدمی جھوٹ۔ در صورت مرگ

نیم مردہ اور در حالت حیات نیم زندہ۔

”کشا کش ضعف نگسلہ رواں از تن“

ایں کہ من نے میرم ہم رناتوا اینہاست

۱۸۷۱ء میں ان کی معذوری بہت بڑھ گئی تھی۔ ۲۲ جولائی کے ایک خط

میں لکھتے ہیں،

میں برس عوارض اشتراقِ خان میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جاں کی بھی خبر نہیں رہی

میں اپنی زبان سے ایوں نہ کہوں کہ ابھا ہوں، مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں بڑھا،

سرا پانچ، بد تو اس ناموں غالب زندہ آدمی ہیں۔

اکتوبر ۱۸۷۱ء میں نواب کلب علی خاں مرحوم کے جشنِ جلوس میں شریک ہونے

مرض میں رہم پور گئے اور آخر وسمہ میں واپس ہوئے۔ تو راستے میں ایک حادثہ پیش

آیا جس کی تفصیل چھٹے باب میں مذکور ہے۔ اسی حادثہ کے باعث بیمار ہو گئے

اور پانچ روز تک مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور کے مکان پر ٹھہرے رہے جب

حادثہ ہوا تو دہلی روانہ ہوئے۔

آخری دور کی خوراک خواجہ عالی نے لکھا ہے کہ مرنے سے کئی برس پہلے چیلہ اچھڑنا بالکل

۱۸۷۱ء مطابق ۱۲۹۰ھ میں۔ آپ کی وفات کی خبر مشہور ہوئی تھی۔ ذکا حیدر آبادی نے تاریخ وفات

بھی کہی تھی۔ خط ہوناش تماش سخی

موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ خواجہ مرحوم نے
 آخری دور کی غوراک کی کیفیت یوں بیان فرمائی ہے صبح کودہ شیر بادام پیتے تھے۔ دن کو گھر
 سے ہو کھانا آتا تھا۔ اس میں پاؤ سیر گوشت کا تور مرہ ہوتا تھا۔ ایک پیالہ میں بوٹیاں دوسرے
 میں لعاب یا شوربا ایک پیالی میں ایک ٹھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا ایک پیالی
 میں کبھی کبھی ایک انٹے کی زردی اور ایک پیالی میں دو تین پیسہ بھروسہ۔ اسی کھانے کے
 متعلق غالب نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر بہنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخواں یزید کا
 دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا شام کو وہ کسی قدر شامی کتاب
 یا نسخ کے کتاب کھاتے تھے یہ صفحہ منگرمی ذاتی مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،
 گیارہ بجے اس کے آب کا کھانا تکبہ ہی میں آیا۔ ایک انداز میں کھایا گیا۔ سب بیک چڑی
 کے سائے میں شوربا اور ایک میں کھرا ہوا کئی گرم کیا ہوا اور کچھ کھانے کی رکابی میں باد بھر
 گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبہ کی رکابی میں پھنکے روئے۔ راتے اور ایک ڈبہ تانبہ کی رانی۔
 ادنیٰ انہماکوں کے کنارے دروازہ پر نہیں ٹکڑے ٹکڑے کی درخالی رکابی میں رکھ دیتے۔
 ہر ایک کے سے تھوڑا کھی اور شوربا کے کران کھانے کو ملایا اور خوب ملا کر تلوے کی طرح
 بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طبقہ رکابی میں رکھ دیا۔ کچھ میں حضرت، نگرتی رہتے رہتے
 اور دستار میں بیٹھے۔ پہلے وہ دونوں سنہ و سنہ حال دیکھتے۔ اس کے بعد کھانا پکانا
 شوربا اور ادنیٰ پیالہ کھی کالی گئے۔ بعد اس کے چٹکوں کے دو چھینٹے لے کر شوربا ملا کر
 کھاتے، اس پر پھر نصیب کھی اور شوربا پانی لیا۔ کھاتے در در میں میرا کھانا ہی ہے۔ شب
 کو پاؤ بھرنا۔ ہم قسرتک میں تلو کر کھانا اور

خواجہ عزیز مامقوسی کا بیان | خواجہ عزیز مامقوسی مرحوم نے بھی آخری دور میں ادنیٰ کی نیابت کی تھی۔

فرماتے ہیں کہ پختہ مکان تھا۔ ایک بڑا پھانک تھا جس کی بغلیں میں ایک کمرہ تھا۔ اس میں چار پائی پر لیٹے ہوئے غالباً دیوان قاضی دیکھ رہے تھے۔ نجیف الجشہ گندمی رنگ بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ چار پائی کی پٹی کے سہارے سے کورٹ بدلی تو ہماری (خواجہ عزیز اور ان کے ساتھی) طرف دیکھا۔ یہ شکل چار پائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ کر فرمانے لگے کہ آنکھوں سے تو کسی قدر سو جھٹا بھی ہے لیکن کانوں سے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو۔

خواجہ مرحوم سے شعر سننے تو اپنے شعر سنائے اتنے میں کھانا آیا دھپلے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا پھلکے کا ہار یک پرت لیکر دو چار ٹوالے یہ شکل کھاتے اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوا کہ اس مقدار خوراک پر کیونکر سیر کرتے تھے۔

۱۸۶۲ء | عمر کی زیادتی کے ساتھ تکلیفیں تدریجاً بڑھتی گئیں۔ نواب میر غلام بابا خاں نے شرکت جشن کے لئے سورت آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے جواب میں ۴ نومبر ۱۸۶۲ء کو لکھتے ہیں،

ہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج کاڈوں سے بہرا،
ضعف بصارت، ضعف و ماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب ضعفوں پر
ضعف طالع کیونکہ قصد سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟
یعنی ریل کے سفر میں، گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے، ایک ہفتہ دو ہفتہ
کے بعد ناگاہ تو لنچ کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں
آنا میرا سورت تک کسی صورت خیر امکان میں نہیں۔

اس دعوت کے متعلق سیاح کو لکھتے ہیں،

بھئی میں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں؟ بوڑھا ہوں، تاج کیا دیکھوں؟ غذا چھ ملے آٹا
کھانا کیا کھاؤں، مہینی سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں، اگر وہاں آنا اور شریک محفل

ہوتا تو پی لیتا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو ۱۲ مئی کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

آگے ماثواں تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چہتا ہوں۔ رام پر کے
- فرکارہ درد ہے رخشہ وضعت بصر، جہاں چار سطر ہیں نکھیں، انگلیاں میڑھی ہوئیں
حرف جو آہنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا، اب زندگی برسوں کی نہیں
مہینوں اور دنوں کی ہے۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں،

تم میری بابت پوچھتے ہو، مگر میں کیا لکھوں؟ ہاتھ میں رخشہ، انگلیاں کہنے میں نہیں،
ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آ جاتا ہے۔ تو اس سے خطوط کا جواب لکھوا
دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فتنہ دلاتا ہے، مرنے کی روح
کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو پہلے مقدار غذا کی تو لوں پر ہنر
تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔

اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں،

بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی۔ غذا یکسٹم مفقود۔ آٹھ بہر ہیں ایک بلبل گوشت پی لیتا
ہوں، نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشک۔ آنکھوں کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی
میں فرق، رخشہ مستولی، حافظہ معدوم۔

۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں رقم فرماتے ہیں،

اس مہینے یعنی رحیب کی اٹھویں تاریخ سے بہتر واپس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات
بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گڑھ پانی، قریب شام کبھی کبھی
تین تلے ہوئے کباب، چھ گھنٹی رات گئے پانچ روپے بھر (ایک چھٹانک) شراب خانہ ساز
اور اسی قدر غرق شیر عذاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا، اگر دو نو ہاتھ ٹیک کر

چار پائیہ بن کر اٹھتے ہیں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معتمدان بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پٹنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بد خواب نہیں ہوتا بعد از وقت بول بے توقف نیند آجاتی ہے۔

ان خطوں میں سے ظاہر ہے کہ استراق خون کے مرض میں جو کم و بیش تین برس مسطوط رہا۔ غالب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ذیابیطس کا عارضہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا۔ کہ رات دن میں بیس بجیں بار پیشاب کی حاجت ہوتی تھی۔ کانوں سے ہرے ہو چکے تھے۔ بصارت بہت کم ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک آنکھ کی بینائی کلیتہً زائل ہو چکی تھی۔ غذا کی مقدار بحد گنت گنی تھی۔ قبض کی شکایت شدید تھی اور وقتاً فوقتاً قونچ کے سخت دورے ہوتے تھے۔ ہاتھوں پر ریشہ طاری تھا۔

۱۸۶۷ء اب ۱۸۶۷ء کی کیفیت سیئہ ۲۴ اپریل کے ایک خط میں میاں ادخال سیاح کو لکھتے ہیں،

میں اب محض نکمہ ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہونے یکس میں دھڑکے ہیں جس دن ذرا اتفاق پاؤں گا ان سب کو اغذہ کو دیکھوں گا۔ جون ۱۸۶۷ء نے ایک خط میں فرماتے ہیں۔

بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ یہ خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے بیٹے بیٹے لکھتا تھا، اب عشرہ ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کوہ صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے، دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر داناں میں لے آتے ہیں۔ ایک کو ٹھٹھی ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں۔ عمامہ دن اس گوشہ تار یک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بہستور

لے جا کر پٹنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

نقشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں :-

میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود۔ اور امراض ستوا، تہتر برس کی عمر،

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پھر لکھتے ہیں :-

سترا بہتر اور دوزخ بہتر ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ بس میں خوفِ خدا کا نظ

گو یا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند

معدوم ہو گیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے۔ کہ جو دوست آتے ہیں بھی پرسش مزاج

سے بڑھ کر جوابات جوتی ہے۔ وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور

شیرین بادام مقشرد دوپہر کو گوشت کا پانی، سرشام تلے موٹے چار کب سوتے

وقت پانچ روپے بھر شرب اور اسی تہر گلاب۔ خوف ہوں، پوچھ ہوں، غصہ ہوں

ناستق ہوں، رد سیاہ ہوں، یہ شعر میر تقی میر کے حسب حال ہے :

مشہور میں عاصم ہیں مگر ہوں بھی کہیں تم

القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

۱۸۷۸ء اپریل ۱۸۷۸ء کے ایک خط میں میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں :-

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگنی ترح کے بعد مجموعہ ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں۔

جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹیڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔

مرض الموت | اسی حالت میں ۱۸۷۸ء ختم ہوا اور ۱۸۷۹ء شروع ہو گیا۔ غالب اگرچہ

ہمد تن مجموعہ امراض میں چکے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ موت کا فوری سبب

کون سا مرض بنا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں مرنے سے چند روز پیشتر یہ کیفیت پیدا ہو گئی

تھی کہ بیہوش ہو جاتے، پھر پیر دو دوپہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہوتا، پھر بیہوش

ہو جاتے۔

وفات سے ایک روز پیشتر خواجہ حالی عیادت کو گئے تو کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا
تھا۔ اور نواب غلام الدین احمد خاں کو خط لکھوا رہے تھے۔ نواب صاحب نے
حالت پوچھی تھی، اس جواب میں لکھوایا :-

میرا حال مجھ سے کیا پوچھت ہو۔ ایک آدمی روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

اسی خط میں ایک شعر بھی لکھوایا تھا۔ جس کا صرف ایک مصرعہ خواجہ حالی کو یاد

رہا۔ ع۔

نہ کرد ہجر مدار بہ من مر تو سلامت

آخری عمر میں اپنا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے،

دم واپس بر سر راہ ہے

عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات اغرض ۱۵ فروری ۱۳۸۵ء مطابق ۳ رذی قعدہ ۱۳۸۵ھ کو دوشنبہ کے دن

ادب و شعر کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا جس کی عالم تابانی دہر و ماضیہ کیلئے

سرمایہ ناز اور قرون آئندہ کے لئے منار ہدایت تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تمام اکابر شہر جنازے میں شریک ہوئے۔ شیعہ حضرات اپنے طریق پر مراسم و دفن

ادا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ضیاء الدین احمد خاں نے تمام مراسم اہل سنت کے طریق پر ادا

۱۳۸۵ء تمام سوانح نگاروں نے اپنی بیانات ۲ رذی قعدہ لکھی ہے لیکن تقریباً ۳۰ روز ہوتا ہے کہ ۲ رذی قعدہ ۱۳۸۵ء ۱۵ فروری

سے شروع ہوا۔ اس لئے اگر ۲ رذی قعدہ کو مسلم مانا جائے۔ تو عیسوی تاریخ ۱۴ فروری ماننی چاہیے، اور اگر ۱۵ فروری کو مسلم

مانا جائے تو قمری تاریخ ۲ رذی قعدہ سمجھنی چاہیے۔ اس سبب سے غالب کی عمر بحساب سنین قمری بہتر و درست دین جیسے

۲۳ دن اور بحساب عیسوی اکہتر برس ایک مہینہ اور اسی دن ہوتی ہے۔

کئے۔ وہی دروازہ کے باہر نماز جنازہ پڑھتی تھی اور حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب نواب الہی بخش خاں معروف کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ حاتی، مجروح اور دوسرے شاگردوں نے پروردگار شہید لکھے۔

زارِ غالب جس احاطہ میں مدفون ہیں اس میں چھوٹی بڑی تیس قبریں ہیں۔ احاطہ کے ارد گرد قریباً پانچ فٹ اونچی دیوار ہے۔ تمام قبروں کے متعلق ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جاسکتا۔ کہ کس کس کی ہیں لیکن اتنا یقینی طور پر معلوم ہے کہ غالب کے علاوہ اس احاطہ میں نواب الہی بخش خاں معروف، میرزا علی بخش خاں رنجور، زین العابدین خاں عمارت میرزا باقر علی ناس کاہل اور سلیم غالب بھی دفن ہیں۔ بقیہ قبریں بھی کسی خاندان کے افراد کی ہونگی۔ غالب کی قبر پر چوڑے کا پلستر ہے سرانے سنگ مرمری ایک لسن نصب ہے جس پر :

رَشکِ عرفی و فخرِ طالبِ مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

کے علاوہ میر بہمدی مجروح کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے :-

گل میں غم و اندہ ہیں باخاطرِ محروں تھا تربتِ امتداد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تابینے کے مجروح بالف نے کہا گنجِ معانی ہے نہ نہ ناک

رستی مزار کی مشتبہاں رئیس الاصرار مرزا محمد علی مرحوم حیدر اپنے مشہور اخبار "کامربہ" کو کلکتہ سے دہلی لائے تھے۔ تو مرزا غالب کے بچے چندے کی تحریک فرمائی تھی۔ لیکن مولانا مرحوم اپنی وسیع مصروفیتوں اور ابتلاؤں کے باعث سنگ مرمر کی ایک لوح نصب کرانے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ پھر خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے ارباب علم و ادب نے "غالب سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ جو مزار و احاطہ کو رستی کے علاوہ غالب کے نام پر ہال بھی بنوانا چاہتی ہے۔ احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا۔ جیسے حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک بہمدی دو خانہ دہلی (غائبانہ) سوسائٹی نے اپنی گھر

مختد یہ رقم دے کر خریدا۔ اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔

ایک اور قطعہ زمین بیگم حکیم محمد واصل خاں مرحوم (برادر کلدان سیج الملک حکیم
اجمل خاں مرحوم) نے حکیم محمد احمد خاں مرحوم کی سفارش پر عطا فرمایا ہے۔ نواب
ذوالفقار جنگ جید رآبادی بھی مزار کی مرمت کے آرزو مند ہیں۔ نواب صاحب ممدوح
غالب کے بھانجروں کی اولاد میں سے ہیں۔

نیرھوال باب

اخلاق و عادات

نہ بخشندہ شہ ہے کہ بارم دھد بہ ہر بار زہ پیل بارم دھد
 کہ تا پیل ترا بنجا بر انگیزے زرش بر گدایاں فرویزے
 غالب کے اخلاق کا باب بہت وسیع ہے۔ لیکن ان کی نظم و نثر کے سمندر سے
 ان اموال موتیوں کو اکٹھا کرنا بے حد مشکل ہے۔ اگر راستے کی دشواری سے بے پروا ہو کر
 اس منزل کوٹے کرنے کا قصد بھی کیا جائے۔ تو ظاہر ہے کہ ایک بڑا دفتر تیار ہو جائے گا۔ جس
 میں غالب کی نظم و نثر کے اکثر حصے مختلف ترتیبات سے شامل کرنے پڑیں گے بلکہ بعض حصے
 مختلف عبارتوں کے ماتحت کئی کئی مرتبہ نقل ہوں گے۔ لہذا میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ
 اس لذیذ کابینہ کے چند عنوانات اختصار کے ساتھ پیش کر دوں تاکہ شخص غالب کا ایک
 عام ناکہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔

سادہ دل درست گفتار | فارسی کے ایک خط میں سراج الدین احمدیوں کو ایک مرتبہ لکھا تھا:
 لہذا محمد کسادہ دل درست گفتار آفریدہ اند، ہرچہ در دل و اشتہار زبان باز گفتیم۔

ان چند لفظوں میں ان کے اخلاق کی پوری تصویر آگئی ہے۔

ایشاد و کرم | اردو مکاتیب میں ایک جگہ فرماتے ہیں یہ

قندری و آزادگی و ایشاد و کرم کے جو دواعی میرے حافی نے مجھ میں بھر دیئے، بقدر ہزار ایک تھو میں
 نہ آئے۔ نہ وہ طاقت سبحانی کی لامٹی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک ٹوٹا ہوا سونکا

رسی کے ٹکڑوں در پیادہ پائیداروں کیسی شیراز بنانے کی کبھی معریں جا ٹھہرا کبھی نہجف جاپیشہ پیا۔ نہ یہ
دستہ ہر ایک عاقل کہ میزبان بن جائے۔ اگر عام عام میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں،
اس شہر میں تو مجھ کو ننگ نظر نہ آئے۔

یہ سخن طراندہ اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور غالب کی داستان جیہات کا
ہر ورق اس پر گواہ ہے۔

تقدیمی ابرگر ہاں ہیں یہ سلسلہ سنا جات خدا سے معنی طیب ہو کر کہتے ہیں کہ میرے کردار افعال
کا حساب نہ لے۔ اگر مہربان بن کر یزید تو پھر مجھے بھی اجازت دے تاکہ جو جو حسرتیں دل میں باقی ہیں
انہیں تفصیل سے بیان کر دوں۔ تیرے محکمہ عدل و انصاف کی طرف سے جو جرم میرے ذمے
ثابت ہو۔ اس کے مقابلے میں حسرتوں کی ایک صفت کھڑی کر دوں۔ اس طرح آشکارا
ہو جائے گا کہ جرموں کے مقابلے میں میری حسرتیں زیادہ ہیں۔

ہماتا تو دانی کو کاف نہ نیم	پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتہ کسے را بہ اہر بینی	نہ بردم ز کس مایہ در ہزنی
مگر مے کہ آتش بگرم از دست	بہ ہنگامہ پر واز مورم از دست
من اند و بگین و مے اندہ رہاے	چمے کریم اے بندہ پر دہاے
حسابی در آتش زنگ و بو	ز جیشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند	دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ	یہ دیو زہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستان مراے، نہ میخائے	نہ داستان مراے، نہ جانائے
نہ رقص پری بیکراں بر لباط	نہ غوغائے رانندگان بر لباط

یعنی میں کافر نہیں ہوں، کسی کا خون نہیں بہایا، کسی پر ڈاکر نہیں ڈالا، البتہ شراب ضرور
پی۔ میں غموں کا مارا ہوا شراب کے سوا غموں سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لیکن اگر

شراب نوشی کا حساب لینا ہے تو جمشید بہرام اور پردیز جیسے تاجداروں سے لے۔ مجھ سے
کیا لیتا ہے جس نے کبھی کبھی بھیک مانگ کر منہ کاں کیا۔

بے نواؤں سے ہمدردی | پھر فرماتے ہیں کہ زندگی میں جو کچھ مجھ پر گزری اسے کیا بیان کروں۔ بیان
کرنے کا وقت ہی نہ رہا۔ بہاریں آئیں لیکن ہیں بے سرو سامانی کا تہی بنا رہا۔ افق پر نشاہ افزا
بادں پچائے، ایک ہنیر جامہ سفالیں شراب سے خالی رہا۔ اگر قبشش کا کوئی محو نصیب بھی ہو تو اس کی حیثیت
رقصِ عمل کی سی تھی۔ تیار درست ہوا تو گویا ہر لٹ کیا شراب پیتا ہوتا تو پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

بہ گیتی درم بے نوا داشتی دلم را اسیر ہوا داشتی

نہ بخشندہ شایہ کر بارم یہ ہزار نہ پسیل بارم دہد

کہ چوں پیل زانچا بزرگرم زرش برگدایاں فروریزمے

گویا اگر دولت اور سلامتی خواہش بھی تھی تو اپنی ذات کے لئے نہیں، اپنی آسائش کے لئے
نہیں بلکہ اس لئے تھی کہ بادشاہ بلائے، ہر رتبہ پہنچی پر لاؤ گزرو جو ہر عطا سے یہ ہنسی
کے لہجے اور زرد جو ہر فقیروں پر یہ سانسے چائیں۔

یکے حسن اسد خواجہ عانی اپنے مشاہدات کی بنا پر فرماتے ہیں :-

مراتب اگر اعلیٰ نہ رہے، سب سے زیادہ بڑا کچھ نہیں رہتا، ان سے ملے جاتا ہے کہ کشت و پشانی سے

ملنے لگے۔ جو شخص ایک فحش ہے، وہ کبھی نہ ہوا، شہادت سے ہٹا ہوا، دوستوں کو دیکھ کر

بے باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمیں ہوتے تھے، ان کے دوست ہر وقت اور ہر جگہ

نہ صرف وہی ہیں بلکہ تمام مشہورستان میں پیشمار تھے جو خطروں اور آفات سے دوستوں کو نیکے میں ان کے ایک ایک سے

مہر و محبت و بخور دی و لگا لگت چکی پڑتی ہے مرگب نہ ملے جواب لکھنا، اپنے لئے فرض عین سمجھتے تھے کہ وہ

سداقت دوستوں کے غلوں کے جواب لکھنے میں صرف ہونا جاری و زکیف کی حالت میں بھی نہ ہوا، کچھ

سے باز آتے تھے، وہ دوستوں کی فراشوں سے کبھی تھکن نہ ہوتے تھے، غلوں کی مدد سے وہ دیر و طویل و دراز

ان کے بعض خاص و خاص دوست کرتے تھے، اردو ان کی نہیں کرتے تھے، مروت و ریاکاران بیعت میں نہ ہوتے تھے

اگرچہ مرزا کی آمد فیصل فقیہ کے حرم صدفراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی تھے بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے کھلے اور پانچ مرد و عورت سروقت پڑے رہتے تھے۔ خد کے بعد ان کی آمد فی کچھ اور پڑھ سورت پیر ماہوں ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا پڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔

ساح نامہ کے حاصل ہونے سے ان واقعات سے اختلاف کیسے وہ فرماتے ہیں کہ، غالب کی سندھی اور قندھاری محض خیرات کی وجہ نہیں ہو سکتی وہ غالب نے خد میں بنے عانی میرزا یوسف کی کوئی مدد کی بکدان کے جنازے میں بھی شریک ہوئے۔ ۳۰ میرزا یوسف کی وفات کے بعد غالب نے اپنی بھتیجی یا بھادو کو کہ از کم تین برس تک کچھ نہ دیا۔

میرزا نے ایک یارے نظر ثانی کی محتاج ہے۔ بلاشبہ غالب کا خرچ بہت بڑھا ہوا تھا۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ ان کے متوسلین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ خد میں اور اس کے بعد کچھ مدت تک ان کی آمد کے تمام دروازے بند رہے۔ مگر فقیہ میرزا سے رشتہ جانتے تھے ان کے ذمے ہیں آدمیوں کا خرچ تھا۔ جس میں زیادہ تعداد ملازموں کی تھی۔ بعض زوریں چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن جب خد میں نہیں آئے تو کچھ نہ ملا تو عیال سمیت واپس چلے آئے۔ غالب اپنا معمولی سا مکان بھی بیچ کر اور قرض لے لیا سب کو کھلاتے رہے۔

میرزا یوسف غالب کے برابر نہیں پاتے تھے اور ابتدائی سے ایک مٹی کے سوا ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کی شادی تو اب ہی بخش نام عزت کے پوتے میرزا غلام قمر الہی خاں سے ہوئی تھی جو خد کے اختتام تک پادشاہ کی جاگیر کوٹہ قاسم کے ناظم تھے ان کی مالی حالت یقیناً اچھی ہوئی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف اور ان کی بیوی بیٹی کے ساتھ رہتے تھے۔ غالب کی آمد کے محتاج تھے خد کے دلوں میں میرزا یوسف کی بیوی بیٹی اور اس کے بچوں سمیت بے پورہ گئی اور صرف ایک بوڑھے نوکر اور بوڑھی ملازمہ میرزا کی نگہانی کے لئے چھوڑا۔ غالب کو ان واقعات کا بعد میں علم ہوا۔ لیکن شہر کی حالت اس وجہ مخدوش تھی کہ وہ بھائی کو اپنے پاس نہ لاسکے۔ یہ واقعہ "وخلبنو" میں مرقوم ہے۔

بھائی کے انتقال کی خبری روئی کو سارا انتہام غالب کیلئے بہت خورہ بکے اس نے شہر نیا نیافتج ہوا تھا اور غالب کیلئے جو دربار شاہی کے ممتاز افراد میں تھے، باہر بھٹنا سخت خطر کا موجب تھا۔ اگر وہ واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ غالب ذاتی سائین کو برادرانہ محبت پر ترجیح دیتے تھے تو میرزا یوسف کی بیوی اور بیٹی کے متعلق کیا سمجھنا چاہیے جو میرزا کو نوکروں کے حوالے کر کے شہر چھوڑ گئی تھیں۔ یقیناً محو بالارائے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

خاص طور پر توجہ طلب امر یہ ہے کہ میرزا یوسف کے جنازے میں شریک نہ ہو سکتے یا بھتیجی کی پرورش نہ کر سکنے کے واقعات خود غالب کے بیان کردہ ہیں اور اس بات کے شاہد عادل ہیں کہ بیان کرنے والے نے کسی بات پر پردہ نہیں ڈالا۔ وہ بھائی اور بھتیجی کے ساتھ محبت کا بہترین اندازہ دے سکتے تھے۔ یقیناً امداد کی محتاج نہ تھی غالب نے محض اپنے واجبات کے سلسلے میں یہ ذکر بھی کر دیا۔

فرخ حوصلگی | خواجہ حالی نے ان کی فراخ حوصلگی کے دو واقعے لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد انہیں لفٹنٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جو اہر کے ملا لفٹنٹی کے چپڑا سی اور جمہدار قاعدے کے مطابق انعام کیلئے آئے۔ غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ چنانچہ چپڑا سیوں کو ایک الگ مکان میں بٹھادیا گیا اور خلعت مع رقوم جو اہر بغرض فروخت بازار بھیج دیا گیا۔ بازار سے قیمت آئی تو چپڑا سیوں کو انعام دیکر خست کیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ایک امیر دوست جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہو گئی تھی چھینٹ کا فرغل پہنے ملنے کیلئے آئے۔ غالب نے انہیں بھی مالیدہ یا جامہ دار کے چغوں کے سوا نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل دیکھ کر دل بھرا آیا۔ امداد کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن دوست کی خودداری کا احترام پیش نظر رکھتے ہوئے سلوک ایسے طریق پر کرنا چاہتے تھے کہ اسے بیچارگی کا احساس نہ ہو اور پیش کردہ ہدیہ کے قبول میں عار نہ آئے۔ غرض غالب نے چھینٹ کے فرغل کی بحد تعریف کی پوچھا کہ یہ کہاں سے لی ہے اور درخواست کی کہ مجھے بھی اسی کا فرغل بنوادیتے۔ دوست نے بے تکلف کہا کہ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی فرغل لے لیوئے۔ غالب نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ ابھی چھین لوں لیکن جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہنکر جائینگے؟ اس کے ساتھ ہی اپنا مالیدہ کا نیا چغہ انہیں پہنا دیا۔ ایک نازک دل اور نازک احساسات والے شاعر کی شان دوستداری کا تقاضا یہی تھا۔

غوث علی شاہ قلندر | حضرت غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتی کے ایک مرید فرماتے ہیں پانی پتی کا بیان کہ حضرت نے جب غالب کے انتقال کی خبر سنی تو انالشد پڑھ کر بڑے تاسف کا اظہار فرماتے رہے۔ پھر بعض اشعار پڑھے۔ آخر میں فرمایا کہ میرزا غالب :

نہایت خوب آدمی تھے۔ مجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بہ درجہ غایت اور خلیق اذ حد

سلہ حضرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ مفتی محمد الدین آزادہ کا واقعہ ہے خواجہ حالی کہتے تھے کہ میں نے نام لکھنا پسند نہ کیا کہ شاید ان کے عزیزوں پر گراں گزرے۔

تھے۔ رند مشرب، بے شر اور رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ
دیتے تھے بلکہ

احسان لینا گوارا نہ تھا | اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ تنگ دستی اور قرضداری میں گزرا اور ارباب
جاہ و ثروت کے ملایا لینے یا دوستوں اور نیاز مندوں کے ہدایا قبول کرنے میں تامل نہ
تھا۔ لیکن عام حالات میں کسی کا احسان لینا گوارا نہ تھا۔ ”دستنبو“ اگرچہ ان کے ایک
عزیز شاگرد منشی شیونرائن آرام نے چھاپی تھی لیکن جن پچاس جلدوں کی قیمت
اسے امید سنگھ اندور والے نے ادا کر کے ان کا بڑا حصہ غالب کو دلوادیا تھا۔ ان
کے علاوہ جتنی جلدوں کی ضرورت پیش آئی قیمت بھیج کر منگاتے رہے۔
وہ خود ارسطو جاہ مولوی رجب علی کو جنہوں نے ایک چادر تحفہ کے طور
پر بھیجی تھی۔ لکھتے ہیں:

”منت پذیر فتن از ترک و تاجیک ننگ است“

دوستوں کی خدمت | دوستوں کی ہر خدمت کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ہر گوپال تفتہ
نے نواب مصطفیٰ خاں شیفہ مرحوم اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تعریف میں
قصیدے لکھے تھے غالب نے تفتہ کو ان کا صلہ دلوایا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-
تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں۔ ان کو میں نے تمہارے فکر
اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے۔ تم کو
قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے یہ کون؟ یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب دوسرے ممدوح یعنی نواب
ضیاء الدین احمد خاں، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۲ء یا اوائل جنوری میں حاضر ہوں گے۔

ہندوستانی شعرا کا انگریزی تذکرہ | دوستوں کی مدد میں! انہوں نے کبھی تامل نہ کیا۔ بلکہ آرزو ہمیشہ

یہ رہی کہ جو لوگ ان سے وابستہ تھے زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ وہ ٹی کے مستقل ڈپٹی کلکٹر ایک مرتبہ رخصت لے کر پہاڑ پر گئے اور ان کی جگہ ریٹی گن صاحب رضی طور پر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ انہیں ہندوستانی شعرا کا ایک انگریزی تذکرہ لکھنے کا خیال تھا۔ غالبؔ نواب ضیاء الدین احمد خاں سے شعرا کے تذکروں کی سات کتابیں مستعار لیکر ریٹی گن صاحب کو بھجوائیں اور بعض زندہ شعرا کے حالات خود لکھ کر دے دیئے۔ ان میں ہر گوپال تفتہ بھی تھے۔ ریٹی گن صاحب نے غالبؔ کو خط لکھا تھا۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر غالبؔ خود ریٹی گن صاحب کے پاس جا کر سفارش کریں گے تو ان کے متعلق زیادہ اچھے الفاظ لکھ جائیں گے چنانچہ ایک خط میں غالبؔ پر یہ خیال ظاہر بھی کر دیا لیکن اس اثنا میں ریٹی گن صاحب رضی ڈپٹی کلکٹری کی مدت پوری ہو چکنے کے بعد عدالت خفیہ کے جج ہو گئے اور شہر سے باہر فاسلے پر رہنے لگے۔ غالبؔ تفتہ کو لکھتے ہیں کہ ریٹی گن صاحب کے منشی، منظر الحق صاحب آئیں گے ان سے :

مال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تہمتی فلان کا موجب ہوگا تو ضرور ریٹی گن صاحب پاس ہاؤنکا۔

سفارش کیلئے مستعد | سفارشوں کے باب میں بڑے مستعد تھے۔ نواب میر علی نقی خاں بڑے عالی خاندان آدمی تھے۔ نوکری کی جستجو میں نکلے تو غالبؔ نے یہ بدرالدین احمد کو سفارشی خط لکھا۔ فرماتے ہیں :-

آپ ان کی رعلی نقی خاں کی، تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں۔ اور ان کا حال سب ان پر ظاہر کریں۔ اور انہیں مالی سرکار سے ملا دیں اور بابو صاحب سے ہواں کو ملوایئے تو میرا یہ خط جو آپ کے نام ہے جناب بابو صاحب کو بڑھو۔ یہ کہنے کی خوب ہو کہ یہ سرکار میں نوکر ہو جائیں اور اگر نوکری کی صورت نہ بنے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل میں آوے۔

یہ جملۃ الملک ثواب اسد خاں کے اخلاف میں سے تھے جو ۱۶۷۶ء سے عالمگیر عظم کی وفات تک وزیر اعظم ہند رہے۔ مورخین انہیں ”خاتم الامراء“ کہتے ہیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگیاں عام ہو گئی تھیں۔ ان سے مختلف امرا ملوث ہو کر برباد ہوئے۔ ان میں جملۃ الملک کے بیٹے آصف الدولہ ذوالفقار خاں بھی تھے جو مغلوں کے آخری دور کے ایک مشہور سپہ سالار تھے۔ چنانچہ فرخ سیر کے حکم سے انہیں موت کی سزا دی گئی۔ جملۃ الملک نے غالباً ۱۷۱۶ء میں وفات پائی۔

غالب ان مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علی نقی خاں کی بہبود کی جتنی کوشش کرو گے، مجھ پر احسان ہوگا۔

تواضع اور انجام مقاصد خلق | صاحب عالم مارہروی نے غالباً لالہ گوہند پر شاد صاحب کو سفارشی خط دیکر بھیجا تھا اور غالب کو براہ راست بھی لکھا تھا اسکے جواب میں فرماتے ہیں:-
لالہ گوہند پر شاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں دنیا دار نہیں، فقیر خاکسار ہوں،

تواضع میری خو ہے، انجام مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔
انشاء اللہ العزیز وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے۔

خط کشیدہ الفاظ سے غالب کے کمال حسن اخلاق اور جذبہ خدمت خلق و زرخیز کی طرح آشکارا ہے۔ قیدیوں کی سفارش | ثواب النور الدولہ نے غالباً غدر کے دو قیدیوں کیلئے سفارشی خط طلب کیا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں کہ حکم بہ طیب خاطر بجالاتا ہوں، مگر یہ فرما دیجئے کہ کیا لاکھوں اور خط کس کو بھیجوں نیز سفارش کا مقصود کیا یہ ہے کہ قیدی ہندوستان میں رہیں اور انڈیمان نہ جائیں، یا یہ ہے کہ کاملاً رہا ہو جائیں جو آخر میں فرماتے ہیں،

بہر حال اس خط کے ساتھ ایک اور لغافہ آپ کے نام روانہ کرتا ہوں، میں صرف ایک خط موسومہ منشی صاحب دیکھنے پاس سفارش مطلوب تھی، یہ کھلا ہوا اس کو پڑھ کر میاں امیر الدین کے پاس بھیج دیجئے گا مگر گوند نگار یعنی بند کر کے، اگر یہ منظور نہ ہو تو میری طرف سے منشی صاحب کے نام کا خط لکھ کر میرے پاس

بھیجئے اور لکھو بھیجتے کہ اس مسودہ کو صاف کر کے کتب بھیجوں۔

دست داری | نواب حسین مرزا کی ہر چیز غدر میں تباہ ہو چکی تھی۔ ان کے بھائی ملازمہ مارے جا چکے تھے۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں،

اگر کون کہ میری جان بھی تمہارے کام آئے تو میں حاضر ہوں۔ کہنا تکلف محض ہے کون کسی کی جان مانگتا ہے، کون جان دیتا ہے۔ مگر جو فکر مجھ کو تمہاری ہے۔ اور جو میری دسترس ہے، اس کو میرا خدا اور میرا خداوند و حضرت علی کرم اللہ وجہہ جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ بھی جینی مال تمہارا قرض خواہ آیا کھدہ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ سچ بھوٹ کہہ کر اس کو اس راہ پر لایا ہوں کہ سو وہ دور میرے قریب ہے۔ بیویوں کی طرح تقریر اس کے سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے۔ اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کھیت میں کھیت میں پانی دیتو، نالہ رینڈ ہو بھائی کچھ تو نرم ہو لے منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں۔

میاں فیدائیمہ دست، یک بخت اور اثرات اور ہندو مذہمی ہیں۔ دلی گزٹ میں مرقم کے سپر اپ کا نام کرتے تھے جو لکھو پھاپہ خانہ ہاگرم میں ہے یہ بھی دریں کتب میں تمہارے پاس حاضر ہوں گے۔ ان پر ہر بات رکھنا۔ وہ شہر بنگالہ ہے۔ ان کو تمہاری خدمت میں شناسائی رہے گی تو پھر بھی بات ہے صحافی کا نام بھی بقدر ضرورت کر سکتے ہیں۔ شاید اگر دہلی گزٹ میں ان کا طور درست نہ ہو تو اس صورت میں بہ شرط گنجائش اپنے مطبع میں رکھ لیتا۔

امیر بینائی مرحوم | منشی شیونرائن نے ایک رسالہ ”مدیاریا الشعر“ کے نام سے نکالا تھا جس میں مختلف شعرا کی غزلیں چھپی تھیں۔ امیر بینائی مرحوم نے بھی اپنا کلام بغرض اشاعت بھیجا اس زمانے میں وہ چنداں مشہور نہ تھے۔ منشی شیونرائن نے ”مدیاریا الشعر“ میں ایک اعلان چھاپ دیا۔ کہ جب تک ان کا پورا نام و نشان معلوم نہ ہوگا کلام نہیں چھاپا جائیگا۔ غالب نے ”مدیاریا الشعر“ میں یہ اعلان دیکھا تو فوراً منشی صاحب کو لکھا۔

یہ میرے دوست ہیں۔ امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر بخش کر تے ہیں۔ لکھنؤ کے فی عزت
باشنہل میں ہیں۔ اور دہلی کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں
اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی عزتیں تمہارے پاس
بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے تمہارے
پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا امیر مرحوم نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔
اس کو معیار الشعراء میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چار ورقہ پورہ دین کے پاس بھیج دو اور
میرا نام لکھو کہ "در نام پند پرورد دوست حسنور میرزا محمد بیگ موجودی امیر احمد برسرہ"
اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ غالب کے رقعات میں دوستوں اور مشوسلوں کی
ادوار کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ یوسف علی خاں عزیز ایک شاعر تھے متعدد خطوط میں
ان کے مجاس مختلف دستوں کے پاس بیان کئے ہیں۔ خود بھی قلت مدخل کے باوجود عزیز
کی اصلاح فرماتے رہتے تھے۔ دوستوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں بڑے سرگرم تھے ان کے
پاس مہر میں بولنے اور نگاہیں کندہ کرنے کی فرمائشیں اکثر آتی تھیں متعدد خطوط میں ان
کی تکمیل کا ذکر آتا ہے۔ وہ بی سے جوتے اور ٹو بیاں بھی دوستوں کو بھیجتے رہتے تھے۔
انکسار اپنی ستائش سے بہت گھبراتے تھے۔ دوست اور شاگرد مدحیہ قصیدے
بھیجتے، تو جواب میں حد درجہ کا انکسار فرماتے۔ صاحب عالم مارہروی کی ایک
مدحیہ نظم کے جواب میں لکھتے ہیں :-

خدا کی بندہ نوازیوں میں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان بارگاہ سے بھلا کہلوا رہا ہے
ظاہر امیرے مقدر میں یہ سعادت تھی (یعنی صاحب عالم کا مدحیہ قصیدہ) کہ اس دہائے
عام میں جیتا بچا۔ اللہ اللہ اس کشتی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رستے کو پہنچایا! کبھی
عرش کو اپنا نشمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پایاں باغ تصور کرتا ہوں۔ اسطے خدا

کے اور اشعار نہ فرمائیے گا۔ ورنہ بندہ خدائی کا دعویٰ کرنے میں مجاہدانہ کرے گا۔

قاضی الجلیل بریلوی نے ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا، ان کو لکھتے ہیں :-
اگر مجھے قوت مطلقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت
کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔

ایک اور خط میں قاضی صاحب ہی کو رقم فرماتے ہیں :-
وہ رباعی جو آپ نے اس تنگ آفرینش کی مدح میں لکھی اس کا جواب بندگی ہے اور
کورنش اور آداب

تیسرے خط میں مرقوم ہے :-

مجھے کیوں شرمندہ کیا؟ میں اس ثناء و دعا کے قابل نہیں۔ مگر آپوں کا شیوہ ہے بڑوں
کو اچھا کہنا۔ اس مدح گستری کے عوض میں آداب بجالاتا ہوں۔

تفنت نے یگانہ روزگار استاد کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے
جواب میں فرماتے ہیں :-

حضرت اس قصیدہ کی جننی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں، بیسکن
افسوس کہ بے محل اور بے جا ہیں۔ اس مدح اور اس ممدوح کا عینہ وہ حال ہے
کہ ایک مزبلہ پر سیب کا یا بھی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تمہیں سلامت رکھے، دکان
بے رونق کے خریدار ہو۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

میرزا تفنت کیا کہنا ہے، نہ ظہیر کا پتہ ہے، نہ غالب کا مداح (تفنت) ستائشہ صد ہزار
آفرین اور ممدوح (غالب) سزاوار صد نغز ہیں۔

مروت | مروت اور لحاظ کا یہ عالم تھا کہ آخری عمر میں اگرچہ بہت کمزور ہو گئے تھے، اور
الام جسمانی نے بہت پریشان کر دیا تھا، لیکن ناشناس لوگ بھی کلام بھیج دیتے

تو اصلاح کے بغیر واپس نہ کرتے۔ اگر کسی عارضہ کی وجہ سے معذور ہو جاتے تو چھوٹوں
 بڑوں، شناساؤں اور ناشناساؤں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا۔ مثلاً ضعیف
 دماغ اور دوران سر کے امراض میں مبتلا ہوئے تو جہاں عام شاگردوں کے کلام میں اصلاح
 ملتوی کرنی پڑی ہو یاں نواب رام پور کے کلام کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا، حالانکہ وہ
 سرکار رام پور سے مستقل وظیفہ پاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے اپنی بے چارگی کی
 کیفیت ”اکمل الاخبار“ اور ”اشرف الاخبار“ میں چھپوا دی تھی اور خطوں کے جواب یا اصلاح
 اشعار سے محذرت چاہتی تھی۔ لیکن لوگ بہ دستور انہیں خط بھیجتے، نیز اصلاح کے
 لئے اشعار آجاتے اور وہ شرمندہ ہوتے۔

اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ منشی شیونرائٹ سے ”دستنبو“ کے جتنے نسخے ٹھیکہ سنگھ
 اندور ولے کے پچاس نسخوں سے زائد منگلے قیمت دے کر منگلے جب میان داخل
 سیاح نے کتابوں کے لئے روپے بھیجے تو بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں،
 صاحب تم نے یہ پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے ہیں؟ میں کتاب فروش نہ دلال
 یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی، تم نے بہت بُرا کیا۔

شہزادہ بشیر الدین میسوری نے تصانیف مانگی تھیں ساتھ ہی ان کی قیمت پوچھی تھی۔
 غالب کے پاس اس وقت فارسی دیوان اور ”دستنبو“ کے سوا کوئی چیز نہ تھی چنانچہ دونوں

سلسلہ اردو سے متعلقہ صفحہ ۱۷

سلسلہ یہ ٹیبو سلطان کے پوتے تھے۔ کلکتہ میں رہتے تھے اور ساتھ میں سو روپے مالانہ وظیفہ پاتے تھے سلطان
 تخلص تھا فارسی دیوان کلکتہ میں چھپ چکا ہے۔ مولوی عبدالرحیم گورکھپوری ان کے استاد تھے جنہیں انگریزی کی
 تحصیل اور نئے علوم کے اشتغال کی بنا پر لوگوں نے دہری شہور کر دیا تھا۔ حملات حیدری انہی مولوی عبدالرحیم کی
 تصنیف ہے۔ جان مارشمن کلارک کی ”ہٹری آف انڈیا“ کا انہوں نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ صرف پہلا حصہ شائع ہوا۔

کتابخانه عمومی

حرفِ بر سرِ شکرِ مہرِ راز و سببِ نیکویشِ نوزِ سببِ بے نوازیں است

پے سرابہ اہم نہ فرومایہ، مکتورم نہ سودگر، مواسرہ چو نہ کاسب، فردش اچہر بیدارہ، مہریم میرہ ۳

بہار ہرچہ آزادگان بہ شہزادہ

سید بن ابی طالب و حضرت علی مرتضی علیه السلام

خود، هم فرستاد و از مغایر خواهد بود.

آداب مستند: یعنی کہ امتثال احکام و بندگی پر پوری توجہ و تکیہ کرنا۔

لیتے۔ اور وہ اس کو دیتے۔ وہ خود کہتے ہیں:

[illegible]

تاریخ

یہ ہدیہ مجوز کے نام پر ہے۔ ہر طالب علم کو ایک ہدیہ ملے گا۔

مسند خواجہ شمس الدین عظیمی راجہ سید محمد رفیع احمد خاں، رئیس مدرسہ اسلامیہ، لاہور

66

حاصل شدہ رقم ان کے ہاتھ میں جو بہت کم ہے۔ ان کے ہاتھ میں جو بہت کم ہے۔

۲۰۰۰

کرتے تھے قاطع بریان، بیوں نے محض حاکم کی جانب سے ملنے والے حکام سے

برہان قویہ اور دسائیرے سے اس کے انجمن و سبب نہ گنہ

سرشت فہم اور مضامین سے کہ متعلقہ "بادگاہ غالب" کے حوالے سے ایک

واقعه سے متعلق حکم پر بعد ازاں جواب مرحوم کے نام سے حضرت کوٹاہ و داد اللہ مرشد و مولوی

کے ایک زمانہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک کہ

سی فتنہ عورت کے بعد یہ حصہ اس خواہش سے وضع ہوا کہ شہنشاہ کی قیادت میں

مطابق خود شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے بہتر بیان نہ فرما سکتے۔

شعر فہمی کے متعلق نواب مصطفیٰ خاں شیفٹہ نے ”گلشن بے خاں“ میں جو کچھ لکھا ہے

وہ سب سے بڑی دستاویز ہے۔ فرماتے ہیں :

مضامین شعریہ کا حقہ فہم و ذہنیہ کلیات و لطائف پہلے مے برد و این فیصلے است۔ کہ

مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ مے رسی۔ چہ خوش نکر اگر چہ

کیاب است۔ اما خوش فہم کیاب تر۔ خوشا حال کیاب از ہر دوشربے یافتہ و حنظلے ربودہ

بالجہد این جنیں نکتہ سخن لغز گفتار کمتر می شدہ

شعر فہمی اور داد کا طریق **غالب** کا عام طریقہ یہ تھا کہ حیب تک واقعی اچھا شعر نہ ہوتا، تعریف

نہ کرتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اس بنا پر بعض معاصرین ان سے

آزاد رہتے تھے اور ضد میں آکر ان کی شاعری پر طعن و طعنہ کی نکتہ چینیوں کرتے تھے۔ ویسے

غالب طبعاً صلح جو تھے۔ اور ہر شخص کی دلداری کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔

”ہند کرہ غوثیہ“ میں ایک واقعہ حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کی زبان مرثوم ہے کہ ایک روز

مرزا حجب علی بیگ سرور مصنف ”فسانہ عجائب غالب“ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھیا کہ

”اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ جواب ملا کہ ”چہار درویش“ کی۔ سرور نے ”فسانہ عجائب“

کا نام لیا۔ غالب کو معلوم نہ تھا کہ خود مصنف ”فسانہ عجائب“ استفسار کر رہا ہے۔ بے تکلف

جواب دیا: ”اجی لاجول ولاقوہ۔ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی درہیٹیا رغا“

جمع ہے۔“

جب سرور چلے گئے اور غالب کو معلوم ہوا کہ یہ ”فسانہ عجائب“ کے مصنف تھے تو بہت

افسوس کیا اور کہا: ”ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا“ دوسرے دن غوث علی شاہ صاحب ملے

انہیں سارا قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت! یہ امر مجھ سے بے خبری میں سرور ہو گیا۔ آئیے آج

سرور کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کرائیں۔ چنانچہ وہاں گئے۔ مزاج پر سی کے بعد

غالب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور بولے جناب مولوی صاحب رات میں سنے
 "فسانہ عجائب" کو بہ غور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت
 ہی فصیح و بلیغ ہے۔ غرض اس قسم کی باتوں سے سرور کو مسرور کیا۔ دوسرے دن بان کی دعوت
 کی۔ اور غوث علی شاہ صاحب کو بھی بلایا۔

شاہ صاحب یہ واقعہ بیان فرمانے کے بعد کہتے ہیں :

"مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دن آزاری بڑا گناہ ہے۔"

لیکن اشعار کی داد میں راہ حق سے بال برابر بھی انحراف گوارا نہ تھا۔

سلامت علیٰ نہایت سلیم طبع تھے۔ خواجہ عالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ سلامت طبع ہی کا اقتضا
 تھا کہ ابتداءً عشق سخن میں جو ناموار اور شیر طرھا ہی نہیں بلکہ غلط راستہ اختیار کیا تھا۔
 اسے کسی راہبر یا استاد کی دستگیری کے بغیر خود بخود ترک کر کے صحیح راستے پر آگئے۔ سلامت
 طبع کا اندازہ مسئلہ قناع و امکان نظیر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو سکتا ہے۔
 جس کی تفصیل مولانا ابوالکلام کی زبان سے مولانا فضل حق خیر آبادی کے حالات میں
 پیش کی جا چکی ہے۔

شاہ اسماعیل شہید نے تقویت الایمان میں ایک جگہ لکھ دیا تھا کہ خدا چاہے تو
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و روں میں ایک پل میں پیدا کر دے یہ سنکر مولانا
 فضل حق بگڑ گئے۔ اور قدرت و مشیت کے فرق کو نظر انداز کر کے دعویٰ کر دیا کہ آنحضرت
 صدم کا نظیر ممتنع بالذات ہے۔ اس پر بحث شروع ہو گئی اور مولانا فضل حق نے غالب
 سے بھی ایک مثنوی لکھوائی جو ان کے کلیات فارسی میں موجود ہے۔ اس میں مسئلہ
 نظیر خاتم النبیین کے علاوہ استمداد و توسل قبور وغیرہ کو بھی درست ثابت
 کیا گیا ہے۔

مولانا شاہ اسماعیل جون ۱۸۳۱ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور

اپریل ۱۹۲۱ء میں واپس آئے۔ پھر ۱۹۲۲ء میں حضرت سید احمد بریلوی کے ہمزہ جہاد کے لئے روانہ ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ محکمہ بالذبحہ ۱۹۲۱ء سے پہلے ہوئی یا اسے ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کا واقعہ سمجھنا چاہیے۔ یہی صورت میں غائب کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس برس کی اور آخری صورت میں ستائیس اٹھائیس برس کی ہوگی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے ذہن نے اقتدارِ نظیر کا مسئلہ قبول نہ کیا۔ اور ایک لشیقہ پیرایہ میں وہی بات کہ گئے جو شاہ، رعبہ شہیدہ کہتے تھے، نقادِ مطلق کی نسبت پر پابندی ان کے تصور میں نہیں آسکتی تھی۔ لہذا تعبیر کا یہ پہلو اختیار کر لیا کہ اس جہان میں تو خاتمہِ اندیشہ کا نفیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہاں خداوند مریح جہان پیدا کرے گا اور اس میں نئے خاتمہ بنا سکتا ہے۔

یہ جہان تابست بہت قدیس و نورانی
قدرت حق را نہ یک عالم میں است
خوابد از ہر ذرہ آرد عسلی
ہمسم بود ہر عالمی را خاتمے
ہر کج ہنگامہ عالم بود
رحمتہ للعالمین ہمسم بود
کثرت ابداع عالم خوب تر
یا یک عالم و خاتم خوب تر

مورنا فضل حق جانتے تھے کہ یہ ستموں ان کے خلاف ہے۔ لہذا عرار کیا کہ اس جیسے کو قتل ہی سے نکال دے۔ مگر کتنی ہی جہان پروردگار نے خاتم "ایک ہی رہے گا۔ غالب نے یہ حصہ تو نہ نکال دیا لیکن چند شہزاد کا اضافہ کر کے بحث کا رخ بدل دیا۔

غالب اپنی اندیشہ نہ رہے ہم سب
خوردہ ہم ہر خوشی سے گرم ہے
قلعہ ایچاد ہر عالم یکہ است
گرد و صد عالم بود خاتم یکہ است
یہ خاتمہ کہ از دست خدا کا کوشمہ تھا کہ اصل مقصد میں اسکا اضافہ کیا جہاں

نبردہ ام۔ گمان میں ہیں بود کو خوک ہم چو سگ و گریہ پائے دارد، اکنون از روی نوشتہ
شما در نظر جلوہ کرد کہ خوک ہم سم "دار و پنچہ نہ دارد۔ کاشش تا شہ شہا پیش از ان کہ کلیات
نقش انطباع پذیرد، ابیہ سن رسیدہ ہے۔

کون اس بے تکلفی کے ساتھ اپنی غلطی یا کسی خاص معاملے کے متعلق اپنی بخبری
کا اعتراف کرتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فارسی مکاتیب غالب نے خود جمع
کردہ کے چھپوائے۔ وہ چاہتے تو آسانی سے اس خط کو حذف کر سکتے تھے۔ لیکن
اسے بھنسنہ چھاپ دیا۔ اور کلیات کے دوسرے ایڈیشن میں محولہ بالا شعر کو
بدل کر یوں بنا دیا:-

خوک شدہ نفس ساز کرد

بامرد و عربہ آغاز کرد

اصلاح قبول کر لی | خواجہ حاتمی نے لکھا ہے کہ ایک قصیدہ کا پہلا مصرعہ یہ تھا:-

عبد اقصیٰ بہ سر آغاخانہ مستان آمد

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے کہنے پر "عبد اقصیٰ" کی جگہ "عبد قرباں" بنا دیا۔
ایک اور قصیدہ کا ایک شعر تھا:-

ہم چناں در تہن غیب نمودے دارند

بہ وجود سے کہ ندارند ز خارج اعیان

مولانا فضل حق خیر آبادی کے کہنے پر "نمودے" کی جگہ "نبوتے" بنا دیا۔

مخالفت سے عضد و گزر | جن اشخاص کی فارسی دانی میں غالب کو کلام تھا۔ ان کے خلاف

رقعات میں چابجا سخت الفاظ ملتے ہیں۔ مثلاً مرزا محمد حسن قزلباشی عبد الوہاب السوی، ملا

غیاث الدین رام پوری صاحب غیاث اللغات، عدل نور العین واقف بٹاوی یہ چیز ان کے عام اسلوب کے خلاف پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بحث اصلاً مسائل و اصول کے باب میں شروع ہوئی۔ مخالف گروہ چونکہ بار بار انہی اشخاص کے نام پر طور سند پیش کرتا تھا اس لئے غالب کو ان کی حقیقی حیثیت کی توضیح کرنی پڑی۔ اوشدہ شدہ تحریر میں تلخی کا رنگ آگیا۔ اور نہ وہ اپنے مخالفین کے بارے میں بالعموم عقود درگزر پر کار بند رہتے تھے۔ سید الحق سیاح کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی بڑودہ نے غالب کے خلاف برے الفاظ استعمال کئے تھے۔ سیاح نے اطلاع دی تو جواب میں فرماتے ہیں:

قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پران کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرنا اور اپنا گناہ معاف کروانا جب سبب طلال کا ظاہر نہیں تو یہ کیا کروں۔ تم بُرا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اُس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اُس نے بُرا کہا تو اُس کو خدا کے حوالے کر دو۔

غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا ہے

ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

جو لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے ان کی باز دید کا بڑا خیال رکھتے تھے اور یہ گوارا نہ تھا کہ کسی کا آنا ان کے ذمے رہ جائے۔

تاریخی مادوں سے نفرت | غالب نظم و نثر کے بادشاہ تھے۔ اصناف تحریر و نگارش میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں ان کے فکر و تخیل کی بہتر سے بہتر گلکاریاں موجود نہ ہوں۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعوں، نوحہ، نثر میں مکاتیب، علمی مباحث، قدرتی مناظر، تاریخ، تقریظ و تنقید سب کچھ موجود ہے۔ لیکن تاریخی

مادہ کو نشہ سے وہ سانس نہ لے سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ نہایت خستہ و سست تھے۔
ان نیش حقیر کا انتقال ہو گیا۔ گفتہ نے تاریخ دفات کے ساتھ ہمارے جواب
میں لکھتے ہیں :-

ہیں تاریخ کو ادنیٰ مرتبہ شاعری بشتاموں اور تہائی میں ہر پہلو عقیدہ نہیں ہے کہ
تاریخ دفات کے لیے دے جس محبت ہوتا ہے۔ ہر حال میں نے نشی ہی نیش مرحوم کی
تاریخ رستہ میں یہ قصہ لکھ کر بھیج دیا۔ نیشی فراموش صاحب نے پسند کیا۔ قصہ یہ ہے :

نشی نیشی کہ جس حسد و شہ نہ ان سخن و فہم تیر
ساز و سازش نہ بے بار و بار زار و زور و جلد ریز
خواستہ و غائب آئندہ ہر گفت و گو و طول و پور ستغیر

سنان کو لکھتے ہیں :-

بھائی تیرا۔ ماننی تیرا۔ اپنے بیان کے ساتھ تاریخ کوئی رستہ سے باز محفل میں
اور زبان میں کئی تاریخ سری نئی سرگئی نہایت دیر میں دوچار تھا۔ نہیں ہیں ان کا حال
یہ ہے کہ مادہ اور کا ہے۔ اشعار میرے ہیں۔ میرے ہیں کہ ان ہوں۔ اما میرا ہی
گزشتہ۔ پھر رشتہ کا نہیں آتا۔ یہاں کوئی اور بارش کا حساب درمت نہ پاؤں گا۔ ایک
روز میرے پاس نہ لکھ کر طاقت مرقعہ مادہ یا نسخہ و دستاویز نہ لکھ سکا۔

اس کے بعد ابھی چند تاریخیں پیش کی ہیں کہ دیکھو تعبیر یا تخریج کس درجہ فصیحہ و خیر

ہے۔

نواب علی الدین احمد صاحب کے صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے تاریخ
دفات کے ساتھ لکھا۔ صاحب نے ہی غرض پیش کیا کہ میرے مادہ پر
تاریخ بیشتر پیر ہوا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے کیا است
ہیں تاریخ کے متعدد قطع است۔

موجود ہیں اور بعض ایسے قطعات بھی ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہوئے۔
فرہانی اشعار دوستوں کی فرمائش پر بھی وہ شعر کہہ دیتے تھے۔ تفتہ کو
لکھتے ہیں:

ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ کٹھارہ
انیس برس کی عمر قوم کا کھتری نو بصورت و غمدار نو جوان سن ۱۲۷۲ھ میں بیمار پڑ کر
مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں، ایسی
کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو تاکہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رو دیا کرے۔ سو بھائی اس
سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک۔ معتمدیہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے
جو خوشی کاں شعر تم نکالو گے مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بہ طریق شنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔
مصرعہ آخر میں بارہ تار تار ڈال دو۔ نام اس کا برت موہن تھا اور اس کو بابو یاد کرتے تھے
چنانچہ میں ہزج سدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔

ہرم یوں نام بابو برت موہن

پکرہ خون دل ریش از لب من

سداوت سداوت نے استاد نے کئی تکمیل میں کچھ اور پرانی شعر کا مرثیہ لکھ
بھیجا۔ لیکن اس سے پیشتر غالب نے خود ہی بائیس شعر کہہ کر فرمائش پوری کر دی تھی۔ لہذا
تفتہ کے اشعار واپس کر دئے اور لکھا کہ یہ کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دینا۔ تفتہ کو شبہ
ہوا کہ شاید شعر سقیم تھے اور یہ شبہ ظاہر بھی کر دیا۔ جواب میں فرماتے ہیں،
وہ شعر سب دست و گریبان تھے۔ ایک کو ایک سے ربطاً ایک یادو شعر اس میں سے۔

سنہ ۱۲۸۰ھ میں دہلی میں تفتہ کے بیٹے ہمت سر سنگھ کا انتقال ہو گیا تھا جس پر دھالی تین سو شعر کا ایک مرثیہ
تفتہ نے لکھا جو ان کے مطبوعہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

کیوں کرتے تھے۔ اشتار سب میرے پسند بے سقم بے عیب۔

منشی شیونرائن آرام کی فرمائش پر اکیس شعر کا ایک قصیدہ امین برائون کی مدح میں ان کے ہاں لڑکا پیدا ہونے پر لکھا تھا: خود منشی صاحب کو لکھتے ہیں:

کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکر شعر میں خون جگر کھایا۔ اکیس شعر کا قصیدہ لکھ کر تمہارا حکم بجالایا۔ میرے دوست خصوصاً میرزا فتنہ جلتے ہیں کہ میں فن تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدہ میں ایک روش خاص سے اظہار ۱۵۸ کا کر دیا ہے خدا کرے تمہارے پسند آئے۔

اس کے بعد قصیدہ درج کیا ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:

امیدوار عنایات سید نارائن کہ آپ کا ہے ملک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ۔ تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سداۃ

”اس کو“ نو مولود کی طرف اشارہ ہے۔

شجروں سے نفرت | ارباب تصوف و سلوک کے ہاں ”شجرہ“ ایک خاص چیز ہے۔ یعنی روحانی فیوض کے واسطوں کو مرشد سے یا کرم حضور خواجہ دروہا صلی اللہ علیہ وسلم تک، ترتیب وار یاد کرنا۔ مدت سے یہ چیز معروفیہ کے یومیہ دروہوں و مخالف کو جزو بنی ہوئی ہے سہولت کی غرض سے شجرے منظوم کرانے کا رواج عام ہے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ نواب الہی بخش خاں معروف بھی جس شخص کو مرید کرتے اپنے سلسلے کا منظوم شجرہ اسے عطا فرماتے اس غرض کے لئے وہ شجرہ کی نقلیں کراتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ غالب سے بھی یہ کام لیا گیا۔ انہیں شجروں سے نفرت تھی لہذا نقل کرتے وقت ہر تیسرا شعر حذف کرتے گئے جب یہ مقطوع نقل نواب الہی بخش خاں کے ملاحظہ سے گزری تو بہت خفا ہوئے۔ لیکن غالب نے بے تکلف کہا:

آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، سوزینہ کی ایک

ایک میٹرھی اگر زمین سے نکال دی جائے تو چھداں ہرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی رر
اچک اچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔

میرا براہیم علی خاں سورتی نے شجرہ منظوم اصلاح کیلئے بھینٹا پایا۔ جواب میں
فرماتے ہیں :-

میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے شجرہ منظوم ارسال نہ فرمائیے گا۔ اس کی اصلاح
میری حدود سے باہر ہے۔ یہ میرا شیوہ ہیں۔

ہجو خواجہ عالی نے لکھا ہے کہ غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ
نہیں لکھا۔ صرف ایک قطعہ ان کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے۔ جو
مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نامور
مدح میں فارسی قصیدہ مع غرضداشت ارسال کیا۔ جواب مدت دراز تک نہ ملتا تو فیاض
کے طور پر یہ قطعہ بھیجا جس کو مشکل سے ہجو بلیغ کہا جاسکتا ہے۔

اد پر غرض کیا جاتا ہے کہ یہ قطعہ نواب وزیر الدولہ والی لونگہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔
خواجہ مرحوم کا یہ ٹوٹے بچے نہیں کہ غالب نے کبھی کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ نہیں
لکھا ان کے فارسی کلیات ^{میں} شامل ہیں کہ ہمیشہ پیار قطعات ایسے ضرور ہرودید ہیں جو ہر
حال ہجو کی ماہ میں ^{بستھا} لانا بہت ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس کی ہجو مسودا یا استایا
فارسی کے بعض قوی ہجو گو شعرائے طرح بازاری رنگ کی نہیں ہوتی تھی۔

تقریظ نگاری خواجہ عالی فرماتے ہیں کہ غالب ہر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں کرتے ہیں
اور وہ احباب کی دلدارمی کے خیال سے عموماً فرمائشیں پوری کر دیتے تھے لیکن تقریظ نگاری

اسے یہ قطعہ سبب ہیں میں موجود ہے اور سبب ہیں غالب کی زندگی میں چھپ گئی تھی معلوم نہیں خواجہ مرحوم
نے اسے قلمی کس بنا پر فرمایا۔ غالب صفر ۸۴ تک کلیات نظم قطعات ملائے اور

میں انہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف نہ ہو اور صاحب کتاب خوش ہو جائے۔ مثلاً تقریظ کا زیادہ حصہ تمہید میں یا مصنف کی ذات اس کے اخلاق یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں صرف کر دیتے تھے۔ کتاب کی نسبت صرف چند جملے لکھتے تھے جو اصلیت سے خالی نہ ہوں۔

وہ خود اپنی روش کی نسبت تفتہ کو لکھتے ہیں،

وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے، مدح کے شعر کمتر، نثر میں بھی یہی حال ہے۔ لڑاب مصطفیٰ خاں کے تذکرہ و گلش بے خار، کی تقریظ ملاحظہ کرو۔ ان کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیات الخلف کے دیوان کا دیباچہ دیکھو وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی موجب فرمائش جان جنکو بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔

تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ کے مدحیہ الفاظ کی کسی کا شکوہ کیا تھا۔ محولہ بالا بحث کے بعد غالب فرماتے ہیں،

واللہ باللہ کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک اور فقرہ لکھ دیا ہے اس سے زیادہ بھٹی میری روش نہیں۔

آئین اکبری کی تقریظ | سر سید احمد خاں نے آئین اکبری کی تصحیح کی تھی تو دہلی کے دوسرے

مشاہیر کے علاوہ غالب نے بھی مثنوی میں اس کے لئے تقریظ لکھی تھی لیکن انہیں ایک تو شیخ ابوالفضل کا انداز تحریر پسند نہ تھا، دوسرے شیخ کے پیش کردہ آئین کو انگریزی آئین کے متق بلے میں فروتر جانتے تھے۔ سرسید کے ساتھ اگرچہ ان کے تعلقات بہت گہرے اور عزیزانہ تھے اور ان کی دلداری بھی بدرجہ غائت منظور تھی لیکن تقریظ میں اپنے حقیقی خیالات چھپانہ سکے اور صاف لکھا کہ سید کی ہمت بندہ کے لئے آئین اکبری کی تصحیح قطعاً باعث فخر نہ تھی اور ایسے کام کی ستائش وہی کر سکتا ہے جس کا شیوہ ریاکاری ہو۔

من کہ آئین ریا را دوشمنم در وفا اندازہ دان خود منم
گر بدیں کارش نہ گویم آفریں جانے آں دارد کہ جویم آفریں
پھر فرماتے ہیں کہ اگر آئین کی بنا پر کتاب ستائش کی مستحق ہے تو انکھیں کھول کر موجودہ زمانے کی حالت دیکھو ورنہ انگریزوں ہی کی کاریگری پر نظر ڈالو کہ انہوں نے ویاسلائی دخانی کشتیاں ریل تار بجلی وغیرہ کیسی چیزیں ایجاد کی ہیں،

آتش کز سنگ بیرون آورند
تا چہ فسوں خواندہ اندامیاں برآب
گہ دغاں کشتی بہ جیموں سے بزد
غلطک گردوں بگرداند دغاں
از دغاں زورق بہ رفتار آمدہ
نغمہ را بے زخمہ از ساز آورند
بہیں نے بینی کہ آئین دانا گروہ
مے زند آتش بسا داند ہے
ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
دود کشتی را ہمے راند در آب
گہ دغاں گردوں بہ ناموں سے بزد
نمرہ گادو اسپ را ماند دغاں
باد و موج ایں ہر دو بے کار آمدہ
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
در دود آمد حرف از صد کردہ
مے درخشد باد چوں اگلہ ہے

رُوبہ لندن کاندر اں رخشندہ باغ شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
 کار دبار مردم ہشیار ہیں : در نہر آئین صد نو آئیں کار ہیں
 پیش ایں آئیں کہ دار و روزگار گشتہ آئین دگر تقویم پار
 پھر فرماتے ہیں کہ اگر کتاب کو طرز تحریر کے لحاظ سے شایان ستائش
 قرار دیا جائے تو،

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است گر سرے بہت افسرے ہم بودہ است
 مبداء فیاض را مشتمل بخیل نوزے ریز در طب ہا ز اں نخیل
 مردہ پروردن مبارک کار نیست خود بگوگاں نیز جز گفتار نیست
 ”آئین اکبری“ کے متعلق غالب کی رائے یقیناً قابل قبول نہیں اسلئے کہ کتاب کی
 تاریخی حیثیت معلوم و مسلم ہے۔ لیکن تقریظ سے ایک حقیقت صاف آشکارا ہے
 کہ غالب کا اسلوب فکر و نظر عام لوگوں سے الگ تھا۔ وہ شخصیت پرست نہ تھے
 باند ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہر شے کی افادی حیثیت کا مستقلاً
 اندازہ کرتے، بعد میں اس پر اچھائی یا برائی کا حکم لگاتے۔ نیز ان کا دماغ نئے نئے
 علوم و فنون کی اہمیت کا اعتراف اس زمانے میں کر چکا تھا۔ جب کہ عام
 ہندوستانی ان سے دور بھاگتے تھے۔

سرسید کے خاندان کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے بلکہ رشتہ داری
 بھی تھی۔ لیکن اس وجہ سے اپنے دل کی بات صاف صاف اور بے تکلف کہہ دینے
 میں قائل نہ کیا۔ سرسید نے اس تلخ تقریظ کو نہ چھاپا بلکہ مشہور ہے اسی بنا پر سرسید
 اور غالب کے روابط میں تکرر پیدا ہو گیا جو ۱۸۶۰ء میں اس وقت دور ہوا جب
 غالب رام پور کے پہلے سفر سے واپس ہوتے ہوئے مراد آباد ٹھہرے تھے، جہاں
 سرسید اس زمانے میں صدر الصدور تھے۔

سرودیوں میں دھوپ اور ان کی روزانہ زندگی کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے
 آگ گرمیوں میں ٹی محکایتب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا
 گھر میں کھاتے تھے اور یہ پابندی اس وقت تک نہ ٹوٹی جب تک ان میں چلتے پھرنے
 کی طاقت باقی رہی۔ متعدد دھوپوں میں مذکور ہے کہ سرمایوں دھوپ تلپتے تھے اور گرمیوں
 میں خس کی ٹی لگایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں جو جاڑے کے موسم میں لکھا گیا۔
 فرماتے ہیں:

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں و نادر میرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار
 ہے۔ خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا و اس یک دہان
 میں دھوپ آتی ہے اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ سرد دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا پھلکا
 سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔

دوسرے خط میں جو گرمیوں کے زمانے کا ہے۔ فرماتے ہیں:
 کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھنڈ دھوا رہا ہے
 حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔

سرودیوں میں آگ بھی تاپتے تھے۔ چنانچہ کئی خطوں میں اس کا بھی ذکر آیا
 ہے۔ مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں:
 ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو تری آگ بھٹی پر گزارا
 ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

قصص و حکایات کے | غالب کو قصص و حکایات کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ خاص
 مطالعہ کا شوق | عالم مارہروی نے مارہرہ بلانے کی کوششیں کیں۔ ایک مرتبہ
 آسموں کا لالچ دیا۔ پھر لکھا کہ مارہرہ تشریف لائیں گے تو کہتے ہیں "بوستان خیال پر چلے
 گئے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

حضرت نے میری گرفتاری کا نیارنگ نکالا۔ ”بوستان خیال“ کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھے میں
اپنی طاقت پر اذکماں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین سے اٹھا لاؤں۔
میر محمدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب ”میر حمزہ کی
داستان کی اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی نہ تھی۔ گئی ہے بسترہ بوتلیں بادہ ناب
کی موجود ہیں۔ ان بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شرب پیا کرتے ہیں:-

کے کارں مرادش میسر بود

اگر ہم نہ باشد سکندر بود

غذا | خواجہ حافی لکھتے ہیں کہ غالب کی مرغوب غذا گوشت کے سوا کوئی چیز نہ تھی وہ
ایک وقت بھی بے نیار گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انہوں
نے گھڑی یا شہرہ کھنی استعمال نہیں کیا۔ آخری غم میں ان کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔
جب وہ چلے پھرنے سے بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے تو گھر سے انکے لئے دن کو جو کھانا لاتا
تھا۔ اس میں خواجہ حافی کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل چیزیں ہوتی تھیں:-

(۱) پاؤں سیر گوشت کا فورم، ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں شوربا۔

(۲) ایک پیالے میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔

(۳) ایک پیالے میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی۔

(۴) ایک پیالے میں دو تین پیسہ بھر دہی۔

(۵) شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیج کے کباب

وہ خود ستمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اپنی غذا کے متعلق فرماتے ہیں:-

صبح کو سات بادام کا شیرہ قدر کے ترست کے ساتھ، دوپہر کو سیر گوشت کا گڑھا پانی

قریب شام کے کبھی کبھی تین تے ہوئے کباب چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر

شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرفی شہرہ

دسمبر ۱۸۹۶ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں :

نداء : اختصاراً درویشی محض تھی کو مان سکتا ہوں کہ شہرہ سازانہ بکتاب گزشتہ

میں جوچر لکھا ہوا ہے وہ سب سچا ہے۔

ناؤ فوٹس [سرق نوشی پر پردہ ڈالنا یا اس کے متعلق کون سا انداز رکھنا بے سود ہے یہ علت بتدار ثباب سے ان کو لگ بھگ تھی۔ درویشی پر پردہ ڈالنا زیادہ تر ولایتی شراب پیتے تھے جس کا نام ان دنوں "سداوت" ہے۔ "نفاذ" کے بعد دینی شراب ہست گرن ہوئی تھی۔ چاہے وہ باوجود بند سداوت کے اس میں ہیں اور درویشی کا نرٹ ہو چھتے ہیں۔ ایک نرٹ میں لکھا ہے :

"یکوڑ ایک اندری شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور

طعم کی ایسی بیشی، جیب نہ کا قوام پسند۔

خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ شراب سونے وقت پیتے تھے جو مندرجہ ذیل تھی۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ تبس تبس میں تو تبس رہتی تھیں اس کی کئی دواؤں کے واسطے تھی اور اس کو سخت ناکید تھی۔ اگر عالم سرخوشی میں زیادہ پیتے پر سر رہیں ہو تو کئی نہ دینا۔

نواب مراد میرالین احمد خاں مرحوم فرماتے ہیں کہ یہ سداوت معلوم ہوا کہ بوتلیں ان کے پاس دھری رہتی تھیں۔ نواب مرحوم بچپن میں اکثر غائب کے پاس جا کر کرتے تھے۔ فرماتے تھے : والدہ محترمہ نے سخت تاکید رکھی تھی کہ غائب کی بوتلوں کو کبھی ہاتھ نہ لگانا یہ بھی فرماتے تھے کہ شراب کی بوتلوں کے سداوت میں ہاتھ بھی ایک دو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے۔ جنہیں گزشتہ کے شہرہ سازانہ لکھا کرتے تھے۔

شراب میں عرق شیر یا گلاب ملا کر پیتے تھے۔ خود ایک غزل کے مطلع میں کہتے ہیں :-

آسودہ باد خاطر غالب کہ خورے دوست

آمینختن بہ بادۂ صسانی گلاب را

عرق نوشی کا التوا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ روزانہ شراب پیتے تھے یا کبھی کبھی بغیر پیتے بھی گزارا کر لیتے تھے۔ ممکن ہے۔ غدر کے بعد پیش کی بندش کے زمانے میں بھی انہیں کسی وقت شراب نہ ملی ہو۔ خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے ۲۲ جون سے لے کر ۱۷ جولائی تک شراب کلیتہً ملتوی رکھی۔ اس کی وجہ خود بیان فرماتے ہیں :

انہم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سودا دار مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی

ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ

کیا کروں۔ کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہر و ریش بر جان درویش۔ صبح کی تبرید متردک

چاشت کا گشت آدھا، رات کی شراب دگلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا

روزمرہ کا خرچ چلایا۔ یاروں نے پوچھا۔ تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا کہ جب تک

وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے۔ تو کس طرح جیو گے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں

گے۔ یار سے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا۔ کہ رام پور سے علاوہ وجہ مفردی کے روپیہ

آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی

گوشت پورا آئے لگا۔ چونکہ بھائی (نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو) نے وجہ موقوفی

و بحالی پر چھی تھی، ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع

اے بے خبر لذت شرب مدام ما

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔

آموں کا شوق امیہوں میں سے انہیں انگور اور آم بے حد مرغوب تھے۔ آموں کی تعریف میں ان کی شہسواری بھی اردو دیوان میں ہے۔ دوست دُور دُور سے انہیں آم بہ طور تحفہ بھیجتے تھے۔ خود بھی فرمائش بھیج کر منگاتے تھے۔ فارسی مکاتیب میں سب سے پہلا خط نواب اکبر علی خاں طباطبائی متولی امام بارہ ہوگلی کے نام ہے اس میں آم طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

نخستہ شکم بندہ ام و قدر سے ناتواں ہم آرایش خواں جویم و ہم آسایش جاں خردوران
دانش کہ این بر دو صفت بہ انداز راست و اہل کلمہ را اند کہ قدر و انبہ ہوگی بند راست۔
ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :

ہمہ گر میوہ فردوس پس پخوانت باشد

غالب آل انبہ بنگا نہ فراموش مباد

سیاح نے بمبئی سے آم بھیجنے کا خیال بنایا تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

ام مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ نگور سے کم عزیز نہیں۔ مین بمبئی اور سورت سے یہاں

پہنچنے کی کیا صورت ؟ مادہ کا آم یہاں دلائی اور پیوندی کر کے مشہور ہے اچھا ہوتا ہے۔

کہاں یہ ہے کہ ان بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلی آم بھیجنا محض تکلف ہے۔ روپے کے

آم اور چار روپے محضونی ڈاک۔ پھر سوہیں سے شاید دس پہنچیں۔ یہاں دیسی آم انواع

واقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوش بود افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں

رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر یہ سبیل ارمغان بھیجتے

رہتے ہیں۔ اسے لو آج بریلی سے ایک ہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکے،

ہر ٹوکے میں سو آم۔ کھودار دغہ نے میرے دو نو ٹوکے کھوئے۔ دو سوہیں سے تراسی

آم اچھے نکلے۔ ایک سو سترہ بالکل سڑے ہوئے۔

انبہ خوری کا طریق | صاحب عالم مارہروی نے کسی سے سنا تھا کہ غالب مارہرہ آکر آم کھانے کے آرزو مند ہیں۔ انہوں نے محض دعوت نامہ ہی بھیجا بلکہ لکھا کہ مارہرہ آنے کی تاریخ سے مطلع فرمائیے۔ جواب میں لکھتے ہیں کسی وقت بہ طریق تمنا کہا گیا تھا کہ مارہرہ جا کر آم کھاؤں۔ مگر اب وہ دل اور طاقت کہاں سے لائیں؟

نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعائین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھانا تھا کہ دم بیت میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی ذلت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر ہونہی آم بڑے بڑے نو باغ سات۔

اسی طرح میر ہمدانی مجروح اور قاضی عیدالجمیل بریلوی کے نام کے خطوں میں آموں کے ہدیہ کا ذکر ہے۔

تباہ کنشی | غالب حنفہ بھی پیتے تھے چنانچہ دو تین جگہ خطوں میں اس کا ذکر موجود ہے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے سفر میں بھی حنفہ ساتھ تھا۔
سوار ہو کر نکلتے تھے | اگرچہ عموماً تنگ دست رہے اور ابتداً شباب کو چھوڑ کر ان پرکشائش کا دور کبھی نہ آیا۔ لیکن وضع حداری کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ سوار ہو کر نکلتے۔ غدر کے بعد جب ان کی نیشن بند تھی اور بے مقصدوری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بھی سواری کا سلسلہ یہ دستور قائم تھا۔ مثلاً کمشنر دہلی کی خواہش کے مطابق "دستبنو" کے نسخے ان کے پاس لے کر گئے تو سواری میں گئے۔ چنانچہ میر مجروح کے نام کے خط میں صاحب سے ملاقات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے کہا کہ میں حاضر ہیں۔ کھانشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ (صاحب) ادھر سوار

ہوئے۔ میں زحر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

مصببت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کتواں بند ہو گیا۔ لال رنگی کے گنوئیں ایک قلم کھاری ہو گئے
خبر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی بکھتا ہے۔ پر سوس برس سوار ہو کر کنوؤں کا حل دریافت
کرنے گیا تھا۔

اگر ان کے پاس سواری نہیں ہوتی تھی۔ تو کسی بے تکلف دوست کے ہاں سے
منگا لیتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر نواب حسام الدین جید خاں کے ہاں سے پینس منگائی تھی۔
قلعہ میں جانے کا وقت [قلعہ میں بھی سوار ہو کر جاتے تھے۔ صبح بجا کر پہرہ دن چڑھتے ہیں
آ جاتے تھے۔ مکان پر دو چار آدمی برابر رہتے۔ ایک صاحب غالباً بریلی سے
ملنے آئے تھے۔ غالب اس وقت مکان پر موجود نہ تھے۔ بعد میں
انہیں معاذم ہو۔ تو نہ مل سکے پر افسوس اور معذرت کا خط صلی عبد الجلیل
بریلوی کو بھجوا۔ اس میں فرماتے ہیں :-

میں کوئی مرد زندقہ کو جاتا ہوں۔ ظاہراً مولوی صاحب اور رہا آئے ہوں۔ جب سوار
ہو جاتا ہوں۔ جب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے۔ چٹتے
پیتے۔ اگر صبح جاتا ہوں۔ تو پہرہ دن چڑھتے آتا ہوں۔

شیوہ عام کی پیروی سے نفرت [شیوہ عام کی پیروی سے بہت متنفر تھے جس طرح فکر و نظر
اور تحقیق میں ان کی راہ سب سے الگ تھی۔ اسی طرح زندگی کے عام اوضاع
میں بھی رسم عوام کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں تصنع کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ انکی
طبیعت ہی ایسی تھی۔ حلیہ کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب تک وار بھی میں سفیدیاں

نہ آئے، منڈاتے رہے جب دارمی چھوڑ دی۔ تو دہلی کے شیوہ عام کے خلاف مر منڈا دیا۔
اس سلسلے میں لفافوں کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ غالب عدر کے دنوں میں تگ دست
تھے۔ اور لفافے خریدنے کا مقصد وہ نہ تھا۔ تو خود لفافے بنا لیتے تھے۔ فشی شیوہ زراٹن
آرام کو معلوم ہوا تو انہوں نے لفافے بھیج دیئے۔ جن پر سعادت منڈ شاگرد
نے استاد کی سہولت کے لئے ”از مقام“ ”در مقام“ ”تاریخ و ماہ“ وغیرہ الفاظ چھپوا
دیئے تھے۔ غالب نے ان لفافوں کو دوستوں میں بانٹ دیا۔ فشی صاحب نے
دوبارہ پیکٹ بھیجا۔ تو واپس کر دیا اور لکھا۔

بھائی میں اپنے مزاج سے لاچار ہوں۔ یہ لفافے ”از مقام“ ”در مقام“ ”تاریخ و ماہ“ مجھ
کو پسند نہیں آئیں گے۔ جو تم نے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں میں بانٹ دیئے۔
اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کی عوض وہ لفافے جو ”از مقام“ اور
”در مقام“ سے خالی ہیں، جس میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے
اس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو اس کی ضرورت نہیں۔

بیرنگ خطوط کا قاعدہ | غالب اکثر خطوط بیرنگ بھیجا کرتے تھے، خصوصاً اہم خطوں پر
ٹکٹ لگانا منافی احتیاط تصور کرتے تھے اور اپنے دوستوں سے بھی یہی کہتے تھے کہ
بیرنگ خط بھیجا کرو۔ مثلاً تفتہ کو لکھتے ہیں کہ بیرنگ خط بھیجو اس لئے کہ ڈاک وائے
ایسے خط جلد پہنچاتے ہیں۔

سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں :-

پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر س بات پر تم کو بیرنگ خط بھیجتا ہوں کہ
ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے۔

چودھری عبد الغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا

اور رجسٹری کا دردمر جانا رہے گا۔ آدھا آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی۔ آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجئے۔
اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ پیڈ خط تلف ہو جاتے ہیں۔ اس کا عدے کا جیسا کہ میں
واضح ہوا ہوں بادی (شروع کرتے والا) بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا۔

شہرت و ناموری کا احساس | بڑے عالی حوصلہ تھے لیکن اپنی شہرت و ناموری کا انہیں
بہت خیال تھا۔ اور ان کی یہ جس بے حد تیز تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے مکان کا پتہ
پوچھتا یا خط پر پتہ درج کرنے میں زیادہ تفصیلات سے کام لیتا تو فوراً دل میں کھٹک
پیدا ہو جاتی کہ شاید انہیں گناہ اور کم مشہور آدمی سمجھ لیا گیا ہے۔ خطوں میں ایسی
مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک بگد فرماتے ہیں :-

میں گناہ آدمی ہوں۔ مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آنے ہیں۔ تلف نہیں ہوتے
بعض فارسی خطوں پر مجھے ہر پتہ نہیں ہوتا۔ اور انگریزی خطوں پر تو ہونا ہی نہیں صرف
شہر کا نام ہوتا ہے۔

ایک ور خط میں لکھتے ہیں :-

میرے نام کا لغو جس شہر سے چلے، اسی شہر کے ڈاک گھریں۔ وہ جائے تو رہ جائے۔ ورنہ
وہی سے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

نواب علار الدین احمد خاں نے مکان کا پتہ پوچھا تو فرمایا :-

قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آدری جمہور کے نزدیک
ثابت و متحقق ہے۔ ورنہ جانتے بھی ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور
اس مسخرے کو گناہ و ذلیل نہ سمجھو تو نہیں چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں
رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محض
نہیں لکھتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محض سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط
فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام، یہ

سب مراتب تم جانتے ہو۔ اور ان خطرات کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو۔ اپنا سکن بتا
 گریں تمہارے نزدیک امیر نہیں نہ مہی، اہل حرفہ سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ
 اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہر کارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے۔
 خط کے پہنچنے کا میں خاص۔

مذہب | غائب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں ہے۔ اور بلاشبہ ان کا
 میلان تشیع کی طرف تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیعیت تفصیل تک محدود تھی۔ ان کا
 خاندان جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں شیعہ تھا۔ سسرال کے خاتمہ ان میں بھی کوئی
 شیعہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ شیعیت ان کی ایرانییت سے پیدا ہوئی۔ فارسی
 زبان کے متعلق بھی ان کی روش وہی تھی جس پر بعد میں اہل ایران شدت و غلو کے ساتھ
 کاربند ہوئے یعنی عربیت سے بچنے کی چیز نے غالب میں ایرانییت کے ساتھ خاص شیعیت
 پیدا کر دی اور غالب اسی شیعیت کی کثیر تہ تھا کہ ان کے مذہبی معتقدات بھی ایرانی رنگ میں
 رنگے گئے۔ ممکن ہے ملا عبد الصمد کی صحبت نے ان کے مذہبی افکار و امیال پر یہ اثر
 ڈالا ہو یا ممکن ہے نجف خاں کے عہد اقتدار میں ان کے خاندان نے شیعیت اختیار کر لی ہو۔
تصنیف | تصوف سے انہیں خاص مناسبت تھی۔ خواجہ حالی کے قول کے مطابق وہ بظاہر
 اہل حال سے نہ تھے۔ لیکن عرفا اور صوفیا کے کلام سے پوری طرح واقف اور
 توجہ و جود دی یا یہ اصطلاح عام و عدت الوجود کے قائل تھے۔ خواجہ مرحوم
 نے بالکل درست لکھا ہے کہ توحید و جود دی ان کی شاعری کا خاص عنصر بن گئی تھی اس
 مضمون کو انہوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا ہے۔ غایب نظیری اور بیدل کے
 بعد کسی کے بیان نہیں کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں :-

یہاں لا موجود الا اللہ کے بارہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام اور

نور و تار کو مٹاتے ہوئے بیٹھے ہیں

کی شہر بیکار

سوی اللہ والہ اللہ ما فی الحمد

ایک اور خط میں لکھتے ہیں

یہ کہ جس کے لوندوں کو یہاں کر موی مشہور ہونا اور مسائل بوضیفہ کر دیکھنا

اور اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

میں مشرک وہ ہیں جو مسیحیہ کو بہ

دو فرخاں ہوں کہ وہ اس میں موجد خاص اور مبین کامل

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

بریں نہ سستہ ہم بریں بلزوم

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

ہمست در نسوی اس میں جلیں

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

اور مسلمانوں کی ذرا سی ذلت پر بھی تڑپ اٹھتے تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں ایک مرتبہ خود غالب نے کہا۔

مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔

تعصبات سے بالکل پاک تھے | حد درجہ صلح کل اور تعصب بالکل پاک تھے ہندوؤں مسلمانوں سب کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ تفتہ یا منشی بہاری لال یا منشی شیونرائن یا ہیر سنگھ اور جواہر سنگھ یا ان کے والدائے مجمل کے ساتھ انہیں مسلمان شاگردوں یا دوستوں سے کم محبت تھی وہ ایک خط میں لکھتے ہیں، میں تو بنی آدم کو مسلمان بھی ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قربت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔

لباس | لباس کے متعلق خطوط و تحریرات سے تحقیقی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھلا پاجامہ لبہا چغہ اور پوسٹ کی کلاہ پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹوپی خراب ہو گئی تھی تو سر کے لئے پشاور می ننگی بھی منگائی تھی۔ منشی جواہر سنگھ کو لکھتے ہیں:-

کلے از پوسٹ برہ داشتہ ام را کرم خورد و سرمہ بے کلاہ ماند۔ اگرچہ کلہ نمے جویم ننگ ابریشمی چنانکہ در پشاور و ملتان سازند و اعیان آن قلمرو بر سر بچندے خواہم امانگے کہ رنگما ہے شوخ نہ داشتہ باشد و عاشیہ سرخ نمود۔ مہد اورد از ہائے نازک طراز ہائے لغز و استہ باشد و تار ہائے زرد و سبز را در آن صرف نہ کردہ باشند۔ پھر ایک اردو خط میں لکھتے ہیں:-

کیوں صاحب وہ ہماری نیکی بہ تک کیوں نہیں آتی بہ بہت دن ہوئے جب تم نے
لاکھا تھا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔

صغیر بگڑاؤں سے آخری دور کا لباس یہ لکھا ہے، پابا مرہ سیاہ ہوئے، روپوں
کا کلی، نہ بیٹھ سرخ ٹول کا بند، میں سر نہ آتی۔

جانوروں کا شوق ایہ نہیں کہنا یا سکتا کہ غالب کو جانور پائے کہ بہتہ شوق تھا یا نہیں
لیکن ان کے گھر میں مختلف قسم کے جانور ضرور رہتے تھے، مثلاً لوطی نقابوں کے
متعلق یادگار غالب میں ایک لطیفہ بھی درج ہے کہ: "سپاں مکتو تھمارے نہ جو رو
نہ پتے تم کس فکر میں سر جھٹائے بیٹھے ہو؟" دارم پور سے جو خط لکھے گئے ان میں
سے ایک میں ذکر ہے کہ باقر علی غاں اور حسین علی میں دارم پور سے صبر غ
لے کہ دھلی روانہ ہوئے، ایک مرتبہ لڑا بہ ماہین احمد ن، قادیان وادی اور دوسرے
برسات کے لئے مکان مستعار مانگا تھا، بعد ازاں اس میں منقل ہوئے گا
اور ترک کر دیا، اس سلسلے میں نواب صاحب معروف کہ یہ خط لکھا اس
میں نور الدین و ذبیہ بگری اور گھوڑوں کا ذکر ہے، کلیات نظم فارسی میں
ایک قطعہ بالی کے تحت ہیں یہ ہے:

دارم بہ جہاں گریہ پاکیزہ بہادری	کز باں پریراد بود موج زہم اد
سر مست او اچوں بہ زمیں باز خراں	از خاک دم غنچہ نقش قدم او
چوں صورت آئینہ زافر از لطافت	آید بہ نظر بچہ دواز شکم او
ہر شیر ژیا نے کہ بہ بیٹی بہ نیستان	دارد سر در پیرہ غرش زدم او
گر جانور سے مرده را باید سرا ہے	از پاکی طینت بخور غنچہ بر غم او

هر چه که کنج شک بود باز سپارد در پردرختش او نخورد بهر قسم او
 آرمست بود از غیر رتبه انداز خرامش بر بخت و قدر دست او و نعم او
 ز شده اویم نقش از لطف ز بانفش گوئی به شکر تاب میل است نعم او
 جوش کل و پاییدی موجب رنگ است و نعم او به کنار آمدن و صبر هم او
 در برده بهر آب بهر نسیم زار کشاید لرزد شکن فتره خوابان ز خم او

تا عهد نسیمش صفی انکس بود هر
 بار گفت و صفت من و دوستش شکست

چودھوال باب

تعمینیت

نزدیک بہ صورت اولیہ ابلیں بودہ اہم خائب
 بہ وار نمک معنی سے ستم فرست یا فریاد آنا

متداول تعاملف ا خائب کی تعریف بہ صورت موجودہ حسب ذیل ہیں :

(۱) کیفیت انگریزوں کے ساتھ ہونے والی حالت کہ وہ ان کے بڑے بڑے شہر ہا مستحق

تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہر لحاظ سے برابر رہے۔

(۲) طبیعت شرمیلی کی حالت کہ وہ ہر مرد و ستیہ پر مشتمل ہیں۔

(۳) زبان اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے ساتھ بھی ہونے کی حالت۔

(۴) "اردو سے متعلق" اس کے ساتھ ساتھ ہندی کے ساتھ بھی۔

(۵) ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے ساتھ بھی۔

(۶) ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے ساتھ بھی۔

مثلاً اگر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے ساتھ بھی۔

یعنی کتاب کا کیا ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہندی کے ساتھ بھی۔

(۷) مکاتیب غالبؔ نواب یوسف علی خاں مرہٹہ اور نواب گلپشہار خاں خاں مرحوم
فرمانروایان رام پور کے نام غالبؔ نے جتنے خطوط لکھے تھے وہ سب مولانا تیار علی
صاحب عرشی نے مرتب فرما کر شائع کر دیئے ہیں۔ اس مجموعہ کیلئے فاضل مرتب
نے ایک بسوط مستند مآخذ اور تمام مکاتیب پر نہایت عمدہ حواشی تحریر فرما دیئے بلکہ فرمانروایان
رام پور کے متعلقہ مکاتیب کی عبارتیں بھی جا بجا درج کر دیں۔

(۸) "ناور خطوط غالبؔ" غالبؔ کے ۴۴ مکاتیب کا مجموعہ ہے جو سید کرامت حسین صاحب
کرامت ہمدانی بہاری حضرت صفیر بلگرامی اور حضرت صوفی مینری بہاری کو لکھے گئے
یہ مجموعہ سید کرامت حسین کے پوتے سید سمیع اللہ صاحب ساگیادی نے شائع کیا ہے۔
کتاب تصانیف [نوائسائیف آج کل] دست کیاب ہیں اور غالبؔ کی وفات کے بعد
دوبارہ شائع نہیں ہوئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) قاطع برہان۔ یہ غالبؔ کی زندگی ہی میں دوسری بار درفش کا دیوانی کے
نام سے چھپ گئی تھی۔

(۲) ترغیبتیہ۔ اس میں "قاطع برہان" پر بعض اعتراضات کے جوابات دیئے گئے تھے۔

(۳) نکات و رقعات غالبؔ، اس میں فارسی زبان کے چند اصولی قواعد شامل۔ دوزبان
میں بیان کئے گئے تھے اور آخر میں "ہنج آہنگ" سے پندرہ فارسی مکاتیب
شامل کر دیئے گئے تھے۔

(۴) مثنوی امیر گہر بارہ۔ یہ مثنوی بہ حالت موجودہ کلیات نظام فارسی میں شامل ہے۔
لیکن اس کا ایک الگ نسخہ بھی کلیات کی اشاعت کے بعد ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا جس
میں غالبؔ کے چند فارسی قصیدے قطعات اور رباعیات بھی شامل تھیں۔

(۵) قادر نامہ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ جو ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا پنجاب یونیورسٹی
لائبریری میں موجود ہے۔ پبلشر کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب غالبؔ کی تصنیف ہے۔

لیکن مجھے اس میں کلامِ شے یہ خالق باری کے رنگ میں بچوں کے انصاف کی کتاب ہے جس میں سہولت حفظ کے لئے مترادف الفاظ نظم کر دیئے گئے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے :-

قادر اللہ اور یتزداں ہے خدا

سب نبی مرسل پیغمبر مستفانا

اس کا نام "قانونِ ست" اس وجہ سے رکھا گیا کہ پہلے شعر پہلا لفظ قادر ہے۔

(۶) کل رحنا، غالب نے اپنے عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اپنے اردو فارسی کازم کا ایک منتخب مجموعہ اس نام سے مرتب کیا تھا اور اس کے دو بابہ اور نامہ کی نشریں فارسی میں لکھی تھیں جو کلیاتِ شرفارسی میں موجود ہیں لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں یہ مجموعہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ اس کا صرف ایک حصہ ان کے پاس ہے۔

(۷) انتخابِ دیوانِ اردو، یہ انتخاب نواب کلب علی خاں مرحوم کے ارشاد کے مطابق غالب نے ستمبر ۱۸۷۱ء میں کیا تھا۔

(۸) انتخابِ دیوانِ فارسی، یہ انتخاب بھی ستمبر ۱۸۷۱ء ہی میں نواب کلب علی خاں مرحوم کی خبرِ نشر کے مطابق ہوا تھا۔

دونوں انتخاب، رم پور کے شاہی کتب خانہ میں موجود تھے اعلیٰ حضرت دہلی کے راجہ پور اور ان کے وزیرِ اعظم کی ملکہ دوستی کی برکت سے مولانا سید امتیاز علی صاحب

مولانا عبدالحق صاحب سمرقندی جس رفی و دوستِ رفیع علی مرتضیٰ صاحب کے حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ قادر مامر نے ایک بار علی خاں و سرسید کی ممالکِ حیدریت لکھا تھا کہ ان کے صاحبِ لکھنؤ کے ہاتھ میں کہیں بعض شہادتیں ہیں جن سے واقعی غالب کی تصنیف ثابت ہو جائے جس ان دسی شہادتوں سے آگاہ نہیں ہو سکا۔

مشتی کے زیرِ استقامت چھپ گئے ہیں۔

نائبِ سرور اور فارسی گوشت میں از روہ دیوان کلیات سر فارسی نے اپنی

اور نہ سرور کے حالات کو اپنے میں قاطع پریشان اور مستحضر کے حالات زیادہ شہد ہیں

ہو یا جو کچھ معلوم ہو سکا، اس میں یہاں بیان کیا ہے۔

میں نے اپنی فراہمی معلوم ہوتا ہے کہ نظم و شعر خود اس کے پاس یعنی جمع ہیں ہوتی بعضی و بعضی

و سباز منہ اس کے اس تحریرتہ کے ساتھ کہ اس کے ہاں ایک کتابت میں از اب ضیاء میں اس کے

میں میرزا میرزا اور زور و تقاریر ہیں، یہ وہ ہیں میں میں اس طریقہ پر قماروں و کمر میں

یہ ایک خاصہ قبل کتابت ہے کہ اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

جہاں یہ ہے وہ اس میں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

شہد میرزا میں کہ اس کے ہاں ایک کتابت میں

نصابہ میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

میں اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

کو ہلک کرنا میں قیمت اس کے ہاں

جو اس کے ہاں ایک کتابت میں اس کے ہاں ایک کتابت میں

اُردو کے دیوان کے چھاپے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں قلمی دیوان جو تم واکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ یہاں لکنا ہوا انفرادی ہے تو تم کو بھی لکھ دیجو۔
 بہر حال ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ :

(۱) غالب کی تحریرات ان کے پاس جمع نہیں تھیں۔

(۲) جو کچھ مختلف دوستوں بالخصوص نواب نعیم الدین احمد خاں کے پاس جمع تھا وہ تمام نذر میں لٹ گیا۔

نذر کے بعد جو کچھ جمع کر کے چھاپا گیا اس میں شبہ انتہائی اہتمام کیا گیا ہوگا کہ کوئی چیز باہر نہ رہ جائے۔ لیکن حسد و احاطہ کا دعویٰ نہیں کیا سکتا۔ غالب کی شائع شدہ تحریرات میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ بعض چیزیں چھپنے سے رہ گئیں لیکن ان کا جو غیر مطبوعہ کلام نسخہ حمید کے علاوہ متفرق طور پر وفات کے بعد شائع ہوا اس کا خاصا حصہ نذر سے پیشتر کا معلوم ہوتا ہے البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کلام فراہم نہ ہو سکا یا غالب نے اسے ناقابل اشاعت سمجھ کر قلم انداز کر دیا۔

اُردو دیوان [تصانیف میں ہم سب سے پہلے اُردو دیوان کو لیتے ہیں جو غالب کی شہرت و عظمت کا مدار ہے اگرچہ وہ خود اس کو یا اُردو کلام کو اپنے نداد و کمالات کا نتیجہ مظہر نہیں جانتے تھے بلکہ باعث تکبر دانستے تھے۔]

اپریل ۱۸۵۹ء کے جس مکتوب کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر غالب کا اُردو دیوان ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا۔ مثلاً،

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں جس میں خطاب ذوق سے ہے۔

راست سے گویم دے از راست سمرقواں کیتد ہر چہ در گفتار فخر تست آن سنگ من است
 فارسی ہیں تباہ بینی نقشہ سے رنگ رنگ بگزد از مجموعہ اُردو کہ ہر رنگ من است

پہلی بار ۱۲۵۲ھ و ۱۸۳۲ء میں چھپا تھا جس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ تھی۔ اس دیوان میں کل ۱۰۷۲ شعر تھے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ و ۱۸۵۵ء میں چھپا اس نسخہ میں ۱۰۹۳ شعر تھے۔ اس کی ترتیب کلیات فارسی کی موجودہ ترتیب سے مشابہ تھی۔ یعنی ابتدا میں قطعات پھر مثنوی پھر قصائد اجداد میں غزلیں اور آخر میں رباعیات۔

۱۸۶۰ء میں دیوان کا نیا ایڈیشن چھپانے کا خیال پیدا ہوا۔ منشی ۱۸۵۶ء میں اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں دلی رام پور کے لئے بھیجا تھا جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو اس کی ایک نسل لے کر نواب ضیاء الدین خاں کی فرمائش کے مطابق ان کے پاس ارسال کر دی۔ رام پور ہی میں تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اردو دیوان کے چھاپے کی اجازت کے لئے خط لکھا۔ واپسی پر وہ میرٹھی پہنچے۔ تو منشی ممتاز علی خاں صاحب جو غالب کے عزیز دوست تھے عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ اٹھالیا۔ غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں والا قلمی نسخہ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا چھاپا ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ منشی شیونرائن صاحب اکبر آبادی نے دیوان کے لئے اصرار و ابرام کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اسے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے تقاضا کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لیا۔ اور منشی شیونرائن کے پاس اگرہ بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خاں کے مطبع احمدی واقع شاہدہ میں دیوان چھپوا لیا۔

میرٹھ میں طباعت کا اہتمام یہ سب کام خود غالب نے مختلف خطوں میں بیان

سلسلہ اس میں سے کوئی ایڈیشن میرٹھی نظر سے نہیں گزرا ان کے متعلق بہ کچھ لکھا گیا وہ دوسرے کے بیان پر مبنی ہے۔

کئے ہیں مثلاً وہ منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں :

میں رام پور میں تھا کہ یک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا "عرضداشت عظیم الدین احمد بن
مفت میرٹھ والہ باللہ" مگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کوں ہے، در کیا پسند رکھتا ہے۔
معدوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سودگرمی اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر
چپ رہا جب رام پور سے میرٹھ آیا، بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترادیاں منشی
ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے انہوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ
کو بھیج دیجئے گا۔ عظیم الدین ایک کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو دیوان
ریختہ آتم واکس کہاں تھا۔ ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھ واکر نواب یوسف علی خاں بہادر
کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا۔ تو بھائی ضیاء الدین نے مجھ
کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان لے کر اس کو کسی کاتب سے
لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین
خاں کو دتی بھیج دیا تھا۔ آمد مہر سرمد غائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے
مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین احمد خاں سے لے
کر بھیج دوں گا۔ مگر کاپی کی تصحیح کا ذکر نہ کرنا ہے، نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں۔
اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آکر ضیاء الدین احمد خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے
ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھوڑتا تو اپنے گھر
کا مطبع (یعنی مطبع منشی شیونرائن) چھوڑ کر پرانے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا۔
آج اسی وقت میں نے تم کو خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں کو ایک خط
بھیجا ہے۔ ان کو لکھا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا، ہو تو نہ چھاپا جائے، اور دیوان جلد
بھیجا جائے۔ اگر دیوان آگیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اگر وہاں کاپی
شروع ہو گئی ہے تو ناچار ہوں۔

مسودہ کی واپسی پر اصرار بہ ہر حال دیوان اواخر مارچ یا اوائل اپریل ۱۸۶۰ء میں میرٹھ بھیجا گیا ہوگا اس لئے کہ غالب مارچ ۱۸۶۰ء ہی میں رام پور سے واپس آئے تھے منشی شیونرائن کے خط کے بعد دیوان کی واپسی کا تقاضا شروع کیا۔ جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک دیوان واپس نہیں ملا تھا۔ سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں :

دیوان کا بیجا پاکیسنا۔ وہ شخص نائناسنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر سخت نامستقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان مطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگتا ہوں۔ وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے۔ تم بھی دعا مانگو۔

مسودہ اگرہ بھیجا گیا ۳۰ جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں سیاح ہی کو لکھتے ہیں :-

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب ناالصفات سے ہاتھ آگیا اور میں نے فورچشم منشی شیونرائن کو بھیج دیا۔ یقین کلی ہے کہ وہ جھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا

دیوان منشی شیونرائن کے پاس پہنچا تو انہوں نے غالباً لکھا کہ یہ مکمل نہیں ہے۔ غالب فرماتے ہیں :-

میاں تھارسی باتوں پر منہسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم واکل ہے وہ اور کون سی دوچار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں؟ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرعہ میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔

دہلی میں طباعت لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے منشی شیونرائن کی طرف سے بھی طباعت میں کافی دیر ہو گئی۔ مجبور ہو کر غالب نے دیوان دہلی میں چھپوا لیا۔ وہ

۱۰۔ جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں منشی شیونرائن صاحب کو لکھتے ہیں :-

دلی میں ہندی دیوان کا چھبنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم حسن اللہ خاں تھارا بھیجا ہوا فرمہ مجھے دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تھارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو میرے بھائی کے چھاپے خانے والے محمد عظیم و عظیم الدین، کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تھاری خوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیونرائن صاحب بھی طباعت شروع کر چکے تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے چھاپا مکمل کیا یا نہ کیا۔

اس باب میں ایک عجیب امر یہ ہے کہ اس نسخہ کے سوا جو غالب نے رام پور سے نقل کرا کے نواب ضیاء الدین خاں کے پاس بھیجا تھا۔ اردو دیوان کا کوئی اور نسخہ موجود نہ تھا۔ یہ نسخہ نواب صاحب سے مستعار لے کر میرٹھ ارسال کیا تھا بعد ازاں اسی کو واپس لے کر آگرہ بھیج دیا تھا، تو دلی والے مطبع میں کوئٹا نسخہ چھپا، یہ معلوم ہے کہ غالب نے جو نسخہ منشی شیونرائن کو بھیجا تھا وہ انہیں کے پاس رہنے دیا۔ کیا دلی والے مطبع کے لئے رام پور کے نسخہ کی نقل دوبارہ حاصل کی گئی تھی یا منشی شیونرائن کے پاس نسخہ بھیجنے سے قبل اس کی کوئی نقل رکھ لی گئی تھی یا غدر کے گم شدہ نسخوں میں سے کوئی نسخہ مل گیا۔ منشا غالب کی تحریرات میں مجھے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا۔

دیوان کا ناقص چھاپا اور قیمت | دلی کے دیوان کا چھاپا بہت بُرا تھا۔ نیز اس میں غلطیاں بہت رہ گئی تھیں۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں :-

دیوان چھپ چکا ہے۔ ماکھنہ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا

وید حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا دلی پڑا اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت ۔
 صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کئے کو آؤ نہ دے ۔ ہر کالی دیکھتا رہا ہوں ۔
 کاپی نکار اور تھا ۔ متوسط جو کاپی میرے پاس لیا کرتا تھا وہ در تھا ۔ اب جو دیوان چھپ
 چکا حق تصنیف ایک مجھ کو ملا غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں ۔ یعنی کاپی نگار
 نے نہ ہلے ۔ ناچار غلط نام لکھ ۔ وہ چھپا ۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا
 نہ میں خوش ہوا نہ قسم خوش ہو گئے ۔ اور یہ جو لکھتے ہو یہاں کچھ خرید رہے ہیں ۔
 قیمت لکھ بھجو ۔ میں دلال نہیں ۔ مہتمم مطبع نہیں ۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم
 مرزا موجدان مطبع شاہدہ میں محمد حسین خاں دق تہہ زمان کے کوچے میں مصوروں کی جوڑی
 کے پاس قیمت کتاب چھ آنے ، محصول ذاک خریدار کے ذمے ۔

زمانے کی نیرنگیاں دیکھنے کہ جس مجموعہ اشعار کے بعض نسخے ہمارے زمانے میں
 دو دو سو روپے کو فروخت ہو چکے ہیں ۔ اس کا حق تصنیف غالب کو صرف ایک نسخہ
 ملا تھا جس کی قیمت مع منافع ناشر و طابع صرف چھ آنے تھی اور انہیں اپنے دوستوں
 کیلئے بھی نسخے خریدنے پڑے تھے ۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مطبع احمدی والے ایڈیشن کی تاریخ ”بنائے ریختہ“
 اور ”بیان ریختہ“ نکالی تھی ۔ یوسف علی خاں عزیز نے لکھا تھا ۔
 لکھی عزیز خستہ نے تاریخ انطباع
 حاسد کے سر کو کاٹ کے ”دیوان ریختہ“

کا پورہ میں دیوان کی طباعت | مطبع احمدی والا نسخہ ۳۰ محرم ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۶۱ء
 کو چھپا تھا لیکن چونکہ حد درجہ غلط تھا اس لئے غالب نے اس کا پورہ میں چھپوانے کا ارادہ کیا ۔
 چنانچہ اپنے قلم سے مطبوعہ نسخہ پر تمام غلطیاں درست کیں ، اس کی پشت پر ایک قلم محمد حسین خاں
 مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ ان کے پاس بھیج دیا ۔ محمد حسین خاں نے اسے مطبع نظامی

کانپور میں چھپوایا یہ ایڈیشن ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) میں مکمل ہوا۔ غالب کا صحیح کیا ہوا نسخہ جسکی پشت پر محمد حسین خاں کے نام قلم لکھا گیا تھا بلکھٹو کے بازار میں چند پیسے کو بچا۔ رقعہ مذکورہ درج ذیل ہے۔

جناب محمد صیغ خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دورات دل کی محنت میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار ہو گیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت یا میرا بیان میرا قمر الدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے۔ اس کو بھیج دیجئے۔ غالب

میری معلومات کے مطابق غالب کی زندگی میں اردو دیوان کا کوئی اور ایڈیشن نہیں چھپا۔ غیر مطبوعہ اردو اشعار غالب نے ابتدا میں میرزا بیدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع کئے تھے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہی ہوئی تو ان میں سے صرف تھوڑے سے اشعار باقی رکھے۔ باقی قلم انداز کر دیئے۔ انہی اشعار کا ایک مجموعہ حضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمائندہ سے بھوپال میں تو بہت عالیہ سے نسخہ مجید بہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو اردو اشعار دیوان کی طباعت کے بعد کہے گئے وہ باتوان کے رقعات میں آگئے ہیں یا بعض قلمی مسودات سے لے کر شائع کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً چند حیریں، مسرت مولانا ابوالکلام نے "الہلال" میں چھاپ دی تھیں۔ کچھ اشعار دیوان کے اس ایڈیشن میں چھپ چکے ہیں جو نظامی ہادیوانی نے ان میں تمام سے متاع لیا تھا کچھ اشعار انسی صاحب نے اس شرح کلام سے

سہ رسالہ ہندوستانی بابت جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۹۰

سہ مراد یہ ہے کہ ساری غلطیاں درست کر دی گئی ہیں لہذا اب غلط نامہ کی ضرورت نہیں۔

سہ مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں، میرے پاس اس ایڈیشن ہے، اس میں کئی غلطیاں ہیں نظامی پر اس سب سے بہتر پر اس کتاب تصحیح کا پورا انتظام کیا جاتا تھا یہ نسخہ بہت اچھا چھپا ہے۔

میں چھاپے ہیں لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئے۔

حضرت مولانا ابوالکلام سے معلوم ہوا کہ نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے پاس اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ تھا جس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار بھی تھے مولانا محترم نے ان اشعار کی نقل لے لی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ انہیں "الہلال" (دور اول) میں شائع کر دیں لیکن سو اتفاق سے الہلال بند ہو گیا اور بعض دوسرے مسودات کے ساتھ یہ اشعار بھی ضائع ہو گئے۔

میں نے اس دیوان کی تلاش شروع کر دی مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی مرحوم مالک "الامان" و "وحدت" کی وساطت سے طالب مرحوم کے متعدد عزیزوں سے ملا لیکن قلمی دیوان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس تلاش میں نواب شجاع الدین احمد خاں تالاب مرحوم کی بیگم سے ایک اور قلمی دیوان مل گیا جس کے حاشیہ پر اور بعض اوراق پر متفرق اشعار درج تھے۔ میرا خیال ہے کہ کاتب نے انہیں غیر مطبوعہ سمجھتے ہوئے الگ درج کیا۔ لیکن ان میں سے بعض مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔

کچھ اشعار اردوئے معلّے میں چھپ چکے ہیں مگر اب تک دیوان میں شامل نہیں ہو سکے مثلاً،

میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی

تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

متفرق اشعار "الہلال" یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوان غالب کے نسخہ

نظامی میں چھپ چکے ہیں مثلاً والی رامپور کے فصل صحت کا قصیدہ "دو تین قطعات" "سخن تکیہ" "کہن تکیہ" والی غزل بعض اشعار رامپور والے مجموعہ مکاتیب غالب میں شائع ہو چکے ہیں

۱۔ محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم بنت میرزا باقر علی خاں کامل۔

۲۔ پوری غزل اردوئے معلّے صفحہ ۳۰۷ پر موجود ہے۔

۳۔ دیوان غالب مع شرح نظامی صفحہ ۱۶۱ - ۲۶۷

مثلاً برسات والا قطعہ جو ذاب کلب علی خاں مرحوم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے :

جناب قبلہ حاجات اس بلاکش نے

بڑے عذاب سے کائے ہیں پانچ چار برس

جو اشعار اب تک غیر منبوعہ سمجھے جاسکتے ہیں اس لئے کہ کسی مجموعہ میں شامل نہیں

ہوئے وہ ذیل میں درج ہیں :

آپ نے مستی النضر کہا ہے تو سہی
رجح طاقت سے سوا ہو تو نہ پیوایا کیونکر
یہ بھی اے حضرت ایوبؑ گلاب ہے تو سہی
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی
نہ ملے داد مگر روز جزا ہے تو سہی
نہ سہی نیک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھتے کیا خوب بنائی اس نے
نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روزہ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کچھ نہ کچھ روزہ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جاہلی غالب

شہرۂ تیزی شمشیر قضا ہے تو سہی

ممکن نہیں بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
جان لب پائی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
نے ستم سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں دشت غم میں مجھے صیاد دیدہ ہوں
گناہ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں
از بسکہ تلخی غم بھراں چشمدہ ہوں
میں عرض مثال میں دست بریدہ ہوں
نے دائۂ قتلہ ہوں نے دام چیدہ ہوں
میں یوسف بر قیمت اول خریدہ ہوں
ہوں میں کلام لغز نے ناشنیدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی ہے مجھ کو لاگ
جو چاہتے نہیں وہ مری قدر و منزلت
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہماری جگہ

اہلِ دُرع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل پر عاصیوں کے نمرہ میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سنگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

حاشیے اور متن کے علاوہ محولہ بالا قلمی نسخہ کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند

اشعار اردو اور فارسی کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع

نہیں ہوئے مثلاً یہ اشعار جو غالباً نو مارو والوں کی طرف سے تقاضائے تشریف آوری

کے جواب میں کہے گئے:

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے پیس بادہ ناب اور آم کھائیں

سر آغاز موسم میں اندھی ہیں ہم کہ دلی کو چھوڑیں نو مارو کو جائیں

سوا، ناج ہے جو کہ مطلوب جاں نہ داں آم پائیں، نہ انگور پائیں

ہوا حکم باد و چپوں کو کہ ماں ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں

وہ کھٹے کہاں پائیں اہلی کے بھول وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں

فقط گوشت، سو بھیر کا ریشہ دار

کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

دو شعر سہرے کے ہیں جو لڑا ب شہاب الدین احمد خاں شاقب کی شادی

کے موقع پر کہے گئے تھے۔

اسے یہ غزل ایک مرتبہ ”ہمدرد“ میں شائع ہوئی تھی جبکہ جریدہ مذکورہ نائب کے سردن میں وہی سے نکلا

تھا۔ اس زمیں میں غالب نے اجماعی دور میں دو غزلیں کہی تھیں جو نسخہ حمیدہ میں موجود ہیں اور جس میں سے

دو شعر نسخہ نظامی میں بھی یہ سلسلہ اشعار غیر مطبوعہ چھپے ہیں۔ یہ دونوں یکم تاباں والے قلمی نسخہ کے حاشیہ پر بھی

درج ہیں قیاس کتابت کہ غالب نے نسخہ حمیدہ والی دو غزلوں میں سے صرف یہی دو شعر قابل اندراج سمجھے۔

ہم نشین تارے ہیں اور چاند شہابِ یمن خال بزم شادی ہے فلک کا ہستان ہے سہرا
 ان کو لڑیاں نہ کہو بھر کی موجیں سمجھو ہے تو کشتی میں دلے بھر رواں ہے سہرا
 مہاراجہ الوری نے گلستان کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر پنج کش سے لکھوایا تھا اور بہت
 روپیہ اسکی تزئین پر صرف کیا تھا۔ ایک فارسی قطعہ اس نسخہ کی تکمیل کے متعلق ہے۔
 ایک غلط فہمی کا ازالہ | نسخہ نظامی کے صفحہ ۱۷۴ پر ایک غیر مطبوعہ غزل درج ہے۔
 جس کا مقطع یہ ہے۔

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب

آج ہم حضرت "نواب" سے بھی مل آئے

جناب نظامی فرماتے ہیں کہ "نواب" سے نواب یوسف علی خاں والی رام پور

کی طرف اشارہ ہے۔

یہ وہ غزل ہے جو رام پور سے رخصت ہوتے وقت لکھی تھی چونکہ دیوان اس وقت مرتب

ہو کر چھپ چکا تھا۔ اسلئے دیوان میں شامل نہیں ہوئی۔

یہ درست نہیں۔ اسلئے کہ اولاً "نواب" کلب علی خان مرحوم کا تخلص تھا اور

اشارہ یقینی طور پر نواب کلب علی خاں ہی کی طرف ہے۔ دوسرے نواب یوسف علی خاں

مرحوم کے زمانے میں غالب جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور مارچ ۱۸۶۱ء میں واپس

آئے دیوان کی طباعت کے جو حالات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھتے

ہو گئے نہیں مانا جاسکتا کہ مارچ ۱۸۶۰ء میں دیوان چھپ چکا تھا۔ اس وجہ سے یہ

غزل شامل دیوان نہ ہو سکی۔ صحیح یہی ہے کہ یہ غزل ۱۸۶۵ء میں کہی گئی۔

بہر حال غالب کا کافی اردو کلام ابھی تک بکھرا پڑا ہے۔ اس بات کی بھی ضرورت

ہے کہ تمام متفرق چیزوں کو یکجا کر کے بہ صورت کلیات چھاپا جائے اور اس بات کی بھی ضرورت

ہے کہ سارا کلام سامنے رکھ کر ایک ایسا انتخاب کیا جائے جو غالب کے اصلی رنگ کا صحیح مرقع ہو۔

اُردو مکاتیب کی | معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء تک اُردو مکاتیب کا اچھا ذخیرہ مختلف دستوں
اشاعت سے گریز | کے پاس جمع ہو گیا تھا اور وہ چھاپ دینے کا قصد کر رہے تھے۔ سب
سے پہلے منشی شیونرائن اکبر آبادی نے غالب کو لکھا کہ اُردو مکاتیب شائع کرنے
کی اجازت دیجئے۔ اس کے جواب میں ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں،

اُردو کے خطوط بڑے چھاپا پڑھتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے کہ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں
نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سہری ہے۔ اس کی شہرت میری
سخنوری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات

اوروں پر ظاہریوں، خلاصہ یہ کہ ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے
غالب اپنے فارسی رقعات کو چھاپنے کے خلاف نہ تھے حالانکہ وہ بھی زیادہ تر
ان کے اور دستوں کے آپس کے معاملات پر مشتمل تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو
مکاتیب کی اشاعت میں صرف اس لئے تامل تھا کہ اس زمانے میں اُردو نشر و قیغ
نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ غالب کے قول مطابق یہ نثران کی شہرت سخنوری کے منافی تھی
”آپس کے معاملات“ والا عذر عذرِ زائد تھا۔

مجموعہ مکاتیب کی ترکیب | لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دوستوں کے پیہم اصرار نے ان کی رائے بدل
دی چنانچہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی نے
منشی ممتاز علی خاں کی فرمائش سے رقعات کا ایک مجموعہ ”مہر غالب“ کے نام کے جمع کر لیا
اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا۔ غالب نے دیباچہ کی وادہ دی۔ خواجہ غلام غوث خاں بخیر
نے مزید رقعات کی ترتیب شروع کر دی۔ غالب ایک خط میں خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں،

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں۔ مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام لکھا ان کا خلاص
ہے میری ان کی ملاقات نہیں۔ انہوں نے اپنا دیباچہ چھاپنے کا موسم بہتر ہے مثال مجھ کو

بھیجا اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا چونکہ یہ خط مجموعہ نثر اردو کے لائق ہے۔
آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔

اس خط میں آگے چل کر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی منشی ممتاز علی خاں صاحب جنہوں نے خود شری عبد الغفور خاں کے پاس مارہرہ پہنچ کر مکاتیب مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی اس مجموعہ کو چھاپا پرستہ تھے اور خواجہ غلام غوث خاں بخیر کتاب کی ترتیب و تکمیل میں منشی صاحب کے معاون تھے۔ غالباً وہ صاحب کو لکھتے ہیں،

ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالفح یا چھپے گا بالنظم چھپ چکا ہے تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضاء کرے، فقیر کر بھیجیں۔
ایک اور خط میں فرماتے ہیں،

اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعہ نہ اردو کہ اس ضمن بابتوں ایسی نثر وں کو آپ خود درج نہ کریں گے۔ جناب کیس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا کہ اردو زبان کے طور کا حال پوچھا تھا اس کا جواب لکھ بھیجا بنسب و نثر اردو و نثر کی تھی۔ مجموعہ نثر پہنچ دیا نثر کے باب میں آپ کا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع وصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔

عود ہندی کی کیفیت | بہر حال منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے۔ سرور نے اپنا مجموعہ مع دیباچہ منشی صاحب کے حوالے کر دیا۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب

بیتھنے نے بنفس مزید خطوط فراہم کر دیئے۔ اس وقت تک یہی خیال تھا کہ تمام خطوط کی اشاعت ضروری نہیں۔ صرف وہ شائع کئے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو۔ اسی لئے غالب نے خواجہ غلام غوث شاہ کو لکھا تھا کہ اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں بجزہ مجموعہ نشر میں شمول کے لائق نہیں۔

لیکن بعد میں جتنے خطوط مل گئے۔ علمی اور غیر علمی کے امتیاز کو نظر انداز کرتے ہوئے مجموعہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اس مجموعہ نے "عود ہندی" نام پایا۔ اب اس میں ایسے خطوط بھی موجود ہیں جن میں نہ عبارت کی کوئی خاص خوبی ہے۔ اور نہ کوئی علمی نکتہ ہے۔

غالب سے دیباچہ کا مطالبہ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ غلام غوث شاہ "عود ہندی" کا دیباچہ غالب سے لکھوانا چاہتے تھے۔ اس فرمایش کا جواب یہ ملا کہ

مجموعہ نشر اردو کا لطیف اثر میرے لئے ہوئے دیباچہ پر ہر طرف سے تو اس مجموعہ کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جائے یا نہ چھپ جائے۔ سعید بن علی رحمۃ فرماتے ہیں کہ

رسم است کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندہ بے

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شرط پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ منشی ممتاز علی شاہ کا بیان منشی ممتاز علی شاہ "عود ہندی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میرزا غالب کی فارسی تصانیف تو بہت چھپ چکی ہیں مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی حالانکہ غالب کی اردو نشر و سروس کی فارسی سے بہتر ہے مدت سے میرا خیال تھا کہ اردو نشر بھی مرتب کی جائے۔

میرے عنایت قرار دینے پر صاحب کے شاگرد یکتا پور دھری عبدالغفور صاحب سرور شخص سے یہ ذکر آیا تو انہوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے

سب کو ایک جا کر کے اور اس پر ایک ویسا چہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا عرصہ تک سرگرم تلاش رہا۔ جا بجا سے اور تحریریں میرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اٹھائی تب متناہز آئی۔ خواجہ غلام غوث خاں بہارہ ہجیر تخلص جو جناب معتمد اعانت لکھنؤ نور نور بہادر مالک مغربی و شمالی کے میزبانی اور میرے خدمت خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص با اختصاص ہیں اس تلاش میں میرے حین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا۔ اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کئے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے مرتب کئے ہوئے رسائل اور خاتمہ میں چند شریں ہیں جو جناب غالب نے اردو کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔

”عود ہندی کے اختتام کی عبارت بہ طرز تقریظا حیمہ غلام مولا صاحب تعلق ساکن میرٹھ نے لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی ممتاز علی خاں روستا میرٹھ میں تھے۔ غالباً یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے سید رشید بن کر اردو کا دیوان منشی عظیم الدین کتب فروش کو بخرض طباعت دلایا تھا۔“

عود کی طباعت کب ہوئی اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”عود کب چھپی؟“ میرزا محمد عسکری صاحب مؤلف ادبی خطوط غالب فرماتے ہیں کہ ”عود ہندی“ سب سے پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ میں غالباً ۱۲۷۸ھ میں یعنی غالب کی وفات سے سات برس قبل چھپی تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں اس کے وجوہ ملاحظہ فرمائیے۔۔

۱) ”عود“ میں ”نامہ غالب“ بھی شامل ہے جو ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اس سے ظاہر

کتابخانه شخصی

۴۔ غائبہ خواجہ غلام موث خان بخیر کو مولوی عبد الغفور خاں نسخہ کے دیوان
”دفتر بستان“ کی تقریظ بھی خود اس میں شامل کرنے کیلئے بھیجی تھی۔ اس میں غالب اپنی
ممبر ایک کہ ہتر برس بتاتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں
لاکھی گئی اور اس وقت تک خود نہیں چھپی تھی۔

اسم) خود ہیں ایسے مکاتیب بھی موجود ہیں جو یقینی طور پر ۱۲۷۸ھ کے بعد لکھے گئے مثلاً
خواجہ غلام غوث ذراں صاحب چنبرہ نامہ کا وہ مکتوب جو کتاب کے صفحہ ۱۱۹ پر درج
ہے اس میں غالب مجموعہ نثر اردو کے طبع نہ ہونے کی شکایت کرتے ہوئے
لارڈ کینیگ اور لارڈ امبلی کی مدد میں قصیدہ بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں
درماتے ہیں کہ جب لارڈ کینیگ نے اس سرگرمی سے ۱۸۶۴ء کو ان کی خدمت
میں قصیدہ بھیجا تو اس وقت تک کہ اس کا جواب نہیں آیا اس سے ظاہر
ہوتا ہے کہ ۱۸۶۴ء تک خود اس پر بھی ترقی نہ ہوئی۔

(۴۱) خواجہ غلام غوث صاحب کے نام کے ایک خط میں جو ۷ جولائی ۱۸۶۵ء کا مرقوم ہے۔
جسے خزانہ کتب عالیہ خاں والی رام پور و مدح میں ایک قصبہ ۵ درج ہے
یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ جولائی ۱۸۶۵ء تک "غزوہ" سنا فاع
نہیں ہوئی تھی۔

موجود کلہ ہوا ایہ سنیں | اب "عود" کو پڑھنا ایہ سنیں | ال گیا ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ کتاب
۲۔ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ہمارا اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی غالب کی وفات سے
تھیک چار ماہ قبل شائع ہوئی۔ یہ کتاب نئی کتابیاں رہ گئی تھیں کہ غالب

(۳) مطبع نول کشور کان پور ستمبر ۱۸۷۸ء (رمضان ۱۲۹۵ء)

(۴) مطبع مفید عام اگرہ منی ۱۹۱۰ء

(۵) مطبع نول کشور کان پور ۱۹۱۳ء (بار چہارم)

(۶) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ء

(۷) نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ء

(۸) مطبع الازار احمدی الہ آباد

(۹) مطبع کریچی لاہور

(۱۰) مطبع گلزار ہند سٹیم پریس لاہور

اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت تک مختلف مطابع میں "عود ہندی" کے بارہ

ہزار نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

اردو سے محد کی ترتیب "عود" کی طباعت میں تاخیر ہو گئی تو غالب کے بعض عزیز شاگردوں

نے دہلی میں اردو مکاتیب کے چھاپنے کا ارادہ کر لیا۔ غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں،

مطبع، کمال المطابع میں چند اصحاب میرے مسودات اردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر

آمدہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں دراطراف و جوانب سے فراہم کئے ہیں۔ میں

مسودہ نہیں رکھتا۔ جو نکھادہ جہاں بھیجنا ہوا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تھلے پس بہت

ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا

ہو، اس کو دے دو گے۔ تو موجب میری خوشی کا ہو گا۔

اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ دہلی میں ترتیب مکاتیب

کا کام کب شروع ہوا۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے غالباً خطوط کے بھیجنے میں تاخیر

کیا۔ انہیں پھر لکھتے ہیں،

سنو بھائی۔ اگر ان خطوط کا تم کو انفا منظور ہو اور شہرت منافی طبع ہو تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ
تمام ہوا۔ اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستِ علی خطوط اپنے پاس رہے دو۔
اور کسی مقصدی سے نقل اتر داکر چاہو کسی کے ہاتھ پر سبیل پارسل ارسال کرو۔
نواب صاحب نے خطوط بھیج دیئے تو انہیں لکھتے ہیں:

خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا ذرا مال نہ تھا۔ غالب کے ذوق کو سست پائیں
موقوف ہو گیا تھا۔ متوسط ایک حبیل القدر آدمی در طلب کتب کا سودا کرتا ہے۔ یہ نفع
نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوہم ہو کر کہتم سمجھا تھا اور یہ جبر کیا تھا کہ یہ چھوٹے
گاہ میں رقعہ یک جگہ سے یکروز کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً ان دنوں نے طلبِ نجات بہ تکلف
سوداگر بھی در اس سوداگر کو مفقود الخیر لکھا تھا ظاہر تھا میں لیکر کہیں لیا ہوگا۔ یہ تین
لفظیہ در چونتیس خطوط بہ دستور میرے پاس میں موجود محفوظ رہیں گے۔ اگر یہ سببہ تقاضا
طلب کرے گا۔ ان خطوط کی نقلیں اس کو اصل تم کو بھیج دوں گا۔ رہ نہ بھڑکے بھٹے
ہوئے کا فہم کو پہنچ جائیں گے۔

اس خط پر ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہی میں
مجموعہ خطوط کی طباعت کا ارادہ ۱۸۶۳ء میں ہی کیا تھا۔
اردوئے معنی کی طباعت ادبی و اعلیٰ مجموعہ کا مرادوئے معنی قرار پایا میرے ذمہ می تبرج
نے اس کا دیباچہ لکھا جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ نسخہ شیخ برہنہ سناہر جوہر کی کوششوں
سے فراہم ہوا تھا۔ اس کی طباعت اکل المطابع میں خزانہ دین کے زیر انتظام شروع
ہوئی تھی۔ غالب اس وقت زندہ تھے۔ لیکن اردوئے معنی کے نسخہ کی عبارت
(مرقومہ قربان علی بیگ سالک) سے معلوم ہوتا ہے کہ طباعت ابن انصام کو
نہیں پہنچی تھی کہ غالب وفات پا گئے۔ سالک کی مرنی تاریخ طبع کا آخری
شعر یہ ہے:-

ہے یہی سال طبع سالِ وفات

آج ان کا سخن تمام ہوا

حقِ ملکیت | غالب نے اردوئے معلّے کا حقِ ملکیت حکیم غلام رضا خاں کے حوالے کر دیا تھا
ان کی اصل تحریر جو صرف پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپی تھی، یہ ہے:-

پیکرِ بے روت و روال، نفیرِ اسلافِ حال، غالب تخلصِ بیچِ مداں کتابت اور لکھ دیتا ہے کہ یہ
"اردوئے معلّے" تصنیفِ فقیرِ طبعِ اکمل المطایع دہلی میں چھپایا ہوا سو میں نے ازراہِ فرہ محبت
اپنا حقِ تالیف نورِ چشم اقبال نشانِ حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے اور اس حق کو خاص
ان کا حق کیا ہے اور کوئی صاحبِ گرانگ اکمل المطایع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع
"اردوئے معلّے" کے پھاپنے کا قصد کریں تو مواخذہ سے غافل نہ رہیں گے اور فوراً حسبِ نشا
قانون بستم سزا پائیں گے

"خود" کی طرح "اردوئے معلّے" کے کچھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بعض ایڈیشنوں میں
غالب کے مزید رقعات شامل کئے گئے ہیں لیکن میں سارے ایڈیشن جمع نہیں کر سکا۔ اسلئے
ان کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔

انکاتِ رقعات | اردو کی لغت تصانیف میں سے تنوعِ تیز کا ذکر قاطع برہان کے ضمن
میں آئے گا۔ کیونکہ وہ قاطع ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ البتہ "انکاتِ رقعات"
کا ذکر اردو تصانیف ہی میں ہونا چاہئے۔ یہ کتاب اگرچہ فارسی زبان کے بعض اصول و
قواعد کے متعلق ہے اور اس میں رقعات بھی سب کے سب فارسی ہیں لیکن اصل کتاب
اردو میں ہے۔ غالب خود فرماتے ہیں کہ یہ پنچ آہنگ کا اردو ترجمہ ہے،

اکہتر برس کا نقذ ان آدمی دنیا میں عزت اور محبت میں نجات کا طرب ترک سلجوتی، اسد اللہ خاں
غالب کہتا ہے تیس برس پہلے میں نے اپنی شریں جمع کیں اور اس کا نام پنچ آہنگ لھا چھا
برس کی عمر میں وہ رسالہ لکھ۔ اب اکتیس برس کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ پنچ آہنگ کی

چوتھی ہفتہ جس میں اس کی صرف کاریاں ہیں اس کے رد ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ اوراق
 ۱۸۶۷ء پر ور قیہ حیات خلق اور کعبہ مال امام تائب مسیح علیہ السلام جامع دانش و
 دوا امر کے مرئی اور علمائے استاد جناب سید القاب میکلور صاحب بہادر فرمانروا کے
 وسیع ملک پنجاب میں سرخوہب لکھنؤ سرخوہب بہادران کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان
 قلب خوش بوال رکاب کی نذر سے جانیں خدا مرے بڑے ترک رہیں کا بیان حضرت کو پسند
 آئے۔ اور یہ رسالہ ان کی زبان سے نکلتا عارف کا نام پائے۔

لیکن میری رائے میں اس ترجمہ قرار دینا صحیح نہیں۔ بہر حال یہ کتاب فردی
 ۱۸۶۷ء میں پیارے لال صاحب اسٹینٹ ماسٹر در سہ و بی کے چھپوائی تھی۔
 اس کے بیس صفحات نکات کیسے وقف ہیں سورہ صفوں میں پندرہ خطوط پھیلے ہوئے
 ہیں۔ بہت ورق غلط نامہ کا ہے۔ یہ صرف ایک مرتبہ محمد سعادت علی خاں کے مطبع
 میں چھپا ہوا ہے۔ بعد میں گھپی تھی۔ اب کہیں نہیں ملتی۔

۱۸۶۷ء میں جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب نے غالباً منشی شیخ مران کی دس ہفتے
 غیر باتل کی تھی کہ غالب اردو نثر میں ایک مستقل کتاب لکھ دیں۔ اس فرمائش کے
 متعلق منشی شیخ مران کو لکھتے ہیں

جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو بھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اردو
 کی ترکیب پر ایک نوے کے ساتھ ان کے احوال سے بھائی فرغور سردار دیں میں اپنے
 فکر کا زور نبھانے کے لئے گا۔ میں عبارت میں حافی نامہ کہیں کر کھڑوں کا سورج رہا ہے

۱۸۶۷ء میں یہ ترتیب موجودہ آہنگ چارم تقریراتوں وغیرہ شتمل ہے درمشار و طیرہ کا بیان۔ ہنگ دوم میں ہے
 ۱۸۶۷ء میں پیارے لال آئوب جہیں بعد میں رائے بہادر کا خطاب مل اور وہ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ممتاز عہدے
 پر فائز رہے یہ اور میری مخلصانہ جہاد یہ کے چچا تھے۔ غالب نہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

کہ کیا لکھوں، کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں۔ تمہاری رائے میں
کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ۔
پھر لکھتے ہیں :-

جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں دو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں
گنجائش عبارت آ۔ لی کی کہاں ہے۔ بہت ہو گا تو یہ ہو گا کہ میرا اردو بہ نسبت اردو کے اردو
کے فصیح ہو گا۔ یہ بہت حال کچھ کروں گا۔ اور اردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا۔

یہ اردو ستمبر ۱۸۵۹ء کی تحریر ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اردو نشر کی
کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ البتہ یورپی کے انگریز انسپکٹر مدارس نے اردو زبان
کی ابتدا کے متعلق ان سے جو تحریر حاصل کی تھی وہ خداجانے کیا ہوئی۔ کاش اس
تحریر کا سراغ نہیں سے مل سکے۔

فارسی دیوان فارسی تصانیف میں سے ہم سب سے پہلے نظم کو لیتے ہیں۔ غالب ۱۸۶۳ء
کے ایک مکتوب میں سید بدرالدین کو لکھتے ہیں :-

فارسی کا دیوان بیس چپیس برس کا عرصہ بڑا چھپا تھا پھر نہیں چھپا۔

۱۸۶۳ء سے چپیس برس نکال دیئے جائیں تو ۱۸۳۸ء باقی رہتے ہیں اگر
غالب کے بتائے ہوئے تخمینہ کو صحیح سمجھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فارسی کا دیوان
پہلی مرتبہ ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ چھپا تھا۔

میرزا علی بخش خاں رنجور پنچ آہنگ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۵۱ھ میں
نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھڑکا پر قضاے آسمانی سے آفت نازل ہوئی :-

بعد ازل ہنگامہ ہم دران ہنگام از جے پور بہ دہلی رسیدم و بہ کاستانہ برادر والا شان و آموزگار

مہربان مولانا غالب زاد افضالہ فرد آمدم جوں دران ایام دیوان فیض عنوان کہ مستے بہ میخانہ آرزو

است تازہ فریم آمدہ دیرایہ تمام پوشیدہ آنچہ از نشر دران ہمایوں صحیفہ صورت ارقام

داشت ہمہ را بہ شدت دلاے آن خسرو اقلیم سخنوری خواندم -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۱ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں غالب کا فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا اور اس کا نام ”میںخانہ آرزو“ رکھا گیا تھا۔ انہوں نے فارسی دیوان کے شانمہ کی نثر میں سال تحریر ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) لکھا ہے۔ لیکن فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی نثریہ مطبعہ دارالسلام دہلی میں چھپا۔ اس کا کوئی نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ۱۸۴۵ء کے بعد غالب جو کچھ لکھتے رہے وہ حسب سابق نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پاس جمع ہوتا رہا۔

کلیات نظم کی طباعت اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ کلام غالب کے جو مجموعے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اہتمام کے ساتھ مرتب کئے تھے وہ سب غدر میں نشت ہو گئے۔ بعد میں نواب مرحوم نے دوبارہ بڑی محنت سے یہ نادر ذخیرہ فراہم کیا۔ ۱۸۶۱ء میں منشی نو لکشور نے مسودہ مٹکا کر چھاپنا شروع کیا۔ غالب کی نشت میں :

منشی نو لکشور نے شہاب الدین خاں (فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں) کو آواز دیا۔

کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، مٹکا کر

اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزد ہیں، یعنی کوئی نہ میر اس سے خارج ہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی طباعت میں بڑی تاخیر ہو گئی۔ غالب میر ہمدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

کلیات کے پھلپے کی حقیقت سنو۔ سات صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحف

بیمار ہو گئے کاپی نویس رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھتے کب چھاپا شروع ہو۔

ایک اور خط میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :

کلیات کے انطباعت کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔

ستمبر ۱۸۶۱ء میں منشی نو لکشور دہلی آئے اور غالب سے بھی ملے اس کے قبل وہ غالباً

اور وہ اخبار میں کلیات کی طباعت کا اعلان کر چکے تھے اور اس کی قیمت سو اتین روپے مقرر کی تھی لیکن بعد کے اعلان میں قیمت بڑھا کر پانچ روپے کر دی۔
غالب نواب علاء الدین احمد خان کو لکھتے ہیں:

شفیق کرم و لطف محسن ہستی نوکتر صاحب سبیل ذاک یہاں آتے مجھ سے اور تم سے چپا (نواب ضیاء الدین احمد خاں) اور تم سے بھی بھائی شہاب الدین احمد خاں سے ملے۔ خاتون نے ان کو زہرو کی صورت اور شری کی سرسٹھالی ہے۔۔۔۔۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہنا تھا اور کلیات کے دس جلد کی قیمت پچاس روپے مان لیتے تھے۔ اب ان سے دفعتی نوکتر سے ذکر آیا۔ انہوں نے پہلی قیمت مشہور اخبار یعنی قبول کی یعنی سو اتین روپے فی جلد اس صورت پر دس جلد کے ساڑھے بیس روپے میں دوں اور ساڑھے بیس روپے تم دو تہی پنیٹھ روپے مطبعہ وہ اخبار میں پہنچانے ہیں۔ میں دسمبر ماہ سال کی دسویں تاریخ کو دہلی پہنچا ہوں گا۔ ہمارے بیس روپے علی حسین کو دے دیں، کہو کہ حضور بھیج دیں۔
میکر: یہ وہ رہو رہا ہے، کلیات ۱۸۶۳ء میں مکمل ہو۔ غالب سید بدر الدین کو
۱۸۶۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

اب مناسب ہے کہ وہ (کلیات) چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی نذر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو پنیٹھ روپے بھیج کر بیس جلدیں منداؤں حبیب آجائیں گے۔ ایک آپ کو بھی بھیج دوں گا۔
۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کو ایک مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں،
کہ تو سطر بر خود ارغی حسین خان بجلد کلیات فارسی پہنچی حیرت ہے کہ چار روپے چار آلے قیمت کتاب قابل۔ انظار مع میں اکثر زہری روپے قیمت اور پانچ آنے انصواب قرار پائے۔
میر چاں سو دیاں سوا۔ میرا حال تمہیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے۔

ایں ہم اندر ماستقی بالائے غمائے گم
اب کے چٹھے میں شاید دس سکوں۔ نومبر ۱۸۶۳ء میں پچاس روپے
تمہارے پاس پچ جاتیں گے۔ انشا اللہ العظیم۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ شروع میں کلیات کی قیمت تین روپے اور محصول ڈاک چار آنے قرار پایا تھا۔ لیکن بعد ازاں چار روپے کا اعلان ہو گیا۔ اور کتاب چھپی تو اس کی قیمت پانچ روپے اور محصول ڈاک پانچ آنے ہٹا دیا۔ غالب کے ساتھ وعدہ یہ تھا کہ انہیں سوائس ہی روپے میں کتاب ملے گی لیکن انہیں بھی پانچ روپے دینے پڑے۔

ستمبر ۱۸۶۳ء میں غالب کے پاس کلیات کا پہلا مطبوعہ نسخہ آیا تھا۔ اسی مہینے میں انہوں نے ایک نسخہ مولوی مؤید الدین خاں کی وساطت سے نواب مختار الملک سرسار جنگ اول وزیر اعظم حیدر آباد کے پاس بھیجا۔ منشی عبید اللہ خاں ذکا کے نام کے ایک مکتوب ۱۵ مئی ۱۸۶۳ء میں اپنے اور مولوی مؤید الدین خاں کے بزرگوں کے گہرے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اب آپ (ذکا) سے یہ جانتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے جس اور ان کو یہ خط پیشہ نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کے پارس کا ان کے پاس پہنچا ان کے ذریعہ غلامت سے اس مجلد کا حضرت ننگ رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور پھر اس سزا نے کے بعد واقع ہو کر یافت کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔

کلیات کے انطباق کی جتنی تاہنیں کہی گئیں ان میں سے میر محمد علی مجروح کی تاریخ ۱۲۷۸ھ کی ہے، البتہ سب تاریخیں ۱۲۷۹ھ کی ہیں۔ ایک تاریخ عیسوی ہے جس سے ۱۸۶۳ء نکلتے ہیں۔

مثنوی، برگہ بار | غالب نے شاہ نامہ اور سکندریہ کی بجز ہیں غزوات نبوی کو نظم کرنے کا

سہ ۱۲۷۸ھ از ۵ جولائی ۱۸۶۲ء تا ۲ جولائی ۱۸۶۳ء ۱۲۷۹ھ از ۲۹ جون ۱۸۶۳ء تا ۱۸ جون ۱۸۶۳ء

ہوتا ہے کہ میر محمد علی مجروح نے پہلے تاریخ نگار محمد علی قلی اور اس وقت مکان تھا کہ کلیات ۱۸۶۳ء میں چھپ جائے گا۔ باقی تاریخیں بعد میں لکھی گئیں۔

ارادہ کیا تھا۔ لیکن تمہیدات و مقدمات ہی مکمل ہو سکے۔ اس نا تمام مثنوی کا نام
 "ابر گہر بار" ہے یہ کلیات نظم فارسی میں شامل تھی۔ لیکن ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء
 میں حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر اسے الگ چھاپٹ کی اجازت دے دی چنانچہ
 یہ نسخہ اکمل المطابع میں میر فتح الدین کے زیر اہتمام چھپا اس میں دو قصیدے تین
 قطعے اور دس رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ یہ کلام کلیات کی طباعت کے بعد کہا
 گیا تھا جب سب چھپیں "چھپی تو یہ اس میں شامل ہو گیا۔"

"سب چھپیں" غالب کے ان فارسی اشعار کا مجموعہ ہے جو کلیات کی طباعت کے بعد کہے
 گئے یا نواب ضیاء الدین احمد خاں کے فراہم کئے ہوئے اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے جو مثنوی
 نو لکھنؤ کے مطبع میں بغرض طباعت بھیجا گیا تھا۔ غالب خود اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:
 سب چھپیں میوہ را گویند کہ پایان دسم بہ شاخسارے ماند و جوں آن را بر چنیند شاخسار
 بہ بارمان۔ ہر آئینہ آنچہ پس از انطباق کلیات فارسی اغتہ شد و آنچہ یارن از دیریں و ادات
 داشتند و من از آن خبر نہ داشتند و ایک بہ ن برسانند و راق جدا گانہ ضبط کردہ شد۔
 و ان را "سب چھپیں" نام نہادہ ام۔
 آخر میں لکھتے ہیں:-

اکوئے ناسور کہن را تراوش نمازند کلک از کف فرد گزاشتم ام۔ سپس اگر سخنے در اندیشہ
 خواہد نرشت رد شناس صفحہ نخواہ گشت۔

یہ مجموعہ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ راجست ۱۸۶۷ء میں چھپا۔ بعد میں بہت
 کمباب ہو گیا۔ میرے عزیز دوست مالک رام صاحب ایم۔ اے مولف "ذکر غالب"
 کی سعی سے دوبارہ چھپ گیا ہے۔ اس میں غالب کا مشہور ترسیہ "بھی ہے۔"
 پنج آہنگ "پنج آہنگ" غالب کے کلیات نشر کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے پانچ حصے
 ہیں اسی وجہ سے "پنج آہنگ" نام رکھا گیا۔ حصہ اول میں آداب و القاب وغیرہ ہیں

حصہ دوم میں فارسی لغات کے مصطلحات و مصادر ہیں۔ حصہ سوم میں دیوان غالب سے منتخب اشعار جمع کر دیئے گئے ہیں تاکہ کاتب خط کو کسی مدعا کے لئے کوئی شعر مطلوب ہو تو اس مجموعہ سے فائدہ اٹھاسکے۔ حصہ چہارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور مختلف نشریں ہیں۔ حصہ پنجم غالب کے فارسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ و ۱۲۳۵ھ میں جب انگریزی لشکر بھرت پور پر حملہ آور تھا تو نواب احمد بخش خاں مرحوم کے دستے کے ساتھ غالب اور میرزا علی بخش خاں رنجور بھی تھے۔ رنجور نے غالب سے درخواست کی کہ :

آداب و القاب متعارفہ رسمہ بردے ہم رنجستہ و الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم باہم
آبختہ برائے نامہ نگاراں دستور العمل موخرے ساختہ آید۔

غالب اپنے انداز تحریر کے متعلق فرماتے ہیں :

ہوں کلک و ورق بہ کف گیرم مکتوب الیہ را بہ لفظی کہ فراخور حالت ادست در سر آغاز
صفحہ آواز و ہم وز مزمرہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریب گوئی و عافیت جوئی
حشود زائد است و پختگان حشود دفع نہنند۔ لیکن خاطر نازک پڑدہندہ۔

میرزا علی بخش خاں (عزیز بود) فرمایش از راہ گوش بہ دل دریافت ۔

گویا اس کتاب کے پہلے دو حصے میرزا علی بخش خاں کی فرمایش پر مرتب ہوئے
تیسرے اور چوتھے حصہ کی ترتیب میرزا علی بخش خاں نے کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں
نے نشریں جمع کر لی تھیں۔ اور سب کو مدون کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فرصت نہ مل سکی
حکیم رضی الدین حسن خاں بھی ترتیب پر مہر تھے۔ نیز مجھے خیال آیا کہ اگر یہ سب چیزیں
یکجا ہو جائیں گی تو میرا بیٹا غلام فخر الدین ان سے فائدہ اٹھاسکے گا۔

غدر سے پیشتر پنج آہنگ دو مرتبہ چھپ چکی تھی۔ ایک مرتبہ پادشاہی چھاپہ خانہ میں
دوسری مرتبہ منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ میں۔ غالب منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں،
پنج آہنگ تم نے مول لے لی۔ چھاپا دو چھاپے میں، ایک پادشاہی چھپہ خانہ کا ایک منشی
نور الدین کے چھاپہ خانہ کا پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں،

چھاپے کی پنج آہنگیں بہ بھی کمزور ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد از انطباع

از قسمہ نشر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں دوسرے کالی نویس نے وہ اصلاح میری ضروری ہے کہ

میراجی جانتا ہے اگر مول کوئی سطر غلطی سے لکھا گیا ہے تو اعتراض سببے مبالغہ ہے کہ کوئی صفحہ غلط سے غلط نہیں۔

پنج آہنگ کے خاتمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی نور کشور دہلی آئے تھے۔

تو غالب کی ساری نشریں بغرض طباعت لے گئے تھے۔ یہ مجموعہ پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء

میں مطبع نور کشور میں چھپا۔ اس میں پنج آہنگ کے علاوہ مہر نیمروز اور دستنبو بھی شامل ہیں،

”مہر نیمروز“ ابوظفر بہادر شاہ نے تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کرانے کا ارادہ کیا تھا۔

حکیم آسن اللہ شاہ واقعات جمع کرتے تھے۔ غالب اس خدمت پر مامور ہوئے کہ حکیم

صاحب کے فراہم کردہ واقعات کو اپنی بہار آفریں عبارت کا لباس پہنا دیں۔ قلعہ

کے ساتھ غالب کے تعلقات ملازمت کا آغاز اسی سے ہوا۔ پوری کتاب کا نام ”پرتوستان“

رکھا گیا تھا۔ اس کے دو حصے تیار ہوئے تھے حصہ اول کا نام ”مہر نیمروز“ قرار پایا تھا۔

اس میں ابتداء آفرینش سے لے کر بھائیوں پادشاہ کے انتقال تک مغلیہ خاندان کے

پورے حالات لکھے گئے۔ حصہ دوم میں اکبر کی تخت نشینی سے بیکر بہادر شاہ تک کے حالات

لکھنے کا فیصلہ تھا۔ اس کا نام ”ماہ نیم ماہ“ رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ

خاندان مغلیہ کی بساط لپیٹی گئی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ”مہر نیمروز“ کی

ساتھ غالب کو اس نام پر بڑا ناز تھا اور یہ واقعہ ہے کہ چودھویں کے چاند کو ”ماہ نیم ماہ“ سب سے پہلے غالب نے کہا۔

جو تاریخ کی ہے اس میں طباعت کا سال ۱۲۷۱ھ و مطابق ۱۸۵۶ء بتایا گیا ہے
 یہ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۵۶ء کو شائع ہوئی تھی۔
 چونکہ "مہر نمرود" میں "ماہ نیم ماہ" بھی ذکر تھا اس لئے شائقین دوسرا حصہ
 طلب کرتے رہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں۔

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے "ماہ نیم ماہ" کے بھیجے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا
 ہوں کہ جب "مہر نمرود" کی عبارت ہیں سمجھے تو "ماہ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب "مہر نمرود"
 کے دباؤ میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "برقوتستان" ہے اور اس کے دو جلد ہیں
 پہلی جلد میں ابتدا و ملت نام سے ہایوں کی سلطنت تک کا ذکر، دوسری میں اکبر سے
 بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان پہلے حصہ کا نام "مہر نمرود" دوسرے حصے کا نام "ماہ نیم ماہ"
 پہلا حصہ چھاپا گیا، بابا بجا بھیجا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ
 امیر قریب کا نام و نشان مرث گیا۔

رستہ "اوستنبو" کے متعلق غالب کے مکاتیب میں سب سے زیادہ ذکر ہے بالخصوص ہر نوپال قفسہ

سے میرے پاس "مہر نمرود" کا نسخہ موجود ہے۔ اس کے کل ۱۱۰ صفحے ہیں ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں اور ہر سطر میں قریباً ۲
 لفظ ہیں سرورق کے پہلے صفحہ پر کتاب کا نام ہے۔ دوسرے صفحے سے کتاب شروع ہو کر ساتھے صفحہ پہنچتی ہے صفحہ ۱۱۱ علامہ نامہ
 کیلئے وقف ہے بقیہ صفحات میں نواب صیاد الدین احمد خاں کی متقدمہ تقریر و زیارت ہے، شرقی کی پیشانی پر بعد ہمارہ کی
 مہر کا نقشہ ہے پھر عبارت درج ہے بحول قوت فیماں سلطان سلطنت جدیدہ حسب خدمت حضرت سلطان فیتہ شاہ باگاہ، بنگلہ سیاح چشمہ و مرغ
 و دمان گورگانی ثانی صاحب قرآن ثانی سلطان محمد بن فتح شاہ اکبر بہادر و ام قبلا، اس کتاب منطاب نم نام مہر عالم انور حادی
 حالات عالم از ابتدائے افریش، محمد فرمانروائی حضرت نصیر الدین بایول پادشاہ مومون بہر نیمروز گاندیشہ عجاز پیشہ نواب
 محلہ القاب عطار و نظیر کتاب نمیر نوح سفینہ سخن کلید طور معنی، جمال و لا ویر مدد سداۃ راس بہادر نظام جنگ، غالب شخص
 مشرق آن است بیرج و بخشی نواب سابق الاقاب زخیر المطابع، عام بہد در گاہ حافظ عبد اللہ بہ پیرایہ الطبع بلوہ کرشد۔

حاتم علی بیگ قہر، شیونرائن آرام مالک مطبع مفید خلائق اگرہ اور نبی بخش حقیر کے نام کے خطوں میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ کتاب غدر کے حالات کے متعلق لکھی گئی تھی۔ اور التزام کیا تھا کہ عربی کا کوئی لفظ نہ آئے یہ غدر کی مستقل تاریخ نہیں بلکہ اس میں صرف وہ واقعات درج ہیں جو غالب کو اور ان سے علاقہ رکھنے والوں کو پیش آئے یا غالب نے سنے۔ وہ خود لکھتے ہیں،

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد ہوا میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند کیا، در آنا جانا موقوف کر دیا بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی جو سنایا وہ بھی ضمیر سرگزشت کرتا گیا۔

غدر کے بعد وہی میں کوئی مطبع باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے ”دستنب“ کو اگرہ میں چھپانے کا قصد کیا۔ منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں :

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ ہینے کا حال نشر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ وساتیر کی عبارت یعنی پاریسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی آئینہ لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو میں لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام ہرگوپال ہے ”منشی“ لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ ”شیوا زبان“ لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعہ کا ہے، یعنی نہ چھدرا نہ گنجان اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں بیس سطر کسی میں بائیس سطر، کسی میں انیس سطر آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں ایک ہے اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں۔ اگر اگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع دو۔ اس تہید سستی اور بے لڑائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں لیکن صاحب مطبع لکھنؤ پر

کیوں ماننے لگا اور البتہ چاہیے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پانسو سات سو چھاپنے کی صورت میں سوائین آنے چار آنے قیمت بڑے کاپی تو ایک ہی ہوگی۔ رہا کاغذ وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی حاشیہ پر البتہ صفحات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا ٹکدہ مہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔

نواب انور الدولہ کے نام کے ایک خط کا مضمون بھی قریباً یہی ہے، نیز اس میں فرماتے ہیں کہ پندرہ سطر کے سطر سے چار جزو کی کتاب بنے گی اور مطبع مفید خلافت اگرہ میں چھپنے کو گئی ہے۔

کتاب کا حجم اگرچہ ابتدائی خط میں تفتہ کو لکھا تھا کہ کوئی نجان لکھے گا تو کتاب دو جزو میں آجائے گی۔ لیکن آرزو یہ تھی کہ حجم زیادہ ہو۔ وہ خود کہتے ہیں، میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آجائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔

طباعت میں، ہتمام چاہتے تھے کہ کتاب چھپی۔ تفتہ کے علاوہ منشی نبی بخش حقیر اور میرزا حاتم علی بیگ مہر کو بھی طباعت کے اہتمام میں شریک کر دیا تھا یا غالب کے لفظوں میں ان سب کی نسل بنادی گئی تھی۔ کاپی دیکھنے کے ذمہ دار منشی نبی بخش تھے جو کام کے لئے پسند عمدہ مجلد نسخے مطلوب تھے جلدوں کے نگران میرزا مہر تھے اور تفتہ کے ذمہ عام اہتمام تھا جو حقیر کے صاحبزادے منشی عبداللطیف بڑے اچھے صحافی تھے۔ ان کو جلدوں کی وضع و ہیئت کے متعلق تفصیلی ہدایات بھیج دی تھیں۔ اہتمام کا یہ عالم تھا کہ اگر تفتہ کو ایک بات لکھتے۔ تو وہی بات مہر اور حقیر اور منشی شیونرائن مالک مطبع کو بھی تحریر فرماتے۔ ایک خط میں تفتہ کو ارشاد فرماتے ہیں،

صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے اڑا ہے اور پھر کام کیساتھ جس میں میری جان لکھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو ورنہ بہ دل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی (منشی حقیر) کا ہو گیا ہے۔ چھ جلد کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دُعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں تصحیح بھائی اور ترمیم تم کرو۔ کتا ہوں مگر نہیں جانتا ترمیم کیوں کر کی جائے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جو دل بھی کچھ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صنائی اور ہشیاری میرے کس دن کام آئے گی۔

صحافی اور نقاشی | تفتہ نے غالباً لکھا تھا کہ صحافی اور نقاشی اپنے سامنے دہلی میں کرا لیجئے۔ جواب میں لکھتے ہیں،

میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچے بند تو میر نہیں۔ صحاف اور نقاش کہاں؟ جو شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ میں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ جلدوں کے متعلق پھر فرماتے ہیں،

یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ دو روپے فی جلد اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے ہندوی بھیج دوں گا۔ چھ روپے اکٹھے روپے دس روپے حد بارہ روپے۔ میاں کو سمجھا دینا کسی کی طرف نہ کریں چیز اچھی ہو۔

”نہیب“ کا نہیب | غالب نے جو مسودہ بھیجا تھا۔ اس کی حمد یہ عبارت میں یہ فقرہ تھا،

آرے خداوند چنانکہ نیست راستی رہ است پند میرفتہ را نیست ساز نیز تو اندر

آنکہ ہمہ را در یک دم بہ نژید بشود کن (پدید آرد اگر در دم دیگر بہ نہیب مباحث
(نہیست ہو جا) بہم زندہ زہرہ کراست کہ از چون دچرا دم زندہ ۔

”نہیب“ عربی لفظ تھا جو غالباً ابتدا میں لکھا گیا۔ نظر ثانی میں اس کی جگہ ”نوا“
بنادیا گیا۔ لیکن جو مسودہ طباعت کیلئے اگرہ بھیجا تھا۔ اس میں نہیب ہی درج ہو گیا۔
اس سہو پر وہ پڑے پریشان ہوئے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :

میں منشی شیونیرائن کو آج صبح لکھ چکا ہوں۔ تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے کے اول یہ جملہ
ہے اگر در دم دیگر نہیب مباحث زندہ نہیب کی جگہ نوا سے بنادیا جائے۔ ”نہیب“ لفظ
عربی ہے اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ نیز چاقو کی نوک سے ”نہیب“ کا
لفظ چھیدا جائے اور اسی جگہ نوا لکھ دیا جائے۔

تفتہ کی تحریر سے غالب نے شاید یہ سمجھا تھا کہ نہیب والے ورق چھپ
چکے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

نہیب والے دو ورقے چار سو ہوں پانسو ہوں سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان
ہو مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے سے ساری کتاب نکمی ہو جائے گی۔
اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودہ میں بنادیا
تھا، لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

پھر فرماتے ہیں :

”نہیب“ کے نہیب سے مراد جاتا ہوں اس کی درستی کی خبر بھیجو۔

مزید ہدایات | مزید ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً
اصل نسخہ میں سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ خدا کرے
انجام تک یہی قلم یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلی جائے۔ جدول مطبوع ہے پہلے

صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر قریب ہوگی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنیچ کاغذ اچھا ہے چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چار شیورام پوری اور چار ہونیبلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں وہ اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری یا نیبلے کاغذ پر یہ تکلف محض ہے۔ وہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر ہوں۔ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو تو خیر دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیورام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور روشن شدہ ہو۔ اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔

جلدوں کی آرائش | معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قہر نے جلدوں کی آرائش کا نقشہ غالب کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں،

سبحان اللہ جلدوں کی آرائش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے میرے دل میں بھی ایسی ہی ایسی باتیں تھیں یقین ہے کہ متاع شاہوار ہو جائے گی۔ امار مرہ اگر ہو جائے تو صرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں رہے۔ بارہ روپے کی ہنڈی پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھے اطلاع دیجئے گا۔ ورنہ میں مشوش رہوں گا۔

ملکہ کوٹہرہ کا قصیدہ | اس دوران میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہہ لیا تھا۔ پہلے خیال تھا کہ قصیدہ علیحدہ ملکہ کی خدمت میں بھیجا جائے اور کتاب علیحدہ جائے۔ پھر پرائے ٹھہری کہ قصیدہ بھی کتاب کے ساتھ چھپے چنانچہ میرزا قہر لکھتے ہیں،

میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے (مشتعل) تہنیت فتح و عملداری شاہی۔ ساٹھ بیت ہے منظوریہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذتب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے۔

یعنی چھاپا ہوئی ہے یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے آپ اور منشی نبی بخش اور میرزا آقہ منشی شیونرائن سے کہہ کر اسکا طور درست کریں پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔
میرزا مہر نے غالباً لکھا تھا کہ کیا اسے نشر کا دیباچہ بنا دیا جائے؟
اس کے جواب میں فرماتے ہیں،

قصیدہ کا نشر سے پہلے لگانا ازراہ اکرام و اعزاز ہے ورنہ نشر میں اور صنعت اور نظم میں اور انداز ہے یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی بول ہو کہ سررشتہ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدہ اور دشتنبو کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

مسدہ سرورق مالک مطبع نے اسی زمانے میں غالب کو خط لکھا تھا جس پر پتہ یوں مرقوم تھا۔ "میرزا نوشہ صاحب غالب"۔ غالب اس پر بہت پریشان ہوئے کہ کہیں کتاب کے سرورق پر یہی نام نہ چھپ جائے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں،

آیا پنج آہنگ یا "مہر نمرود" چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر میں (اگرہ میں) نہیں پہنچی جو وہ (منشی شیونرائن) میرا نام دیکھ لیتے؛ صرف اپنی نفرت صرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے، بلکہ سبب یہ ہے کہ وہی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک وزراء کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ اگر صاحب مطبع نے "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا، میری محنت رائیگاں گئی۔ کتاب اور کی ہو گئی۔

کتاب کا اشتہار اس دوران میں غالب نے یہ تحریک بھی کی کہ کتاب کا اشتہار پہلے سے چھپنے لگے۔

ہمارے منشی شیونرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کا اشتہار کیوں نہیں

چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداری کی فراہم ہو جائیں۔

کتاب کے مصارف | اندور کے ایک امیر رائے امید سنگھ تھے جنہوں نے ”دستنبو“ کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا تھا، ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ ان میں سے پچیس جلدیں انہیں دی جائیں بقیہ جلدیں غالب اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیں۔ یہی خریداری حقیقت میں ”دستنبو“ کی طباعت کا ذریعہ بنی تھی۔ مجروح کو لکھتے ہیں،

میں کیا باتیں کرتے ہو! میں کتابیں کہاں سے چھو آتا، روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں..... منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھی۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ اگر وہ میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفسہ تھا اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجی گیا۔ آٹھ آنے قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریق ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بہ شمول سعی منشی ہرگوپال تفسہ چھاپنا شروع کیا۔ اگر وہ حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہیے ہے حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں سے پچیس جلد منشی امید سنگھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں میں بانٹ دوں گا۔

ممانعت طبع کا اعلان | غالب کو کتاب کے حقوق محفوظ کرنے کا بھی بڑا خیال تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ کتاب کے آخر میں ممانعت طبع کا اعلان کر دیا جائے۔ پھر تفسہ اور شیونرائٹن کی فرمائش پر خود یہ عبارت تجویز کر بھیجی :

نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے۔ اس کو میں نے مطبع مفید ثلاثی میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا قاعدہ یہ قرار پایا ہے کہ اور صاحب مطبع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں اپنے مطبع میں چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

منقش و مجلد نسخے | میرزا مہر نے صحافی اور نقاشی کے لئے جو کتابیں رکھ لی تھیں وہ پہنچیں تو غالب بہت خوش ہوئے۔ فرماتے ہیں :-

بھائی جان! کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ وقتِ شام

سات جلدوں کا پارسل پہنچا

واہ کیا خوب بر محل پہنچا

..... میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بتاؤ تو

میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی

ہوئی۔ دو کی نوچیں زریں اور پانچ نوچیں سیاہ تلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور میں بھی

گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔

”دستنبو“ کہاں کی! ہر حال غالب نے ”دستنبو“ کی جلدیں حکام اور دوستوں میں تقسیم

کیں ایک مکتوب سے جو اپریل ۱۸۵۹ء کا مرقومہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک

”دستنبو“ کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔ غالب کا خیال تھا کہ ”دستنبو“ یا تو انگریزوں نے زیادہ

خریدی ہوگی یا اہل پنجاب نے ہنسی شیونرائٹن سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ زیادہ تر

پنجاب والوں ہی نے خریدی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن غالب کی اجازت سے

۱۸۶۵ء میں لٹرییری سوسائٹی روہیلکنڈ کے مطبع واقع بریلی میں چھپا تیسرا ایڈیشن

بھی اسی مطبع نے ۱۸۷۱ء میں چھاپا۔ اس کے بعد میرے علم کے مطابق ”دستنبو“ الگ

شائع نہیں ہوئی۔ میرے پاس ۱۸۷۱ء والا ایڈیشن ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ پنج آہنگ مہر نیروز اور ”دستنبو“ کے مجموعہ کا نام

کلیاتِ نشر ہے۔ یہ کلیات پہلی بار ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔ تیسری بار ۱۸۸۴ء میں

شائع ہوا۔ اس کے بعد غالباً کوئی ایڈیشن نہیں چھپا۔

”قاطع بریلان“ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے دنوں میں غالب خانہ نشین ہو گئے تھے

ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد شہر والوں بالخصوص مسلمانوں پر مدت تک جو گونا گوں مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ان کا نقشہ غدر کے باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں دوستوں کی صحبتوں سے بڑی حد تک محروم ہو گئے تھے۔ اور ان کا زیادہ وقت تنہائی میں گزرتا تھا۔ کچھ مدت تک وہ ”دستنبذ“ کی ترتیب میں مصروف رہے۔ اس سے فراغت پائی تو مطالعہ کے سوا وقت گزارنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کے پاس صرف ”برہان قاطع“ تھی جو فارسی لغات کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اور جس کے مولف محمد حسین ہیں۔ یہ تبریزی مشہور تھے۔ اس لئے کہ ان کے آباؤ اجداد تبریز سے ہندوستان آئے تھے لیکن وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور دکن میں ان کی ساری عمر گزری اسی وجہ سے غالب ان کو ”جا بجا“ و ”کنی“ کہتے ہیں۔

”برہان“ کو دیکھتے دیکھتے اس میں جو غلطیاں نظر آئیں ان کے متعلق کتاب کے حاشیے پر اشارات لکھتے گئے۔ اس طرح ایک اچھے رسالے کا مواد فراہم ہو گیا۔ جسے غالب نے اپنے شاگردوں اور عام فارسی دانوں کے فائدے کے لئے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا۔ وہ خود فرماتے ہیں،

برگاہ غم تنہائی زور آور دئے ”برہان قاطع“ را نگرستے۔ چوں آن سفینہ گفتار ٹائے نادرست داشت و مردم را از راہ مے برد و من آئین آموز گاری داشتہم بر پیر و ان خودم لستہ جادہ نمایاں ساختہم تا بجے را بہر ہنوبند

غالب نے اپنی کتاب کا نام ”قاطع برہان“ رکھا۔ یہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں مکمل ہوئی۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

اسے ”برہان قاطع“ کے جس نسخہ سے غالب نے ”قاطع برہان“ مرتب کی تھی اور جس کے حاشیہ پر ان کے لکھے ہوئے اشارات ہیں وہ اس وقت والی لویا رو کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

یافت چوں گوشمال زیر تحریر آنکہ برہان "قاطعش" نام است
 شد مسمیٰ بہ "قاطع برہان" درس الفاظ "سال اقام است
 اردو کے ایک خط میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:
 اس در ماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہان قاطع" میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا
 کرتا تھا۔ ہزار لغت غلط ہزار بیان لغو عبارت پوچ اشارت پاور ہوا، میں نے
 سو دس لغت کے غلط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا
 ہے۔ چھپوانے کا مقدر نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف کر دیا ہے۔ اگر کو تو بہ سبیل
 مستعار بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف
 ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

"قاطع کی طباعت" ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں چھپی۔ ایک خط سے معلوم ہوتا
 ہے نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے اس غرض کے لئے دو سو روپے مرحمت
 فرمائے تھے لیکن "قاطع" کے خاتمہ پر غالب نے جو عبارت لکھی اس سے ظاہر ہوتا ہے
 کہ کتاب منشی نو لکشور کی توجہ اور مہربانی سے چھپی تھی۔

اگر ایں جو انرد بیدار دل بسن شیرازہ دراق پرستان نہ پرداختہ کاغذ مسودات
 "قاطع برہان" یا کاغذ گربورے و باب آغذہ ذر کوختہ یا سرمہ فروش خریدے تا چکسہ ہاساختہ
 بہ ہر حال "قاطع نو لکشور" کے مطبع میں چھپی اور ایک روپیہ اس کی قیمت ظہری
 غالب مجروح کو لکھتے ہیں،

"قاطع برہان" کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بہ طریق نمونہ آگئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی
 درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو پچاس جلدیں منگاؤں دیکھئے نو من

۱۲۷۹ھ ۳۰ چودھری عبد الغفور سردرسد خواجہ عالی نے فرمایا کہ قاطع برہان پہلی مرتبہ ۱۲۷۹ھ میں شائع ہوئی
 دوسری مرتبہ اسے ۱۲۷۸ھ میں اضافہ دیگر مضامین فوائد چھاپا گیا یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں ۱۲۷۹ھ کے اضافے کاغذ
 بنائے والا ۱۲۷۸ھ بڑیاں۔

تیل کب میسر آئے اور رادھا کب ناپچے ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے جو دو سو روپے سلسلہ طباعت
”قاطع“ بھیجے تھے دوسری ضروریات میں صرف ہو گئے۔ کتاب منشی لڑکشور نے چھاپ
دی اور غالب کو سچا س جلد میں خریدنے کیلئے روپیہ کا انتظام کرنا پڑا۔

”قاطع“ کی مخالفت کا طوفان | ہندوستان کے عام فارسی والوں کے متعلق غالب کی سخت
رائے نے ۱۸۲۹ء میں ان کے خلاف کلکتہ میں جو ہنگامہ بپا کیا تھا وہ ”قاطع برہان“
کی اشاعت پر زیادہ شدت و وسعت کے ساتھ دوبارہ اُبل پڑا اور غالب کو تاہم نسبت
اس سے نجات نہ ملی۔ خواجہ خاں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس زمانے میں تقلید محض
مذہب میں بلکہ ہر فن ہر کام اور ہر چیز میں اس درجہ ضروری ہو گئی تھی کہ تحقیق کا خیال
نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا تھا اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ وہ
سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ چنانچہ ”قاطع“ کے شائع ہوتے ہی باند خیال
مقلدوں کے شکر غالب کے خلاف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے
کوئی یہ سوچنے کیلئے تیار نہ تھا کہ غالب نے کیا لکھا ہے یا اصول فارسی کے لحاظ سے
اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ سب محض اس وجہ سے جوش میں آ گئے کہ غالب
کو صاحب ”برہان قاطع“ کے خلاف زبان کشا ہونے کی جرأت کیونکر ہوئی؛ اس سلسلے
میں غریب غالب نے چھوٹے پیمانے پر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت
کیں جو تقلید و جمود کے راستے سے الگ ہو کر چلنے والوں کو ہر عہد اور ہر دائرے
میں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں۔

”قاطع“ کی دو کیلئے پانچ اوصاف کی ضرورت | غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس شخص میں پانچ

باتیں ہوں گی وہ قاطع برہان کی داد دیگا ورنہ عام آدمی محض برہان قاطع کے نام پر جانیں قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں گے۔ پانچ باتیں یہ ہیں،

(۱) عالم ہو۔

(۲) فن لغت کو جانتا ہو۔

(۳) فارسی زبان کا کافی علم رکھتا ہو۔ اس زبان سے اسے لگاؤ ہو، اساتذہ سلف کا کافی کلام دیکھ چکا ہو اور اسے کچھ یاد بھی ہو۔

(۴) منصف مزاج ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

(۵) طبع سلیم اور ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔

مخالفین کے ایرادات ا قاطع کے چھپتے ہی جو حالت پیدا ہو گئی، اس کا نقشہ غالب مندرجہ ذیل لفظوں میں پیش کرتے ہیں :

معتقدان برہان قاطع برہمچیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قاطع برہان غلط ہے، یعنی ترکیب خلاف قاعدہ ہے۔ برہان قاطع نہیں ہو سکتی۔ اور صاحب برہان قاطع صحیح اور قاطع برہان غلط برہان قطع کی فاعل ہو سکتی ہے۔ اور قطع کا فعل آپ قبول نہیں کرتی۔ قاطع برہان میں جو برہان کا لفظ ہے مخفف برہان قاطع ہے۔ برہان قاطع کے، دو کو قطع سمجھ کر قاطع برہان نام رکھا تو کیا گناہ ہوا۔ دوسرا ایراد یہ ہے کہ بانگلشیان ستیز بے جا، انگلش کالون تلفظ میں نہیں آتا

سہ غالب نے قاطع کے آغاز میں ترتیب کتاب کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے غدر کے ذکر میں ایک قطع لکھا تھا جس کے ایک مصرعہ پر محولہ بالا اعتراض ہوا قطعہ یہ ہے :

چوں کرد سپاہ بند در ہند بانگلشیان ستیز بے جا

تاریخ وقوع اس وقائع واقع شدہ رستخیز بے جا

میں پوچھتا ہوں خدا کے واسطے انگلش اور انگریز کانن بہ اعلان کہاں ہے اگر ہے
بھی تو ضرورت شعر کے واسطے۔ لغات عربی میں سکون و حرکت کو بدل دیتے ہیں اگر
انگلش کے وزن کو غنہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا؟

دوسری جگہ فرماتے ہیں،

”قاطع برہان“ کا لکھنا کیا ہے گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا ہے لکھنا کیا ہے سہلم ملا
کا بدن ہوا کہ یہ تنگ مایہ معارض کا برسلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ”قاطع برہان“
کی ترکیب غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ”برہان قاطع“ اور ”قاطع برہان“ کی ایک نمط ہے ”برہان قاطع“
نے کیا لٹھا مینو، مین سکھ قطع کیا ہے، جو آپ نے اس کو قاطع کا لقب دیا ہے؟ برہان
جب تک غیر کے کسی برہان کو قطع نہ کرے کیونکر ”برہان قاطع“ کا نام پائے گی؟ ”برہان قاطع“
کی صحت میں جتنی تقریر کیجئے گا۔ وہ ”قاطع برہان“ کی صحت ہونے کے کام آئے گی۔

مخالف و موافق کتابیں | ”قاطع برہان“ کی مخالفت میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی

فہرست میری تحقیقات کے مطابق یہ ہے۔

(۱) ”مُحَرَّق قَاطِع“ مؤلف مولوی سعادت علی۔

(۲) ”سَاطِعِ بَرہان“ مؤلف میرزا رحیم بیگ۔

(۳) ”قَاطِعِ القَاطِع“ مؤلف مولوی امین الدین پشیالوی۔

(۴) ”مَوْدُ بَرہان“ مؤلف مولوی آغا احمد علی۔

غالب نے اور غالب کے دوستوں اور مؤندوں نے جواب میں جو

رسالے لکھے ان کے نام یہ ہیں :

(۱) ”دافعِ بَدِیہان“ مؤلف مولوی نجف علی۔

(۲) ”لطائفِ غیبی“۔

(۳) ”سوالاتِ عبدالکریم“۔

(۴) نامہ غالبؒ مولفہ غالب -

(۵) "تسخیر تیز" مولفہ غالب -

محرّق قاطع | یہ پہلی کتاب ہے جو قاطعؒ کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کے مولف مولوی سعادت علی پہلے راجپوتانہ ریزیڈنسی میں میسنٹری تھے، پنشن لیکر دہلی میں مقیم ہو گئے کتاب فارسی میں ہے، خاتمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے یکم محرم الحرام ۱۲۸۰ھ (۱۸ جون ۱۸۶۳ء) کو جمعہ کے دن اس کی تسوید سے فراغت پائی۔ ۱۸۶۳ء میں یہ شاہدرہ (دہلی) کے مطبع احمدی میں چھپی، ضخامت ۹۶ صفحے ہے۔ میں نے مطبوعہ کتاب نہیں دیکھی۔ اس کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ شیخ احمد کاتب نے تاریخ طبع میں مندرجہ ذیل قطعہ کہا:

آنکس کہ ز اقوال بزرگان سر تافت حرف تشیع در حق ایناں بنگاشت
مے دان بحق خولشتن امروزاں حرف دیروز کہ از پے کساناں پنداشت
اس میں بقول مصنف "صنعت یہ ہے کہ چار مصرعوں کے پہلے حرف جوڑے جائیں تو صاحب قطعہ کا نام بن جاتا ہے اور چار مصرعوں کے آخری حرفوں کے اعداد جمع کئے جائیں تو تاریخ طبع (۱۲۸۰ھ) نکل آتی ہے۔ ویسے قطع کی مہمیت محتاج بیان۔ اس کتاب کے متعلق غائب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں،

اٹا "محرّق قاطع" کا شمارے پاس پہنچنا ع

کلمے کہ خواستم ز خدا شد میسر

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا، ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کئے۔ وہ طالب علموں نے اردو میں دور سا مہم چڑھا لکھے

دانا ہوا اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ
 احمق "دافع ہدیان" سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق
 کو دھونڈا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے "دافع ہدیان" سوالات "لطائف غیبی"
 تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ یقین ہے کہ
 بہ تقدیم و تاخیر دو روز نظر انداز سے گزریں۔

یہ خط ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "محرَق قاطع" کی طرح
 اس کے جواب میں جو رسائل لکھے گئے تھے وہ بھی ۱۸۶۴ء ہی میں چھپ گئے تھے۔
دافع ہدیان "محرَق قاطع" کے جواب میں پہلے درپے تین رسالے لکھے گئے۔ جیسا کہ محولہ بالا
 خط سے ظاہر ہے: "دافع ہدیان" فارسی میں "لطائف غیبی" اور سوالات عبدالکریم اردو
 میں۔ "دافع" کے مصنف سید نجف علی تھے جو غالباً جمبھڑ کے رہنے والے تھے۔ یہ فارسی
 اور عربی کے فاضل تھے۔ دسائیر کی ایک فرہنگ بھی لکھی تھی جو ۱۸۶۴ء میں شائع
 ہوئی۔ اس پر غالب نے تقریظ رقم فرمائی جو فرہنگ کے ساتھ چھپ گئی مگر دوسری
 تقریظوں کی طرح کلیات شرفارسی میں شامل نہ ہو سکی۔

"دافع" کی ضخامت صرف ۲۰ صفحے ہے یہ ۱۲۸۱ء و ۱۸۶۴ء میں اکمل المطابع
 دہلی سے شائع ہوئی۔ ذکا حیدر آبادی نے غالب کی وساطت سے ایک خط مولوی
 سید نجف علی کو بھیجا تھا۔ اس پر ذکا کو لکھتے ہیں:

ہاں صاحب خط دیر وزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام کا مع اس
 حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب کے پاس پہنچاؤں میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی
 صاحب سے میری ملاقات نہیں صرف اتحاد معنوی کے اقتضا سے "دافع ہدیان" لکھ کر انہوں
 نے فن سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ خشتی گو بند سنگھ دہلوی ایک ان کے شاگرد اور میرے آشنا
 ہیں۔ ان کو یہ خط بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھجوا دیں گے

انہی کے اظہار سے دریافت ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگالہ میں ہیں۔ نواب
ناظم نے نوکر رکھ لیا ہے۔

لطائف غیبی اور لطائف غیبی ۴۴ صفحے کا اردو رسالہ ہے جسے ہیفت لائق میاں ادخال
سوات عبد الکریم سیاح کی تصنیف ظاہر کیا گیا ہے لیکن سیر سیر نزویک یہ رسالہ تو شروع
سے آخر تک غالب کی تصنیف ہے یا سیاح کی عبارت میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ
اسے غالب ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیئے عبارت کی روانی اور تعریضات کی شوخی میں
غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سیاح کی نگارش کا ڈھنگ اور تقابلیسا کہ ان کی
”سیر سیاح“ سے جو غالباً ۱۸۷۲ء میں تھپی تھی ظاہر ہے۔ شہادت کے طور پر ”لطائف“
کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

سعادت علی صاحب جامع ”محرّق“ کی نسبت ارشاد ہوتا ہے،
کوئی شخص ہے رعایا سے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی محکمہ انگریزی کا سر شرفدار
ہو گیا تھا اور اب خانہ نشین ہے، موسوم بہ منشی سعادت علی، نہ نشر سے واقف نہ نظم
سے آگاہ نہ عقل کا سرمایہ نہ علم کی دستگاہ کسی گاؤں میں کسی بستی میں کسی گھاٹ پر
کسی بات پر اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سنا،
پھر ارشاد ہوتا ہے،

اہل نظر ”قانع“ کو باہم دیکھیں گے تو قانع کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر
آئیں گی اور ”محرّق“ کی نشریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب
از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں، از روئے ہمیشہ و حرقت منشی ہیں جیسے منشی
بھیروں ناتھ اور منشی گینڈا مل۔

لطیفہ دوم میں فرماتے ہیں،

اے صاحبانِ فہم و انصاف عبارت ”محرّق قانع برہان“ کو دیکھا چاہیئے، غلط بحث

اظہارِ مہل سو ترکیب تباہی روزمرہ غلطی فہم اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا
عامیان معوج الذہن کی نشر اور کیسی ہوگی۔ خالصاً اللہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا
پھکڑہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہجڑا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک شری
کو کسی نے چھیڑ دیا ہے، وہ فحش بک رہا ہے۔

کتاب میں بعض مطالب ایسے آئے ہیں جن کے متعلق صحیح واقفیت صرف غالب
بی کو ہو سکتی تھی۔ مثلاً منشی سعادت علی نے ایک موقع پر لکھا تھا یا محرق میں چھپ
گیا تھا ”من اس قدر قلم را چہرہ اسود“ اس کے جواب میں ”لطائف غیبی“ منظر ہے کہ قلم کے
واسطے ”فرسودن“ ہوتا ہے، نہ کہ ”سودن“ ایک دوست نے کہا،

منشی جی نے مخا ہو کر قلم کو سرمہ کی مانند پس ڈالا ہو گا۔ میں نے کہا کہ ”من“ کی خبر سوڈ بھلا
اس کی کوئی وجہ اور تاویل کرو؟ ”سو دم“ کی جگہ ”سو دے“ کیا معنی؟ اس ظریف نے کہا
کہ ”سو دم“ میں ”دم“ کی صورت پائی جاتی ہے اور منشی جی ”بے دم“ ہیں ”من“ جو حرف متکلم کا
ہے یہ دم کے ساتھ آتا تو خدا نخواستہ منشی جی دمدار بن جاتے۔

اس کے بعد لطیفہ لکھتے ہیں۔

شاہ عباس ثانی پادشاہ ایران کے عہد میں حکیم شفقانی اصفہانی بڑا شیوہ بیان اور ہرمان
شاعر تھو مومن خان یوزباشی میں اور اس میں عداوت پیدا ہوئی حکیم شفقانی نے اس کی
ہجوس لکھیں ازاں جملہ ایک ترکیب بند نے بڑی شہرت پائی اور قبول طبع خاص و عام ہوا۔

اس ترکیب بند کے پہلے دو شعر درج کر کے لکھتے ہیں۔

..... ادب باش اصفہان ہر رگبزر میں دف و چنگ کے ساتھ اس ترکیب بند کو

گلانے پھرتے تھے۔ مومن خان سن کر خفا ہوتا تھا، مگر اس طائفہ بے نام و تنگ سے کیا کہہ

سکتا تھا۔ ناچار اپنے گھر بیٹھ رہا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس جماعت نے اس کے

در دولت پر شد و مد سے گانا شروع کیا۔ پایان کار مومن خاں اپنے پیٹ

میں پھری مار کر مر گیا۔

میں ڈرتا ہوں غشتی جی بھی ان دھات کو دیکھ کر کہیں اپنی کو ہلاک نہ کریں اس بزرگ
نے فرمایا کہ ہاں، دنیاں یہ کام بہت غیرت والوں کا نہ تھی جن کی طرف یہ حسرت
لے جا رہے۔

غرض یہ کہ اس نے میں یہ کتاب غائب کی تصنیف ہے اگرچہ میاں ادخال
سیاح کے نام سے چھپی۔

سوالات عدیدہ لکریں تھیں آٹھ صفحے کا مثنیہ سار سالہ ہے یہ بھی اردو میں اور غائب
ہی کا نام ہو معلوم ہوتا ہے یہ دونوں رسالے اکمل الدین نے تھے غائب کے بیان کے مطابق
صاحب طبع نے فروخت کیے تھے بھاپ تھے۔ لکھنؤ کی قمریہ آڈیو گرافی غائب لکھتے ہیں:
لکھنؤ کی قمریہ سیدیں سات روپے آٹھ آنے کا بیچ کر سگو ایس یہ جو میں نے
سیف الحق کا خطاب دیا ہے اس کی طرح کا سہ پہ سالہ مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ
ہو میرے ماز و مور میرے وطن کو مایہ ناز رکھو نہ تھوڑے جتن رہے گی یہ الف نیشی
سے اعداد و حساب لڑا دیں۔

یہ بیان اردو فتح بیان کے بعد قیام برما کی حالت میں دوسری کتاب
”سالم طبع برما“ بھی لکھی یہ بھی باری میں ہے۔ اسے نئی نئی ہے۔ ۱۳۸۲ھ
میں مطلع ہوا تھی میں چھپی تھی۔ اس کے بعد اس نے جو مولانا امام بخش صاحبانی
کے شاگرد تھے میرٹھ میں منتخب ہو گئے تھے آخری سر میں بینائی جاتی رہی تھی
غائب لکھتے ہیں:

میرٹھ کا محل و طس سرور ہے اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور مجھے اس کا پیشہ
ہے۔ وہ آٹھ دس برس سے اندھا، نظر و نشر میں مولوی امام بخش صاحبانی کا شاگرد
اور فارسی شعر کہتا ہے۔

یہ خط ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کا ہے بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ "نامہ غالب" اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا ہوگا۔ مستقل طور پر چھپ جانے کے بعد یہ اودھ اخبار کے دو نمبروں (۱۰ اکتوبر و ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء) میں بھی شائع ہوا تھا۔ ایڈیٹر نے اس پر جو تہنیدی عبارت لکھی تھی۔ ذیل میں درج ہے :

جناب ممدوح (غالب) نے ایک کتاب "قاطع برہان" میں اکثر لغات و محاورات کے موارد استعمال کی تصحیح اور اغلاط کتاب "برہان" کی بہ عبارت دلچسپ اصلاح فرمائی۔ اس پر بعض حسود کو تہ اندیش نے بہ مقتضائے کور باطنی جہلی اور نیز بہ امید اس کے کہ ایسے کامل الفن طوطی ہند کے مقابلے میں کچھ تھوڑی چیں چیں کر کے عوام کالانعام کی نظروں میں کسی طرح سرخروئی حاصل کریں، بجائے داد کے بیداد کیا کہ تردید کلام بلاغت نظام میں محنت بے جا اٹھائی مگر لطیف الطبع میاں داد خاں صاحب سیلح رفیق سید غلام بابا صاحب رئیس سورت نے ان تشکیلات کو بہ براہیں شایستہ رفع کیا۔ اسی طرح میرزا جیم میگ نامی کو بھی غفل و دماغ ہوا تھا ان کی اصلاح مزاج کے واسطے حضرت (غالب) نے خود نوجہ فرمائی چنانچہ وہ نامہ بلاغت آگین میں یکسہ درج ذیل ہے۔

"قاطع القاطع" قاطع کے جواب میں تیسری کتاب امین الدین پٹیالوی نے لکھی جو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں مطبع مصطفائی میں طبع ہوئی۔ یہ ۲۶۸ صفحے کی کتاب ہے اس کا مصرعہ تاریخ یہ ہے :

شمشیر آبدار زبان امیں دیں

اس کتاب کے سلسلے میں امین الدین کے خلاف غالب نے ازالہ حیثیت عرفی کا دعوے دائر کیا تھا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ جب کامیابی کی امید نہ رہی تو انہوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اشار تحقیقات میں دہلی کے بعض اہل قلم عدالت میں بلائے گئے انہوں نے ملزم کو سزا سے بچانے کیلئے زیر تحقیقات فقروں کے ایسے معنی بیان کئے

بن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔

ازالہ حشیت | اس مقدمے کی مسلسل مل گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ ۲ دسمبر ۱۸۶۸ء

مرنی کا مقدمہ کو غائب نے ڈپٹی کمشنر کے پاس ایک درخواست دی تھی جس میں اپنے

خاندانی اعزازات اور علو تبار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امین الدین نے ایک علمی

بحث کے سلسلے میں میرے لئے ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ کوئی شخص کوئی

اور چہار کیلئے بھی استعمال نہ کرے۔ میں نے منشی عزیز الدین کو اپنا وکیل بنایا ہے :

امیدوار ہوں کہ بعد تصدیق کالت نامہ سرستہ فوجداری میں یہ مقدمہ پیش ہوا اور خاص آپ

کی تجویز سے اول سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہوا اور کسی ناخوشی میں یہ مقدمہ سپرد نہ ہو۔

لیکن ڈپٹی کمشنر نے اس درخواست پر لکھا کہ فوجداری مقدمات اسسٹنٹ کمشنر

کے پاس پیش ہوتے ہیں لہذا یہ مقدمہ بھی انہی کی عدالت میں بنانا چاہیئے۔ چنانچہ

اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں کالت نامہ پیش ہوا۔ قاطع القاطع پیش ہوئی جس

سبب سے تھیں پر اعتراض تھا ان میں سے تیرہ مقامات تعین کے ساتھ بتائے گئے۔

لیکن ابھی مقدمے کی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ غائب نے ۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء

کو کچھ ایک درخواست ڈپٹی کمشنر کو دی کہ مقدمے کو پیش ہوئے قریباً تیسرا مہینہ ہے۔ (صحیح

یہ ہے کہ دوسرا مہینہ تھا) آپ نے حکم دیا کہ اسسٹنٹ کمشنر کے سپرد کیا جائے

میرے خوشی اس میں تھی کہ مقدمہ کا فیصلہ آپ خود فرماتے۔ اب بھی :

دھند گویہ بھڑواری اسسٹنٹ جاکر مابوں کے کاغذات مقدمہ دکان سے منٹائے جائیں

اور صدر کے سامنے پیش کئے جائیں تاکہ جس الدین مدعا علیہ کی طلبی کے حکم پابا کو جائے

اور بعد اس کے حاضر ہوں تاکہ سراجہ اس کے اور میرے دوسرے مقدمہ سمجھو میرے حکم

میں رہا۔ حق ہو مدعا علیہ کو سزا سے سخت ملے تاکہ چہ کوئی چھوٹا آری بڑے

آدمی کو یہی کلمات سن کر ملامت ادا کیجیے۔

نیکن و قہ کشتہ نے اسی روز عامہ دے دیا کہ یہ ممکن نہیں۔ ۳۰ جنوری تک سسٹنٹ
کستہ کا تہاولہ ہو گیا تو اس نے خود ناکہ دیا کہ مقدمہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس پیش ہو۔
۲۸ فروری کو عدالت علیہ کی جلی کی پروانہ جاری ہوا کہ فروری کو منشی ایمن الدین کی عرضی پیش ہوئی۔
۲۹ فروری کو فریقین کے نامہ حکم سلاوا گیا کہ گواہوں کی فہرستیں پیش کریں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

من جانس ایمن الدین
من بانب غالب

(۱) مولوی محمد الدین سسٹنٹ پروفیسر عربی و ہندی کالج (۱) ماسٹر پیرے لال آنوب

(۲) مولوی سعید الدین بچ پروفیسر ڈیو سٹوڈیو فیض الدین (۲) مولوی نصیر الدین بچ ڈپٹی کمشنر بچ پروفیسر بچ اسکول

(۳) حکیم حسرت اللہ خاں (۳) منشی حکیم چند دروس و ہندی کالج جو فارسی کے

(۴) محمد سعید الدین خاں حرف میں نیکم (۴) فاضل، دربرہے مضمون نگار تھے۔

(۵) مولوی محمد حسین بچ (۵) مولوی حکیم سلیم ایمن الدین کے قریبی

(۶) مولوی محمد حسین (۶) ہندی کالج سکول

(۷) مولوی محمد سعادت علی مدرس گورنمنٹ سکول ہندی (۷) مولوی محمد حسین

۲۹ ذی قعدہ کی بانب سے صرف پہلے چار چار گواہ پیش ہوئے۔ ایمن الدین

کے گواہوں کی کوشش یہ تھی کہ اعتراض کر دے فقروں کا ایسا مفہوم پیش کریں جو

الہ اللہ تبارک و تعالیٰ نامہ موجب میں تھے۔ غالب کے گواہوں نے کتاب کی عبارتوں کو زیادہ

سے زیادہ تہاب و درجہ موجب ہتک عزت ظاہر کیا۔ خود ایمن الدین نے بھی اپنے بیان

میں عبارتوں کو زیادہ رنگ میں پیش کیا تھا کہ اعتراض کی گنجائش

نہ تھی۔

۳۰ جنوری کو غالب نے راج سسٹنٹ کو جو ہندی پھر معلوم نہیں کیا کہ ہوتا

ہے۔ ۳۰ مارچ سسٹنٹ نے جو غالب کے کہہ کیا۔ ۳۱ مارچ سسٹنٹ نے جو غالب کے کہہ کیا۔

عرضی ڈپٹی کمشنر کے پاس پیش ہوئی۔

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بنام مولوی امین الدین بابت ازالہ حیثیت عرفی حسب منشا دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند دائر عدالت ہے۔ چنانچہ یہ فہمانی چند گرامی رڈ سا شہر باہم رضا مندی ہوئی۔ اب مجھ کو کچھ دعوے بابت مقدمہ باقی نہیں۔ مقدمہ داخل دفتر ہو دے۔

اس پر اور برائے صاحب ڈپٹی کمشنر نے مقدمہ خارج اور کاغذ داخل دفتر کر دیے۔ محولہ بالا عرضی سے ظاہر ہے کہ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق کامیابی کی طرف سے مایوسی دست برداری کی علت نہ تھی بلکہ اکابر دہلی نے بیچ میں پڑ کر صلح کر لوی تھی۔ ممکن ہے غالب اسی وجہ سے صلح پر راضی ہوئے ہوں کہ انہیں کامیابی کی اُمید نہیں رہی تھی۔

اس زمانے میں دہلی سے ایک انگریزی اخبار "مفصلانٹ" کے نام سے نکلتا تھا جس میں غالب کے اس مقدمے کے متعلق ایک خط ۱۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو چھپا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی ضیاء الدین مدعا علیہ کی طرف سے شہادت کے لئے پیش ہوئے تو کسی نے مجسٹریٹ کے کان میں کہہ دیا کہ یہ بڑے معزز اور عالم ہیں، گواہی لیتے وقت انہیں کرسی دی جائے۔ مجسٹریٹ نے قاعدے اور دستور کے خلاف مولوی صاحب کے لئے کرسی کا انتظام کر دیا۔

مکتوب نگار لکھتا ہے۔ میں سخت حیران ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاء الدین کو کس بنا پر کرسی دی۔ اس رعایت سے غالب کے ساتھ سخت بے انصافی ہوئی ہے وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں۔ لفٹنٹ گورنر کے دربار میں انہیں مولوی ضیاء الدین سے اونپے درجے پر بٹایا گیا تھا۔

دستوں سے استعانت | اس زمانے میں مخالفوں کے جواب کے لئے غالب خود بھی دستوں میں تحریک کرتے رہتے تھے مثلاً نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے

میں کہ شہاب الدین نے "محرّق قاطع" کا ایک نسخہ میرے کہنے پر بھیجا ہے اگر فرصت
مساعدت کرے تو اس کی غلطیاں جمع کر کے مجھے بھیج دو۔

میرا ایک دوست ہے کہ وہ سمجھدہ رجال لغیب ہے۔ ان ہفتوات کا خاکہ اڑ رہا ہے۔

نیر خشتاں نے اس کو مدد دی ہے تم بھی بھائی مدد دو۔

خواجہ غلام غوث بجنور کا معاملہ | وہ واقعی سخت پریشانیوں کا دور تھا اور غالب حد درجہ
ذکی الحس ہو گئے تھے کسی نے کہہ دیا کہ آپ کے عزیز دوست خواجہ غلام غوث خاں بجنور
"قاطع" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ غالب نے بے تاب ہو کر خواجہ صاحب کو لکھا کہ یہ
کیا واقعہ ہے۔ اصل خبر بالکل غلط تھی۔ خواجہ صاحب نے شکوہ کیا۔ اس کے
جواب میں فرماتے ہیں،

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سنا مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں مورد
نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا استعجاب پر ہے۔ محل اس پنجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست
کہتا ہے کہ میر منشی صاحب لفٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطع بڑا"
کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیاً کا یہ حال ہے تو داسے برحق ہم اشقیا کے۔ یہ حکایت
بے شکایت نہیں۔ میں دنیا داری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں۔ لیکن
فقر آزاد ہوں نہ شیاد و کیا د

"قاطع" کی دوبارہ طباعت | ۱۸۶۵ء میں غالب نے "قاطع" کو دوبارہ چھپوانے کا ارادہ
کیا۔ نواب یوسف علی خاں نے وعدہ فرمایا کہ اپریل ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کے ساتھ
دو سو روپے "قاطع" کی طبع دوم کے لئے بھیجیں گے۔ لیکن اپریل کے آخری عشرہ
میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور ساتھ ہی امید امداد بھی جاتی رہی۔

سیف الحق سیاح کی وساطت سے نواب میر غلام بابا خاں سے درخواست کی گئی
انہوں نے گھڑی بھیج دی غائب نے دوبارہ لکھا تو ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو صاحب محضوف
نے سو روپیہ کی رقم ارسال کی۔ اس کے بعد کتاب چھپنے کیلئے دیدی اور خود اکتوبر ۱۸۶۵ء
میں نواب کلب علی خاں بہادر کی تحت نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے رام پور
چلے گئے۔ کتاب دہلی میں اکمل المطابع میں چھپ رہی تھی۔ میرزا شمشاد علی بیگ صاحب
کو ۸ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے لکھتے ہیں،

”قاری برہان“ کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپے کی ہنڈی (سو روپے کی باقی) حکیم جی
حکیم غلام نجف خاں کو بھیج دی ہے۔ حضرت نے رسید بھی نہیں لکھی۔ ان سے رسید
لکھو۔ یہ جو اور سب جلدوں کے شیرازہ بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ
جائے خیردار کوئی نسخہ بن جائے۔ جلد ۲۰ بنی سو مجھ کے سارے ہونے کی خبر در بقید جسا۔

میرے پاس بھیج دے۔ روپیہ فوراً پہنچ رہا گیا اگر دیر لگے۔

طبع ثانی میں غائب نے پھر فوراً برٹھا دیئے تھے اور اس کا نام ”قاری برہان“
کے بجائے ”درفش کا دیانی“ رکھا۔ عبد الرزاق شاگر کو لکھتے ہیں،

قاری برہان میں اور مطالب برہان کے ہیں اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا ہے۔

”درفش کا دیانی“ اس کا نام رکھا ہے۔

۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو رام پور سے واپس آئے تو ”درفش“ تیار ہو چکی تھی۔

سیاح کو لکھتے ہیں،

اجی ہاں میاں سیف الحق رام پور آکر تین سو جلدیں ”درفش کا دیانی“ کی تیار پائیں۔

نواب میر غلام بابا خاں کے حصہ ”راوانہ“ دو پڑھے سو جلد کا ہشتارہ بنایا۔ اس پر ثابٹ پٹوایا

ڈاک گھر بکھوایا، سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے، پمفلٹ
والے، ریل والے، متنقذ اللفظ اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رفیعہ حقارت جواب
میر غلام بابا ثانی کو پڑھو اور اس باب میں حورہ فریادیں مجھ کو لکھو۔

”موئد برہان“ کا قاطع کے جواب میں سب سے آخری کتاب مولوی احمد علی کی ”موئد برہان“
ہے۔ جو ۱۸۷۶ء میں چھپی۔ مولوی صاحب ڈھاکہ کے باشندے تھے جس کا نام جہانگیر نگر تھا۔
اسی لئے جہانگیر نگر مشہور تھے، مگر ایرانیت کے تصنع میں اپنے نام کے ساتھ آغا لکھواتے
تھے۔ کلکتہ کے فارسی دانوں میں اس تصنع کا مرض عام طور پر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے
جداد صفہان سے آئے تھے۔ اسی لئے غالب نے موئد برہان کے قطعے میں لکھا ہے :

خواجہ راز اسفہانی بودن آباچہ سود

خاتمش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

مولوی صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے۔ ایٹاناک سوسائٹی کی مطبوعات
کی تصحیح بھی کیا کرتے تھے۔ فارسی شنویوں کے حال میں ایک رسالہ ”فہرست آسمان“ لکھا تھا
جو سوسائٹی نے چھاپ دیا ہے۔

”موئد برہان“ ۸۰ صفحے کی ہے، مطبع مطہر العجائب کلکتہ میں ٹائپ میں طبع ہوئی تھی
غالب کے پاس یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں پہنچی تھی۔ وہ خود ذکا کو ۴۴ مارچ ۱۸۷۶ء
کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

”موئد برہان“ میرے پاس بھی آگئی ہے۔ اور میں اس کی خرائات کا حق بہ قید شمار صفحہ و سطر

لکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت بہ شرط آنکہ جانی نہ رہی ہو۔ اور

باقی ہوا یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب ضرور دو۔ میرے پیچھے ہوئے احوال

جہاں جہاں مناسب سمجھو درج کر دو۔

”تیغ تیز“ ”موئد برہان“ کے بعد غالب نے اردو زبان میں ”تیغ تیز“ لکھی۔ یہ تینیس صفحے کا

ایک مختصر سار سار ہے جو اکل المطالع میں چھپا۔ اس کی تمہیدی عبارت میں "طالع برہان" کے سلسلے کی متعدد کتابوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً "محرّق" کے متعلق فرماتے ہیں:

ایک مرد بے مغز معوج الذہن، نہ فارسی دان، نہ عربی خواں، نے میری نگارش (طالع برہان) کی ترویج میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی تھی اور "محرّق طالع" اس کا نام رکھا۔

مؤلف "طالع برہان" کے متعلق لکھتے ہیں:

ایک مرزا حیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروئے کار آئے اور ایک تحریر مستعجل "طالع برہان" نکال لائے۔ مطالب مندرجہ بالا بیشتر "محرّق طالع" کے مفاد میں منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا زیادہ اس طرف التفات کو تفسیح اوقات جانا۔

مؤلف "طالع الفاطمہ" | مؤلف "طالع الفاطمہ" کی نسبت ارشاد ہوتا ہے:

میاں بین الدین کہ اب بٹیا لہ میں ملقب یہ مدرس ہیں، انہوں نے "طالع الفاطمہ" چھپوایا، استعداد علمی سے بعد صرف مقاصد نجوم و صرف فارسیت کی اس قدر رعایت منسوب رکھی کہ فقیر کے بعض فقرہوں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں۔ باقی سوائے عربی فشری اور فارسی مسروقہ کے وہ مناظر گاہیاں دی ہیں جو کنجڑے اور بھٹیاریے استعمال کرتے رہے ہیں۔ یارب میاں امین الدین کس بڑی قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی بکدش مدرس بنے۔ مگر الفاظ مستعملہ قوم نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت عرفی کی تالش ہو جاتی تو یہاں پر کیسی جہتی؟ مگر میرے کبر تنس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر سہل ہے۔

مؤلف "مولد برہان" | مؤلف "مولد برہان" کی نسبت فرماتے ہیں:

عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر فارسیت میں برابر نقش و تا مرزا گوئی میں کمتر بننے الفاظ

تذیل کے ہیں۔ وہ جن جن کے میرے واسطے استعمال کئے اندر یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں
شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحب عز و شان ہے، عالی
خانہ ان ہے، امراٹے ہند و مسائے ہند بہار اچکان ہند سب اس کو جانتے ہیں، رئیس
زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے
دفتر میں خان صاحب بسیار مہربان و دوستانہ القاب ہے جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی
ہے ساس کو مٹری اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں مگر تحقیقت یہ تذیل نفحات خربا غلام ہانت اللہ
گورنمنٹ بہادر کی توہین اور فحش و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا؟ مولوی نے اپنا
پاجی بن ظاہر کیا۔ میں نے معلم امین بے دین کو سلطان کے حوالے کیا۔ اور احمد علی کے الفاظ مذہم
سے قطع لٹریا۔ اور ان کے مطالبہ علی کا جواب اپنے ذریعہ لیا۔

اس کے بعد اصل کتاب یعنی "تیز تیز" شروع ہوتی ہے، جو سترہ فصلوں پر مشتمل
ہے۔ ان میں مختلف اعتراضات پر نمبر دیا گیا ہے۔ اور ان کے جوابات دیئے ہیں۔
آخر میں چند اعتراضات کو استغناء کی شکل دے کر سولہ سوالات مرتب کئے ہیں اور ہر
سول کے ساتھ نواب مصطفیٰ خاں شیفٹہ کی طرف سے جواب درج ہے۔ تمام جوابات
میں غالب کی تائید کی گئی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ مولوی محمد سعادت علی مدرس
گورنمنٹ سکول دہلی۔ اور نواب نصیر الدین احمد خاں نے مجیب یعنی نواب مصطفیٰ خاں شیفٹہ
کے جوابات کی تصدیق و توثیق کی ہے۔

"تیز تیز" مؤید برہان کے جواب میں غالب نے فارسی میں ایک قطعہ لکھا جس میں اگرچہ
کل اکتیس شعر تھے۔ لیکن "مؤید جیسی دس کتابیں بھی اس کی تاثیر جہانگیر کا مقابلہ نہیں کر
سکتی تھیں۔ اس پر ادبی جنگ نے نثر کے بجائے نظم کی شکل اختیار کر لی۔ اور غالب ہی
کی زمین میں موافق و مخالف چار سو تیرہ شعر کہے گئے۔ غالب کا جواب سب سے پہلے
مولوی احمد علی کے شاگرد عبد الصمد قداسلہی نے دیا۔ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ

علم و ادب میں بہت معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ فدا کے جواب میں سید شاہ باقر علی باقر بہاری اور خواجہ فخر الدین حسین سخن نے دو قطعے لکھے۔ فدا نے پھر ان قطعوں کا جواب دیا۔ اور یہ سارا مجموعہ منظومات ”تبع تیز تر“ کے نام سے چھاپ دیا۔

”ہنگامہ دل آشوب“ غالب فدا، باقر اور سخن کے قطعات آخر الذکر دو بزرگوں کی سعی سے منشی سنت پرشاد کے مطبع واقع آ رہ (بہار) میں بھی چھپ گئے۔

اس مجموعہ کا نام ”ہنگامہ دل آشوب“ رکھا گیا۔ لیکن منظومات کی جنگ اس پر ختم نہ ہوئی جو اہر سنگھ جوہر لکھنوی تاللق مکرانی کے ایک شاگرد تھے۔ انہوں نے مولوی احمد علی کی تائید میں ایک قطعہ لکھا۔ باقر و سخن دونوں نے اس کے جواب میں دو قطعے شائع کئے۔ نیز فدا کے جوابی قطعے پر دو اور قطعے لکھے۔ ایک مختصر سی نظم اردو میں منشی محمد امیر صاحب امیر لکھنوی نے یہ طور محاکمہ لکھی جس میں غالب کی تائید کی گئی۔ یہ مجموعہ بھی منشی سنت پرشاد ہی کے مطبع میں ”ہنگامہ دل آشوب“ (حصہ دوم) کے نام سے چھپ گیا۔

آغا علی شمس لکھنوی نے غالب کے اردو کلام پر چند اعتراضات اودھ اخبار میں

سید شاہ باقر علی باقر پیرنگر ضلع کیا۔ بہار کے سادات میں تھے۔ ماوری سلسلہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی سے ملتا ہے۔ علم و فضل کے علاوہ سبکداری اور منعلقہ فنون میں اپنے عہد کے ایک ممتاز فرد تھے۔ تصوف و سلوک سے بھی بہرہ وانی حاصل تھا۔ غالب کی تصانیف دیکھ کر اور خواجہ فخر الدین حسین سخن سے ان کے کلمات حسن و غائبانہ عقیدت پیدا ہوئی۔ خط و کتابت کے ذریعہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۳۳۷ء میں وفات پائی۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔

۱۳۵۰ء خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلی کے باشندے تھے۔ غالب کے ساتھ رشتہ دار بھی تھی۔ فدا سے کچھ پہلے دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ بعد ازاں آ رہ پہنچ گئے۔ جہاں ان کے عزیز متقیم تھے۔ ”سروش سخن“ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ ۱۳۳۷ء میں ان کا دیوان چھپ گیا تھا۔

۱۳۵۰ء ”ہنگامہ دل آشوب“ کے دونوں حصے رسالہ اردو بابت جنوری ۱۳۵۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

چھاپے تھے ان کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخن نے ایک مضمون اردو میں اور سید
شاہ باقر علی باقر نے ایک مضمون فارسی میں شائع کیا اور ایک ایک اعتراض کا قانع جواب
دیا۔ یہ دونوں مضمون بھی ہنگامہ دل آشوب "حقہ دوم" میں شامل کر دیئے گئے۔

شمشیر تیز تر | مولوی احمد علی صاحب مولف "موہد برہان" نے غالب کی "تبغ تیز" کے جواب
میں ایک رسالہ یہ زبان فارسی "شمشیر تیز تر" کے نام سے لکھا، جو ۱۸۶۱ء میں مولوی غلام نبی کے
مطبع نبوی میں عبداللہ خاں کے زیر اہتمام چھپا۔ یہ رسالہ ۱۰۰ صفحے کا ہے۔ اس کے آغاز میں
فداکار رسالہ تبغ تیز تر بھی شامل کر دیا گیا۔ غرض "قانع برہان" کی اشاعت پر جو ہنگامہ شروع
ہوا تھا، وہ نظم و نثر کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ۱۸۶۱ء میں "شمشیر تیز تر" پر ختم ہوا۔
غالب نے "موہد برہان" کے متعلق جو قطعہ لکھا تھا، وہ ذیل میں درج ہے۔ یہ سب دہلیس
میں شائع ہو گیا تھا:

قطعہ

در سپاسگزاری ویا آوری بہ حال ندمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری از جانب

پوزش خواہ بے راہہ روی اسد اللہ خان غالب دہلی

مولوی احمد علی احمد نخلص نسخہ	در خصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است
کیچ و کراں اکہ در سند است از ایران جدا	شامل اقلیم ایراں بے محابا کردہ است
قوم بریج راہ ایرانی نژادان دادہ خلط	ترک ترکان سمرقند و بخارا کردہ است
در جہاں تمام بود روی وے دلچست قیقل	پیشواے خولیش ہند و زادہ را کردہ است
ہندیان را در زبانہ انی مسلمہ داشتہ	تا چہ اندر خاطر والائے او جا کردہ است
خوش برآمد باہر ہندستان زایاں چہ خوش	تکبہ آرسے بر ولادت گاہ آبا کردہ است

۱۸۶۱ء "شمشیر تیز تر" کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کا مملوک تھا۔

۱۸۶۱ء یہ شعر "ہنگامہ دل آشوب" والے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

ہر کہ بینی بازبان مولد خود آشتا است
 خواجہ رازا صفہائی بودن آیا چہ سود
 باقیل و جامع برہان "ولالہ ٹیک چند
 داور می گاہے بنا فرمود و در مے ہر سہ را
 گر چنین باہندیان ارد تو لا در سخن
 میل او باہر کسے از بند و جیش خاص من
 کردہ است از خوبی گفتار من قطع نظر
 مطلب از بد گفتن من حیثیت گویانیک و
 در چنین نبود چنان باشد کہ در عرض کمال
 صاحب علم و ادب انگہ از افراد غصب
 در جدل و شنام کار سوتقیان باشد و لے
 انتقام جامع برہان قاطع مے کشد
 من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت
 زشت گفتم یک ادب نہ سنجی دادہ ام
 مے کشد تا بید برہان "یک برہان نا پدید
 سستی طرز خرام نامہ برہان "نگار
 بہر من توین بہر خویش تحسین جا بجا
 آیہ و بیند ہم اندر کہت سب مولوی
 لغو و خسوداد عاے محض دالطاب محل
 ساز نطق مولیٰ اجداد بے جا کردہ است
 تا نقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است
 لایہ و سوگیری و لطف و مدارا کردہ است
 منصف و صدرا بین و صداعلی کردہ است
 من بھم از ہندم چرا از من تبرا کردہ است
 جیف و میل باد و عالم شور و غوغا کردہ است
 ظلم زبیں قطع نظر بر چشم بینا کردہ است
 مزدایں کار از حق آمرزش تنہا کردہ است
 تا بر آورد نام این ہنگامہ پیدا کردہ است
 چو سفیہاں و فتر نفرین و ذمہ واکردہ است
 نناٹ ارد علم زان کاسے کر آغا کردہ است
 آنچه ما کردیم با مے خواجہ با ما کردہ است
 وائے بر مے گر یہ تقلید من اینہا کردہ است
 شوخی طبع کہ دارم این تقاضا کردہ است
 نیست جز تسلیم قولش ہر چہ انا کردہ است
 یانے دانست یا دانستہ اخفا کردہ است
 ہم مرا ہم خویش را در ہر سوا کردہ است
 ہر چہ از ہنگامہ گیراں کس تماشا کردہ است
 مار و موش و سوسمار و گر بہ یکجا کردہ است

بگزارانست ہمیں الفاظ را بربستہ ہیں
 یا فتم از دیدن تار بجہا۔ بے آں کتاب
 باہ نبود شیشہ و ساغر مہیا کردہ است
 خود بدہم گفت و بہ اجہاب خود ایما کردہ است
 غازیان ہمراہ خویش آوردہ از بہر جہاد
 تانہ پنداری کہ این پیکار تنہا کردہ است
 جوش زد از غایت قہر و غضب خویش
 تاز بانش را بدیں ہفتہ نو یا کردہ است
 آتش خشمی کہ سوزد صاحب خود را سخت
 دردش ہم چوں شرور سنگ ما و کردہ است
 چوں نباشد باعث تشنہ جز رشک و حسد
 باد غالب خستہ تر گر خستہ پروا کردہ است

مورانا بولکلام کا ارشاد | "قاطع برہان" کے متعلق مورانا بولکلام آزاد فرماتے ہیں:

میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ مدرس کے ایک اخبار جریدہ "روزگار" میں یادگار غالب کا اشتہار دیکھا۔ یہ اخبار ہر ہفتہ سردرق پر ایک مجلس قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید ملی مدنی العربی" پر چھپایا کرتا تھا۔ اس لئے حافظ دولی اللہ رواد مرحوم کے خادم خاص اور میرے بچپن کے (الف۔ بے کے استاد) اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ وہ مرحوم کے ایک مرید حاجی مصلح لدین۔۔۔ اگر انہیں ہر ہفتہ لاویا کرتے تھے۔

یہ زمانہ میں نے بڑے شوق سے کتاب سہو۔۔۔ یہ میرے اردو مطالعہ کا بالکل آغاز تھا۔ کتاب میں "برہان قاطع" کے معرکے کا جب میں پڑھا تو شوق ہو کہ یہ تمام کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ چنانچہ قاطع برہان اس بکود سر بڑیشی رفیق کو بیانی "قاطع القاطع" "ساطع برہان" "محرق قاطع" "موند برہان" "تبع تیز" "شمشیر تیز" وغیرہ تمام رسائل برہمی و جستجو جمع کئے چونکہ اس زمانے میں فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصبیح الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی۔ اس لئے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کا موقع ملا۔

واقعہ یہ ہے کہ میرزا غالب نے یہ چند اجزا یعنی قاطع برہان، لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی

خدمت انجام دی ہے۔ افسوس کہ خواجہ عالی نے اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔

میرزا کے حالات میں ضروری ہے کہ اس معاملہ پر یہ تفصیل نظر ڈالی جائے کہ وہاں قاطع کے جو خرافات انہوں نے نقل کئے ہیں، انہیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم و بصیرت کیونکر ان کی تائید کر سکتا ہے؛ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مضاد رہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام یہ طور دلیل کے پیش کیا جاتا۔

رضا قلی خاں ہدایت صاحب "مجمع القصص" نے مرزا غالب کے چند سال بعد "فرہنگ انجمن آرٹس ناصری" لکھی جو طہران میں چھپ گئی ہے اور بیٹے کے تاجروں سے مل سکتی ہے۔ اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس معاملہ پر مثلاً و مباحث نقل کر کے یہ تفصیل بحث کرتی چاہیے۔

کیا اچھا ہوا اگر "درفش کاویانی" کو بعد کے مباحث کے اضافے کے ساتھ از سر نو شائع کر دیا جائے یا "تیغ تیز" اور "لطائف غیبی" بحسبہ آخر میں شامل کر دیئے جائیں۔ "درفش کاویانی" کی طباعت میں غلطیاں بہت ہیں ان کی تصحیح ضروری ہے۔

پندرہواں باب

کلامِ طریق اصلاح اور منشاعرے

بندرا زہدِ سخن پیشہ گنت سے بہت

اندیس دیر کہیں مے کدہ اشاہ بہت

غالب نے اپنے منتخب اردو اور فارسی اشعار کا مجموعہ "گل رعنائ" کے نام سے مرتب کیا تھا اس کے دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ پہلے اردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے فارسی دیوان کے خاتمہ کی عبارت میں، جو ۱۲۵۳ھ میں لکھی گئی تھی، فرماتے ہیں کہ گیارہ برس کے عمر میں شعر گوئی کا آغاز ہو گیا تھا۔ لالہ بہاری لالہ مشتاقی کا بیان ہے کہ اگر وہ ایک صاحبِ لہ کنہیا لال جو غالب کے ہم عمر تھے، ایک مرتبہ دہلی آئے۔ اور غالب سے بھی ملے۔ ثناء گفتگو میں یاد دلایا کہ آپ نے پتنگ بازی کے متعلق ایک فتویٰ اردو میں لکھی تھی۔

۱۔ کلیاتِ شرفارسی صفحہ ۵۹۵، حیاتِ شرفارسی صفحہ ۵۹۵، یادگارِ غالب صفحہ ۵۹۵۔

(بقیہ ماسیہ اگلے صفحے پر)

فارسی شعر گوئی بھی چھوٹی ہی عمر میں شروع کر دی تھی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں ایک فارسی غزل کہی تھی۔ جس کی ردیف ”کہ چہ“ تھی۔ یہ غزل ان کے استاد شیخ معظم کے پاس پیش ہوئی تو شیخ نے ردیف کو مہمل بتایا۔ لیکن ایک درغالب کو ظہوری کے کلام میں ”کہ چہ“ یہ معنی ”چہ“ کی سند مل گئی۔ شیخ نے یہ سند دیکھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۹) لاکھنؤ لال کا بیان ہے کہ یہ مثنوی شب کھچی لکھی تو غالب کی ٹراٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ لیکن ایک صاحب حاجی سید اکبر علی بیچ سہارن پوری تھے جو ابو ظفر بہادر شاہ کے مقرب تھے اور کپنی کے ساتھ مقدمات میں پارشاہ کی طرف سے پیروی کرتے تھے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً آکرہ جاتے رہتے تھے انہوں نے ایک ریاض یادگار چھوڑی تھی جس میں یہ مثنوی بھی مرقوم تھی۔ میں اسے تبرکاً یہاں نقل کرتا ہوں:

ایک دن مثل چنگ کا ندی	سے کے دل سرشتہ آزادگی
خود بخود کچھ ہسم سے کینا نے تے	اس قدر بڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اسے دل ہولے دہراں	کہ تیرے حق میں رکھنی بے بیان
پیچ میں ان کے آنا زہبار	یہ نہیں جن گے کسو کے یارنار
گورے پٹے پر نہ ان سا کر نظر	کھینچ بیٹے ہیں یہ ڈورے ال
اب تو مل جائے گی اس تیری سانٹھ	لیکن آخر کو پڑے گی ایسی کانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلیبی نہیرا	قرہ دل ان سے ابھانا تھے
یہ جو محفل میں پڑھاتے ہیں تجھے	بھول مت س پڑاڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو زہن گے کہیں	مفت میں ناحق کٹاریں گے کہیں
دل نے سنکر کانپ کر کھینچ دناں	غوط میں جا کر دیا گیا کٹ کر جواب

”رشتہ درگروںم افگندہ دوست

مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

و نہ یہ فرہنگ فرزانگان پیشین بوعلی آسا علم و ہنر سے گفتگو درویش با ششم و آزادانہ راہ سپرم۔
ذوق سخن کرازل آورده بود، رہنمائی کردہ مراد آں فریقیت کہ آئینہ زد و دودن و صورت معنی نمودن نیز
کارنما بان است۔ سرشکری و دانشوری خود میست، صوفی گری بگزار و بہ سخن گستری روئے آری ناگزیر
ہم چنان کردم و مغبینہ در بحر شعر کہ سراپا است رواں کردم قلم علم شدہ و تیراے شکستہ نیساگان تسلیم
یا خود بہ روزگار دیدہ و رے تہ بود یا بود و بہ من نیہ پر دانت۔

نواب شمس الامرا جید آبادی کے نام کے فارسی خط میں لکھتے ہیں :
شعر و سخن را با نہاد کمترین پیوند و حافی است و خام از بد و فطرت و رگہ افشانی۔ در آغاز ریختہ
گفتے و بہ روز زبان غزل سرا بودیے تا بہ پارسی زبان ذوق سخن یافت و ازاں وادی عنان اندیشہ
بر تافت۔ دیوان مختصرے اور ریختہ فراہم آورد آں را گلدستہ طاق نسیان کردہ کہ بیش سی سال است
کہ اندیشہ پارسی نگاراست۔

نواب علی بہادر خاں والی باندہ کو لکھتے ہیں :
ازدیر باز بہ گفتن یہ بخندے کہ اہم وہ پارسی سخن سے سراہم۔ لیکن چوں رفا سے خاطر حضرت
نظر الہی و آں است کہ ایں گوئی گشت۔ بڑے حضرت ندک رفعت ارمان برادہ با ششم
ناچار کہ گاہ، ریختہ سے گویم۔

یہ ہر حال غالب کی تمام تحریرات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں انہوں
نے اردو میں شعر کہے۔ پھر فارسی میں بھی کہنے لگے۔ چند سال بعد صرف فارسی کے لئے
وقف ہو گئے۔ جب قلعہ کے سانحہ ملازمت کا تعلق پیدا ہوا تو بادشاہ کی خوشنودی کے
لئے پھر گاہ گاہ اردو میں کہنے لگے۔

ملاحظہ الصمد کی محبت کا اثر | میرا خیال ہے کہ فارسی کی طرف زیادہ توجہ دلانے کا باعث ملا عبد الصمد
ہوئے جو ستارہ میں آگودے جبکہ غالب عمر صرف چودہ برس کی تھی۔ ابتدائی اردو کلام میں غارت
کی افراط محتاج اعادہ نہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے فارسی شعر کہہ لیتے

تھے۔ اس کے بعد کہیں کہیں اس میں فارسی الفاظ کی جگہ اُردو الفاظ داخل کر دیتے تھے۔ یا کہنا چاہتے کہ ان کا تخیل فارسی میں شعر کہتا تھا اور کاغذ پر لکھنا اُسے اُردو بنالیتے تھے۔ عام طور پر اُس کی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ ذوق یا دوسرے اُردو شعرا کی طرح ابتدا میں اُردو زبان پر اُنہیں یہ قدرت حاصل نہ تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اُن کی والدہ ماجدہ اگرہ کی تھیں زنبہال کا پورا خاندان ہندوستانی تھا۔ والد اور چچا دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی۔ پھر والد اگرہ، لکھنؤ اور حیدرآباد میں رہے جو اُردو کے مرکز تھے۔ لہذا یہ کیونکر مانا جاسکتا ہے کہ وہ اُردو سے زیادہ واقف نہ تھے۔ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں وہ زیادہ تر فارسی اساتذہ کا کام دیکھتے تھے تخیل فطرتاً بلند پرواز تھا۔ بیدل کے فکر کی آسماں پہاٹیوں سے بدرجہ غایت متاثر ہو گئے۔ اسی کے انداز کی پیروی اُردو میں کرنے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ کلام میں نہ مضمون فارسیست ہی کی فراوانی ہوئی بلکہ بیدل کی خاص ترکیب و مصطلحات بھی ان کے ابتدائی اشعار میں بے تکلف استعمال ہونے لگیں۔

فارسی پر باز اُردو سے نفرت | اپنے اُردو اشعار کے معنی زیادہ حسن ظن نہ تھا۔ اور وہ فارسی ہی کو خدا داد کا لائق فیتی نہایت کہہ دیتے۔ ان کا شمار سا اُردو و زبان و لغت میں تھا۔ دہلی اُردو میں بجائے خود کتنا ہی پیش بہا ہو۔ لیکن حق یہ ہے کہ جن گران مایہ چاہر پاروں سے ان کے فارسی کلام کا دامن لبریز ہے، ان کا عشیر عشیر بھی اُردو کو نہ مل سکا۔ اساتذہ فارسی میں سے کسی کی ایک چیز اچھی ہوگی۔ کسی کی دو چیزیں اچھی ہوں گی۔ لیکن غالب کے ذوق کی جامعیت و سمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ ان کی ہر چیز اچھی ہے۔ نثنوی، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، نثریں و انعامات نگاری، علمی بحثیں، انتقاد غرض ہر دائرے میں وہ یکساں بلند پایہ ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ان کی شہرت کا مدار صرف اُردو کلام پر ہے۔ انہوں نے خود ایک موقع پر ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

اسے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ
کے پیر گوئی فلاں دشوہم سنگ من است
راست گفتی ایک دانی کہ نبود جائے طعن
کمز از بانگ دل گر نغمہ چنگ من است
نیست نقصان یک جزو است اسوہ نختہ
کان و زم بر گئے ز نخلستان فرنگ من است
فارسی ہیں تابی پیتی نقشہا سے رنگ رنگ
بگز از مجموعہ آرد و کہ بے رنگ من است
فارسی ہیں تابی پیتی کا ندر اقصیم خیال
مانی وار ز نغمہ و آل نسو از تنگ من است

دشمنی را ہم فنی شرط است آن دانی کہ نیست
از تو بود نغمہ و رساست کہ در چنگ من است
در سخن چوں کہ زبان و ہم نوا سے من نہ
چوں دلت ریچ و تاب رشک آئینک من است
راست تویم نے از راست سر متواں کشد
ہر چہ در گفتار نخر تست آن تنگ من است
غالب کی یہ را ہے اسے اردو اشعار کے متعلق ہے۔ اردو کے مکاتیب کے متعلق
معلوم ہے کہ ابتداء میں وہ ان کی ترتیب و انتظام سے کوئی شہریت اختیار نہ کی تھی۔
سمجھتے تھے۔ لیکن اسی ایک وہ جہز و دیوار بن گئے اور سخنوری کی شہریت کے منافی
مکاتیب کی با دوست غالب کی عنفرت کا پرچم آج اردو ادب و شعریں بلند ترین مقام پر
اڑ رہا ہے۔ ارباب ذوق اندازہ فرمائیں کہ جس نے اس کے نخلستان فرنگ کے برگ
و زم کی اجاذ بیت اور حسن و خوبی کا یہ عالم ہے، اس کے نقشہا سے رنگ رنگ اور
”نسو از تنگ“ کے طراز و آرایش کا کیا انداز ہوگا لیکن افسوس کہ فارسیت کا ذوق ہندوستان
میں بہت کم ہو گیا۔ اور فطرت غالب نے مائیت کی ان بد قلموئیوں سے اہل علم بہت
کم دوستی حاصل ہو سکے۔

”نسو حیدر“ غالب نے ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء تک جیب ان کی عمر چوبیس پچیس
برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اردو زبان کو ایک دیوان مرتب کر لیا تھا جو اسی زمانے میں
درمیان دوست محمد خان مرہٹوں سے لڑا گیا تھا۔

نقل ہو کر پہنچ گیا تھا۔ چند سال ہوئے یہ نسخہ اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرما کر
بھوپال (متبع اللہ المسلمین بطول حیاتہ وحفظہ بقائہ) کی خسر وائہ توجہات کی بدولت نسخہ حمید
کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

تمہید میں مرقوم ہے کہ یہ نسخہ دارِ صغیر المنظر ^{۳۳} کو حافظ معین الدین صاحب
کے لکھا تھا۔ غائر مطالعہ سے مشکشف ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر کلام بالکل ابتدائی دور
کا ہے۔ جب غائب کی وقت پسند طبیعت تبدیل کے معاملہ سے بہت متاثر تھی لیکن نہ
دماغی قوت نے بکسور حاصل کیا تھا نہ بیان پر پوری قدرت میسر آئی تھی، نہ فکر و تخیل نے
جلد پائی تھی نہ بدن کے احساس الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے
بدن کی پیروی سمجھتے تھے جس طرح آج کل کو رذوق اصحاب نے اشعار میں اندافتوں کے
مسر نہ استعمال کر کوہِ غیب کی سر دی پیمبر کا سبب، ایک صاف اور واضح بات اگرچہ پیچیدہ، بہم
اور عمیق الفہم بن جائے، نوز کے نزدیک غائب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

ہذا کہ بیانِ اہیال کے نزد سحر کاری کا اعتراض اس عہد کی متعدد غزلیات کے
منقطعوں میں موجود ہے:-

اسد ہر جا سخن نے طرے بارغ تازہ ڈال ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیتاں پسند آیا

مضطرب دل نے مرے تارنس سے غائب
سنا نہ پر رشتہ پہنچے سخی بہ بدل باندہا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل
عالم ہمہ افسانہ ماداد و ماہیچ
اس زمانے کے کلام میں جس ردینیں ہیں نہیں - بلکہ پورے مصرعے
فارسی کے چلے آتے ہیں - مثلاً :

لسان جوہر آئینہ از ویرانی دلہا
غبار کو چہ ہاے موج ہے خاشاک ساحلہا

فنا سے خندہ گل رنگ و ذوق عیش بے پرو
فراغت گاہ آغوش وداع دل پسند آیا

بہ شغل انتظار مہوشاں در غلوت شبہا
مستار نظر ہے رشتہ تبیج کر کہہا
غالب اپنے شاگرد عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :
ابتداءً فکر سخن میں بیدل و اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا :
طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا۔ دس برس میں
بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر حجب تمیز آئی۔ تو اس دیوان کو دور کیا۔ اور اُن یک قلم چاک کئے۔

دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔

”مضامین خیالی“ کا یہی مجموعہ ”نسخہ حمید“ ہے۔

نسخہ حمید کی تصحیح | مفتی انوار الحق مرحوم، اصل نسخہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے
ترمیم کا مسئلہ | ہیں کہ اس پر جگہ جگہ میاں فوجدار محمد قاسم کی مہریں ثبت ہیں جن میں
سے بعض ۱۲۴۸ھ کی اور بعض ۱۲۶۲ھ کی ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے
غالب کے پاس بھی گیا ہے۔ اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انہوں نے خود اس میں
جانبجا اصلاحیں کی ہیں، کیوں کہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے۔
لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی
ہے۔ اور گو محقق اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو۔ لیکن خود
ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا
مشکل ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ ایک لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا
ہے یا کسی مصرع کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر
برسائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مرد و دیوان میں بجنسہ موجود ہیں مابتد بعض ایسی بھی ہیں
کہ ان میں دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے۔ اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع
نہیں ہوئے۔

نسخہ حمید کبھی غالب | لیکن میرے خیال میں مفتی صاحب کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس کے
کے پاس نہیں گیا | وجوہ اختصاراً ذیل میں درج ہیں:-

۱۔ غالب کھلتے جاتے ہوئے لکھنؤ بھی ٹھہرے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک غزل
کبھی تھی جس کا مطلع یہ ہے:

داں پہنچ کر جو غمش آتا ہے ہم ہے ہم کو صدرہ آہنگ میں بس قدم ہے ہم کو

”نسخہ حمید“ ہیں اسے غالب کے اس کلام میں شامل کیا گیا ہے۔ جس کا کوئی ہم طرح شعر قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اگر یہ نسخہ کلکتہ سے مراجعت کے بعد غالب کے پاس بغرض تصحیح و ترمیم پہنچا۔ اور انہوں نے نسخہ کی کتابت سے بعد کی کہی ہوئی غزلیں حاشیہ پر برہمائیں۔ تو اس غزل کو کیوں نظر انداز کیا؟ حالانکہ یہ یقینی طور پر ۱۸۲۶ء میں کہی گئی تھی اور مفتی صاحب کے ارشاد کے مطابق دیوان ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۳ء میں تصحیح و اضافہ کے سے باہر گیا۔ غرض سفر کلکتہ کے بعد اس نسخہ کا غالب کے پاس پہنچنا قابل قبول نہیں۔

(۲) نواب علاء الدین احمد خاں کو غالب اپنے ایک خط مرحومہ ۲۴ جولائی ۱۸۸۳ء میں لکھتے ہیں،

بس پچاس برس کی بات ہے کہ الہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے ادک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا دے شراب تو دے

الہی بخش خاں معروف کا انتقال ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ لہذا ماننا چاہیے کہ یہ غزل ۱۸۲۵ء سے پہلے کہی گئی۔ لیکن مطبوعہ نسخہ حمید کے مطابق یہ بھی اس کلام میں شامل ہے۔ جس کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ بھوپال والا نسخہ ۱۸۲۵ء کے بعد کبھی بھی غالب کے پاس نہیں گیا۔

(۳) سب سے آخر میں یہ کہ خود غالب نے کسی تحریر میں اس نسخہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ غدر کے بعد انہیں اپنے کلام کے مختلف نسخے جمع کرنے کی سخت ضرورت پیش آگئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ غالب کو اس نسخہ کا سرے سے علم ہی نہ تھا۔

اردو اشعار کی تعداد | سرسری اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخہ حمید یہ "میں قصائد اور گیارہ رباعیات کے علاوہ کل ایک ہزار آٹھ سو نوے شعر ہیں۔ ان میں سے غالب نے یا مولانا محمد حسین آزاد کی روایت کے مطابق مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی کو تو ال دہلی نے انتخاب کے وقت کل چار سو تہتر شعر لئے۔ ۱۸۲۵ء کے بعد آخری دم تک چوالیس برس میں غالب نے اردو غزلیات میں مطبوعہ دیوان کے مطابق نو سو نوے شعر کہے۔ بعد کے قصائد، قطعات اور ثنوی، نہ کے اشعار کی تعداد دو سو ستر ہے۔ رباعیات گیارہ ہیں یعنی اگر سب اشعار کو شامل کر لیا جائے تو ان کے چوالیس برس کے کل اردو اشعار تیرہ سو سے کسی قدر کم بنتے ہیں۔ ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں جو مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہوئے۔ لیکن رقعات میں چھپ گئے۔ ایسے اشعار بھی ہیں جو نہ رقعات میں چھپے اور نہ دیوان میں شامل ہوئے۔ غرض ۱۸۲۵ء کے بعد سے ان کے کل اردو اشعار تیرہ سو سے متجاوز نہیں ہوں گے۔ اس دوران میں فارسی کے کئی ہزار اشعار کہے۔

انتخاب اشعار نا درست | "نسخہ حمید یہ" والے اشعار کا کوئی مجموعہ اگر انتخاب کے وقت غالب یا ان کے دوستوں کے پیش نظر تھا۔ تو ماننا چاہیے کہ انتخاب میں غروگزشتیں ہوئیں۔

اس نسخہ میں بعض ایسی غزلیں موجود ہیں جو تامل یا جزو انتخاب میں آنی چاہیے تھیں مگر نہیں آئیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل غزل:

دامان دل یہ وہم تماشا نہ کھینچے اے مدعی خجالت بے جا نہ کھینچے
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے
خود نامہ بن کے جایئے اس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منت بیگانہ کھینچے

یا:

تماشاے گلشن تمنائے چیدن بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم
اسد شکوہ کفر و دعا ناس پاہی ہجوم تمنائے لاچار ہیں ہم

یا:

خود پرستی سے ہے باہمد گزنا آشنا بیکی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
رابط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار سبزہ بیگانہ، صیاد آوارہ، گل نا آشنا
یہ ہر حال ان میں سے کوئی شعر "شمار سچو مرغوب بت مشکل پسند آیا" کے مقابلے میں
مستوجب حذت و رد نہ تھا۔

نئے انتخاب کی ضرورت | میرا خیال ہے کہ پورا مجموعہ بوقت انتخاب اشعار غالب یا ان کے
دوستوں کے سامنے نہ تھا۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو میرا ارادہ ہے کہ غالب کے
اچھے اشعار کا ایک نیا مجموعہ مرتب کروں۔ اس لئے کہ بعض ان اشعار کی وجہ
سے جن میں قاریت زیادہ اور معافی معمولی ہیں، ان کی عظمت و کمال کا حقیقی مدللہ
عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ اور غالبیت کے غلط تصور نے جو مروج
اردو دیوان کے عام مطالعہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ بہتر سے لوگوں کو اس راستے پر ڈال دیا
ہے جو غالب کا راستہ یقیناً نہیں تھا۔

”نسخہ حمیدریہ“ کے علاوہ بھی غالب بعض اچھے اشعار ملتے ہیں۔ جواب تک ان کے دیوان میں شامل نہیں ہو سکے۔ مثلاً:

درد ہو دل میں تو دوا کیجے ۲ دل ہی حب درد ہو تو کیا کیجے
ہم کو فرباد کرنی آتی ہے آپ سُنتے نہیں تو کیا کیجے

عرض شوخی نشاط عالم ہے
حُسن کو اور خود تم کیجے

یا،

اس جو روجفا پر بھی، بدظن نہیں سمجھ سے
کیا طرفہ تمنا ہے، اُمید کرم تجھ سے

یا،

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ لبوں پہ جان سی آہائیکی جواب کے ساتھ
مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی ملور قبیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ
ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غلبہ
جو جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

اردو مکاتیب کی تعداد | اردو نثر کے سلسلے میں تمام ضروری تفصیلات باب تصانیف میں پیش کی جا چکی ہیں، یہاں صرف مکاتیب کی تعداد بتانی ہے۔ مطبع فاروقی کے چھپے ہوئے ”اردو سے معلّے“ اور مطبع نو لکشور کی چھپی ہوئی عود ہندی سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں میں تقریظوں اور ”نامہ غالب“ کے علاوہ کل چھ سو پندرہ خطوط ہیں۔

اُردو سے معلّٰی

۴۷۰

عود ہندی

۱۴۵

ان میں سے کم و بیش ۱۱ رقصات مشترک ہیں۔ اُردو سے معلّٰی کے بعض دوسرے مجموعوں میں چند اور رقصات کا اضافہ ہوا ہے۔ چند نئے رقصات ہندوستانی ایکڈمی (صوبہ متحدہ) کے رسالہ ”ہندوستانی“ میں چھپے ہیں۔ بعض رقصات دوسرے رسائل میں طبع ہوئے ہیں۔ فرمانروایان رام پور کے نام کے تمام رقصات مولانا اقبیاز علی عرشی کی سعی و ترتیب سے چھپ گئے ہیں۔ بہار کے بعض اصحاب کو جو رقصات لکھے گئے تھے۔ ان کا انتخاب ”نادر خطوط غالب“ کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ خواجہ فخر الدین حسین سخن کے پاس جو مکاتیب تھے وہ ابھی تک نہیں چھپے سنا ہے۔ پنڈت مہیش پرشاد منشی فاضل (ہندو یونیورسٹی بنارس) نے رقصات کا ایک بھاری مجموعہ فراہم کیا ہے۔ جسے متعدد جلدوں میں چھاپیں گے۔ تاحال صرف پہلی جلد چھپی ہے۔ مطبوعہ رقصات میں سے زیادہ تر فقہان و اب علما الدین احمد خاں، علّائی، منشی شیونرائن، میر مجروح، سرور مارہروی، خواجہ غلام غوث خان بنجر، نواب انور الدولہ بہادر شفق، حکیم غلام نجف خاں اور میرزا حاتم علی بیگ قہر کے نام ہیں۔

مکاتیب اُردو کے انداز و اسلوب کی نسبت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ سادہ، سلیس اور بہار آفریں تحریر کا کوئی ایسا نمونہ اُردو زبان میں موجود نہیں جس میں بیان، اعجاز نگارش اور کمال اظہار جزئیات کی اتنی فراوان مثالیں ان مکاتیب میں موجود ہیں کہ اُردو کی بڑی بڑی اور بہترین کتابیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ غالب کے بعد بڑے بڑے ادیبوں اور مصنفوں کے خطوط شائع ہوئے۔ لیکن ایک مجموعہ بھی مکاتیب غالب کے مقام بلند تک نہ پہنچ سکا۔ کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مباحث

قلم برداشتہ لکھتے جاتے ہیں۔ یہ انداز نہ ان سے پہلے کسی کو بیسر تھا اور نہ ان کے بعد کوئی شخص اس کی پوری پیروی کر سکا۔ غالب کے اردو اشعار کی کافی قدر ہوئی ہے لیکن ان کے اردو مکاتیب کی بلند پایہ مکی سے اس وقت تک اہل علم بالعموم آگاہ نہیں ہوئے۔ غالب کے بعد اس وقت تک جتنے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے۔ میں نے سب کے مکاتیب دیکھے ہیں۔ دور حاضر کے اکثر اکابر اہل علم سے بھی خط و کتابت کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا مجھے کسی بزرگ کے انداز تحریر میں غالب کی دلکش خصوصیات جامعیت کے ساتھ نظر نہیں آئیں۔ مولانا کے مکاتیب میں مزید دلچسپی اور افادہ کا پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرہ علم و فضل غالب کے مقابلے میں بہت وسیع ہے۔

اجتہاد انداز | مکاتیب کے نادر اسلوب کا غالب کو آخر میں پورا احساس تھا۔ وہ فرماتے ہیں :

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسد کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے پر زبان قلم باتیں کیا کرو۔ اور بھر میں دھمال کے مزے لیا کرو۔

یہ چیز صرف اردو کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ فارسی میں بھی ان کا عام انداز یہی تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

فارسی نثر | فارسی کے کلام نظم و نثر کی نسبت زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ "قاطع برہان"، "ہنج آہنگ"، "مہر نیمروز"، اور "دستنبو" کا مفصل ذکر باب تصانیف میں آچکا ہے۔ "ہنج آہنگ" کے آخری دو حصوں کی نسبت اتنا عرض کر دینا چاہیئے۔ کہ آہنگ چہارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور متفرق نثریں ہیں۔ آہنگ پنجم میں فارسی مکاتیب ہیں۔ آہنگ چہارم کی نثروں کی فہرست درج ذیل ہے :

(۱) دیباچہ دیوان فارسی۔

(۲) دیباچہ گل رعنا۔

(۳) خاتمہ گل رعنا۔

(۴) مولانا فضل خیر آبادی کے نام خط صنعت تعطیل ہیں۔

(۵) معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم اودھ کے نام عرضداشت صنعت تعطیل ہیں۔

(۶) خاتمہ دیوان فارسی۔

(۷) دیباچہ دیوان اردو۔

(۸) تقریظ گلشن بنجار مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفہ۔

(۹) طلوع صبح اور ہجوم ظلمت شب کے متعلق دو نثریں۔

(۱۰) تقریظ دیوان حافظ۔

(۱۱) دیباچہ دیوان میرزا رحیم الدین بہادر جس کا آخری حصہ صنعت مقطع الحروف

میں ہے۔

(۱۲) موارد الکلم فیضی کی تقریظ صنعت تعطیل ہیں۔

(۱۳) دیباچہ دیوان نقشبندی ہرگوپال تفتہ۔

(۱۴) تقریظ آثار العنادید مرسیہ مرحوم۔

(۱۵) دیباچہ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خاں۔

(۱۶) دیباچہ تذکرہ طلسم زار مجروح۔

(۱۷) تہنیت عطاء خلعت بہ فرماڑو اے رام پور۔

(۱۸) تقریظ مجموعہ آثار مرتبہ مولوی مظہر الحق۔

اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے زیادہ تر کتابوں کے دیباچے، خاتمے اور

تقریظیں لکھی ہیں۔ لیکن سب کا انداز جداگانہ ہے۔ کوئی نثر ایسی نہیں ہے جس

میں ظہوری کی مدد سے شری طرح محض تیناں آرائی کی گئی ہو۔ اس زمانے میں غیر منقوط یا
مقطوع اسکردت عبارتیں لکھنا کمال نگارش سمجھا جاتا تھا۔ غالب کی نثروں میں اس
نگارش کے نمونے بھی موجود ہیں۔

فارسی مکاتیب | شرفارسی کا عدد و جد دلکش مجموعہ ان کے مکاتیب ہیں جن پر آہنگ نجم
مشتعل ہے میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک سو چالیس ہے۔ میں سمجھتا ہوں
کہ اردو مکاتیب کی طرح فارسی مکاتیب کی بھی ایک بڑی تعداد ضائع ہو گئی یا چھپ
نہ سکی۔ اردو مکاتیب زیادہ تر غالب کی زندگی کے آخری بیس سال کے ہیں۔ اس
سے پہلے وہ عموماً فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے جو کہ کثیر الاحباب اور کثیر الاقارب
تھے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ چند سو برس کی عمر سے لے کر بچا ستر کچھ برس کی
عمر تک پینتیس چالیس برس میں انہوں نے محض ایک سو چالیس مکاتیب لکھے۔

کلیات نظم اکابرانہ نظم کے آثار میں اقصیات، تہذیب، اور تاریخیں ہیں جو ایک شخص ہے
اس کے بعد ترکیب بند بعد از ان قصیدے، انقصیر، اور غزلیات۔ آخر میں رباعیات و رباعیات
ان کا سرسری انداز ہے۔

قسم نظم	تعداد	اشعار
قطعات	۶۶	۳۸۴
مخمس	۱	دس بند
ترکیب بند	۳	۲۳۰
ترجیع بند	۱	۵۶
ثنویاں	۱۱	۲۰۲۲
غزلیات	۳۲۸	۴۳۸۶
رباعیات	۱۰۰	۲۰۰

گویا کلیات فارسی کے کل اشعار کا اندازہ سوادس ہزار کے قریب ہے "سبد چہیں" کے اشعار قریباً ساڑھے چھ سو ہیں اس طرح غالب کے فارسی اشعار کا مجموعہ گیارہ ہزار کے قریب بنتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ٹاپید ہیں۔ بعض قطعات و رباعیات و اشعار نثریوں میں آئے ہیں اور کسی مجموعہ نظم میں شامل نہیں ہو سکے۔ ان سب کو جمع کرنا وقت طلب ہے۔

قطعات اور ترکیب بند | قطعات متفرق مضامین کے متعلق ہیں۔ مثلاً اپنے اور معاصرین کے درمیان فرق، اوامراہی کی پیروی نہ کرنے کا مسئلہ، ایک نخیل کا معاملہ، فارسی اور اردو شاعری وغیرہ۔ بعض قطعات امر و حکام کی مدح و تہنیت میں ہیں۔ چند نوے ہیں ترکیب بند دو ہیں۔ ایک حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے امیر رضی اللہ عنہم کی منقبت ہیں اور دوسرا بہادر شاہ کے صاحبزادے کے مرثیہ میں۔ ترجیع بند بہادر شاہ کی مدح میں ہے۔ اور مخمس حضرت علی کی منقبت میں۔

شہ باب | مثنویوں کی کیفیت یہ ہے:

- (۱) بہادر شاہ کی مدح میں موسوم بہ "سرمدہ بینش"۔
- (۲) ایک قصہ موسوم بہ "درد و داغ"۔
- (۳) بنارس کی تعریف میں موسوم بہ "چراغ دیر"۔
- (۴) ایک قصہ موسوم بہ "رنگ و بو"۔
- (۵) کلکتہ میں جن لوگوں نے غالب کے خلاف اعتراضات کا ہنگامہ بپا کیا تھا۔ ان کے جواب میں موسوم بہ "یاد مخالف"۔
- (۶) تبرکات اور مسند امتناع فیہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو مورانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش سے لکھی تھی۔
- (۷) تہنیت نامہ عید نجد مت بہادر شاہ ثانی۔
- (۸) تہنیت نامہ عید نجد مت شہزادہ فخر الدین فتح الملک ولی عہد بہادر شاہ۔

(۹) واجد علی شاہ فرماترہ اسے اودھ کی نثر موسوم بہ لبست و ہفت افسر کا دیباچہ۔

(۱۰) آپن اکبری مصححہ سرسید احمد خاں کی تقریظ۔

(۱۱) ”ابر گہر بار“

ابر گہر بار | ان میں سے بعض تنویوں کی کیفیت اور بعض اشعار کتاب کے مختلف حصوں میں جا بجا پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن آخری تنوی کے متعلق کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔ غالب کی یہ سب سے بڑی تنوی ہے۔ جس کے اشعار گیارہ سو سے زائد ہیں۔ ارادہ نقاد کہ شاہنامہ کے رنگ میں غزوات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نظم کریں۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ وہ صرف مقدمات یعنی حمد و نعت و منقبت اور غرض تالیف وغیرہ ہی مرتب کر سکے۔ اصل مضمون شروع نہ ہوا۔ اس میں صرف معراج کا واقعہ دو سو اتنی اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر میں یہ سلسلہ غرض تالیف فرماتے ہیں:

زبان تازہ سازم ز نیروے بخت	یہ ذکر شہنشاہ بے تاج و تخت
گزشت آنکہ دستا نسراے کہن	ز کین خسرو و رستم آرد سخن
منم کم بود در طراز کلام،	شہنشاہ پیمبر سپہ نام
ز فردوسیم نکتہ انگیز تر	ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر
فرد مرین شمع سا سانیہاں	بود صبح اقبال ایما نیہاں
رقم سنج عشورین دانسیم	ز ایما نیہاں گویم، ایسا نیم
کسے را کہ نازد بہ بیگانگاں	خرد در شمار ز دیوانگاں
بہ اقبال ایماں از نیروے دیں	سخن را تم از سید المرسلین
اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:	

در ضمیر زود اثر پذیر من چناں فرد آمد کہ غزوات خداوند دنیا و دین، حضرت امام المرسلین سلام علیہ من رب العالمین بہ بند نگارشش اندر آرم۔ توحید و مناجات منقبت مساتی تاؤ

مفتی نامہ، مدنی پیرزادہ، پچانی و خلیفہ گریبا سخنیہ دال یز مہر انگیز گفتہ آمد۔ ویرہ
 در مناجات پشیرہ اندر دال سون رندانہ و قلند رانہ سخن سرودہ شد کہ سر نشان ہشتی راب از
 شہر ہایا ہو سے بخالہ زد۔ و در بارہ سحران عروج فکر آں پایہ یافت کہ سخن از جایکسے رفت ہم بدانجا
 رسیدہ گفتار ناشناس کہ بہ ترانہ فارسی گوین بند خو گرفتہ اند و آن را بہ یہاں گراں ہے فروشند
 ہے خزانہ حسن تعداد و نطق مرا چوں بینند

تصانیف قصائد کی تفصیل یہ ہے :

تعداد و قصائد

ممدوح

۱۲

(۱) حمد و نعت و مناقب ائمہ

۱

(۲) اکبر شاہ ثانی پادشاہ دہلی

۱۵

(۳) بہادر شاہ ثانی پادشاہ دہلی

۳

(۴) ملکہ و کٹوریہ

۱

(۵) لارڈ آکینڈ گورنر جنرل

۲

(۶) لارڈ ایلن براگورنر جنرل

۱

(۷) سر چارلس مٹکات

۱

(۸) جیمس ٹامپسن لفٹنٹ گورنر یوپی

۱

(۹) پرنسپ

۱

(۱۰) ٹامس ماڈک

۱

(۱۱) اینڈریو اسٹرنگ

- ۱ (۱۲) ولیم قریزر
- ۱ (۱۳) کالون
- ۱ (۱۴) لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل
- ۱ (۱۵) ایڈمنٹسٹن
- ۱ (۱۶) لارڈ کیننگ گورنر جنرل
- ۲ (۱۷) سر رابرٹ ٹننگر میونسٹ گورنر منیچسٹر
- ۱ (۱۸) لارڈ ایلمن گورنر جنرل
- ۱ (۱۹) لارڈ زارنس گورنر جنرل
- ۳ (۲۰) شہزادہ فتح الملک
- ۱ (۲۱) نصیر الدین تاج شاہ ۱۱ دہ
- ۱ (۲۲) امجد علی شاہ اودھ
- ۳ (۲۳) واجد علی شاہ اودھ
- ۲ (۲۴) نواب یوسف علی خاں والی رام پور
- ۲ (۲۵) نواب کلب علی خاں والی رام پور
- ۲ (۲۶) نواب وزیر الدولہ والی ٹونک
- ۱ (۲۷) راجہ شیوہ بیان سنگھ والی لود
- ۱ (۲۸) مہاراجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ
- ۱ (۲۹) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
- ۱ (۳۰) مفتی صدر الدین آزادہ
- ۱ (۳۱) نواب خیار الدین احمد خاں نیر
- ۱ (۳۲) سر سالار جنگ اول

(۳۳) ایک عام قصیدہ یا نظم جس کا کوئی مدوح نہیں۔

قصیدوں کا انداز غالب نے خود ایک جگہ اپنے قصیدوں کے متعلق لکھا ہے :

کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کو مجھ کو نہیں آتی
کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت
پاؤ گئے۔ اور مدح کے شعر کم۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ ان کے تمام قصیدوں میں یا تو تشبیب بہت اعلیٰ ہیں یا وہ حصے شعرا
نقطہ نگاہ سے خاص طور پر قابل قدر ہیں جن میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ تشبیبوں میں
شاعری کے ہر کمال کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ اکثر قصائد عربی اور
دوسرے مشاہیر اساتذہ کے قصیدوں پر لکھے ہیں۔ اور غالب اگر ان سے آگے نہیں
نکلے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ لیکن افسوس کہ نہ غالب کو عربی اور دوسرے شعرا
جیسے قدردان ملے اور نہ زبان فارسی کا وہ فوق باقی رہا جس سے زمانہ گزشتہ
کے بڑے بڑے اساتذہ کا کلام صدیوں متمتع رہا۔

غیر مطبوعہ فارسی قطعہ | غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی قطعہ حال ہی میں ملا ہے جو معظم الدولہ

امین الملک، اختصاص یارخاں، فرزند ارجمند جاں پیرند سلطانی باریٹ تامل تھیافلس
مٹکات صاحب بہادر فیروز جنگ کی مدح میں بتقریب ولادت فرزند لکھا گیا تھا۔
اسے تبرک کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے :

امین ملک و ممالک معظم الدولہ	امیر شاہ نشان و کریم ابرہ نوال
سراں بہ معرکہ فیروز جنگ خواندش	نہ بہ طالع فیروز خویش فرخ قال
ستودہ متکف فرزانہ تامل تھیافلس	ریاض نشان و شکوہ بہار جاہ و جلال
ماثر حکمش نور دیدہ دولت	مکارم کرمش روح قالب اقبال
ز ترکتار سواران موکب جاہش	لسان مہرہ شود چرخ نیلگون پامال

یہ منظرش چہ زنی دم زیر رخشاں
کہ ام تیر رخشاں کہ خود ز منظر او
نہیے عطاے نوکثات عقدہ عیاجات
ز قیصر و جم و دارا فسانہ باد انم
مگر خداے جہاں فرس بہ شوکت و جاہ
یکے منم ز میسحا دماں فن کلام
کہ چوں بہ مدح تو روی آورم، فردماند
بہ بارگاہ تو کر آسماں بد و صحنش
نرا کہ رونق این گلشنی، مبارک باد
طرب فزائی پیوند تو د میدہ نہال

ترغشانی این نخل بینی و یہ جہاں

ز نخل عیش و طرب بخوری ہزار سال

اس کے ساتھ ایک اردو تحریر بھی ملی ہے جس میں کاتب کو اس قطعہ کی ترتیب بتائی گئی ہے
اصلاح اشعار اُن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غالب کے طریق اصلاح اشعار کا بھی مختصر ذکر
کر دیا جائے۔ وہ اپنے شاگردوں سے صاف لکھا ہوا کلام منگاتے تھے۔ اشعار اور
مرمر عربی کے درمیان اُننا فاصدہ رکھواتے کہ اس میں حسب ضرورت اصلاح دی
جاسکے۔ عموماً مقصد اصلاح بھی واضح فرما دیتے اور اصل مسودہ مرسل کو
واپس بھیج دیتے۔ قاضی عید الجلیل بریلوی کو لکھتے ہیں:

و دعنایت نامہ آپ کے اذونات مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیہ پر اور پشت پر اشعار

۱۸۴۱ء میں تھامس تھامس شکاف (بیرنٹ) لارڈ شکاف کے بھتیجے تھے۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۳ء میں
ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۴۴ء میں بیرنٹ بنے۔ ۱۸۴۵ء میں صدر کے آغاز پر دہلی میں مجسٹریٹ تھے
۱۸۴۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۸۴۷ء میں کورنٹ پائی۔

لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں ہی اس طرح کی بھیلی کہ حروف اچھی طرح پڑھیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری
 اچھی طرح ہے۔ اور میں عینک کا محتاج نہیں۔ لیکن باریں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف
 کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے بناء اصلاح کی باتیں نہیں۔ پناچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں دے
 بھیجتا ہوں۔ تاکہ آپ یہ زبانیں کر میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہو گا۔ اور مضدا میرا انہ لیشہ
 آپ کو معلوم ہو جائے۔ آپ خود دیکھیں اس میں اصلاح کہاں دی جائے۔ واسطے اصلاح
 کے جو غزلی بھیجئے۔ اس میں بین الازداد و بین المصرین کا نام عملہ زیادہ چھوڑ بیٹے۔ آپ کے دوسرے
 خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے۔ حروف اس کے روشن ہیں۔ مگر میں السطور منقذہ اور اصلاح کی جگہ
 معدوم۔ آپ کی خاطر سے رنج کتابت اٹھانا ہوں اور دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھنا جاتا
 ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس موجود۔ اس سے مقابلہ کر کے معدوم کر دیجئے گا۔ کہ کس شعر پر اصلاح
 ہوئی۔ اور کیا اصلاح ہوئی۔ اور کون سی بیت موثر ہوئی۔

لغت کو لکھتے ہیں:

دوسرا رسل جس کو تم نے بہ تکلف خطبات کر بھیجا۔ اصلاح و تبدل نہ تحریر مسطور کا پیچ و تاب سمجھیں
 آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا اور چھدر چھدر کیوں نہ لکھا؟ ایک الگ
 آدھ ورقہ زبارة مویانا تو ہو جاتا۔ بہ ہر حال اب مجھے تنگے چھنے پڑے ہیں۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

اشعار جناب زند کے انتہی کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے۔ اور اصلاح اور اشارے
 اور فوائد عیاں کہ میرا تیبوہ ہے عمل میں آیا۔

اصلاح سے مفوری آخری عمر میں بہت معذرت ہو گئے تھے۔ اور امتباروں میں اعلان
 چھپوا دیا تھا۔ کہ کوئی صاحب اپنا کلام اصلاح کے لئے نہ بھیجیں۔ لیکن ارباب عقیدت
 اس زمانے میں بھی تبرکاً اصلاح کے لئے اصرار کرتے تھے۔ وہ سیاح کو ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء

سہ جانی بانگے لال زند وکیل مہاراجہ بھرت پور۔

کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

مخانی اب میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار دوائے میرا حال کیا جائیں ہوں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار دوائے
کرمیوں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے ہیں۔ سوان کے اخبار میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے
اور میں میں نے غدر چاہا۔ جنہوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار کی اصلاح سے اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب
ایک ہر طرف سے خور کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہونا ہوں۔

دسنگا شعر گوئی | خواجہ حالی، حسین میرزا کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک روز میں (حسین میرزا)
اور غالب دیدار عام میں بیٹھے تھے۔ چوہدار آیا۔ اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔
غالب نے چوہدار کو ٹھہرایا اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذوں
میں بندھے ہوئے رکھے ہیں۔ وہ لے آؤ۔ کاغذ آئے۔ ان میں آٹھ نو پرچے تھے۔
جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے۔ اسی وقت قلم و دوات
منگا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ نو غزلیں
لکھ کر کے چوہدار کے حوالے کر دیں۔

ر. شعر خوانی | شعر خوانی کا انداز بڑا دلکش اور موثر تھا۔ خواجہ حالی نے صرف ایک مرتبہ
مشاعرہ میں غزل پڑھتے سنا۔ فرماتے ہیں : اُن کی باری سب کے بعد آئی۔ صبح ہو گئی
تھی۔ انہوں نے کہا : صاحبو! میں بھی اپنی بھریوں الاپتا ہوں : یہ کہہ کر اول اُردو طرح
کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح، نہایت پر درد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم
ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قد ران نہیں پاتے، اس لئے غزل خوانی میں فریاد
کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

”یادگار“ میں ایک اور واقعہ مرقوم ہے کہ ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں

کے مکان پر آئے اور کہنے لگے:

آج حضور نے ہماری قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ مرزا تم پڑھتے خوب ہو۔

اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شعر پڑھنے کا انہ از بہت اچھا تھا۔

حضرت میرزا فرماتے ہیں کہ ایک مصرعہ پڑھا کہ چند لمحے کے لئے چپ ہو جاتے۔ پھر اسے دہراتے۔ بعد ازاں دوسرا مصرعہ پڑھتے۔

طریق فکر شعر کا طریقہ خواجہ حانی کے بیان کے مطابق یہ تھا:

اکثر اوقات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی شعر سراپا ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا دیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سورتے تھے اور دوسرے دن صرت یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم کر دیتے تھے۔

ایک خط میں میرزا آقاسی کو لکھتے ہیں :-

کی ہنسی آتی ہے تم پر، مانند اور شاعر کے مجھ کو بھی یہ سمجھ ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا۔ اس کے قوافی لکھتے اور ساتھ میں بر غلطی نہ لگے۔ انہوں نے قوافی کو بلاشبہ بچپن میں سبب ہیں۔ کہتے لکھتے لگا ہوں۔ عدت سے مجھ پر اگر میں نے کوئی سنجیدگی یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں۔ صرف بھر اور ردیت قافیہ تو دیکھ لیا۔ اور اس میں غزل و قصیدہ لکھنے لگے۔ بھائی شاعری معنی آفرینی سے تلافیہ پیمانی نہیں۔

مشاعرے | فارسی مکاتیب میں چند مشاعروں کا بھی ذکر ہے۔ جن میں وہ خود شریک ہوئے۔ اردو مکاتیب میں میری تحقیق کے مطابق صرف ایک جگہ قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر آیا ہے۔ قاضی عبدالجلیل بریلوی نے مشاعرہ قلعہ کا مصرعہ طرح مانگا تھا۔ جواب

میں لکھتے ہیں:

قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرع طرہ کو کیا کیجئے گا۔
اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟ میں کہیں اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔
اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دو دم کہاں؟ کیا معلوم ہے۔ کہ اب کے نہ ہو اور
اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

یہ عذر سے کچھ مدت پہلے کا نقشہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خانہ ان تیموریہ کے
و شاع و اہوار دیکھ کر ارباب بصیرت کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ محفل اب ختم ہونے والا
ہے اور اس شمع کی جھلکا بہت مدت چند لمحوں کی مہمان ہے۔
ہن فارسی مکاتیب میں مشاعروں کا ذکر ہے۔ ان میں سے چار نواب مصطفیٰ خاں
شبستانہ کے نام ہیں۔ ایک سیر مہدی مجردی کے نام اور ایک نقشبندی نبی بخش حقیر
کے نام۔

بہار مشاعرہ | نواب مصطفیٰ خاں کو لکھتے ہیں۔ کہ جمعہ کی شب کو ۲۴ مارچ سنہ ۱۲۸۷
نہیں آیا۔ یہ سخن آرا سنہ ہوئی۔ میں نے سرتی زمین میں غزل نہیں کہی تھی۔ اس لئے
مشاعرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے زمین العابدین خاں
عزت اور خدام حسن خاں محو کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ وہ شام کو ہاتھی لیکر
میرے مکان پر آئے اور سناٹے لگے۔ وہاں پہنچ کر مولانا صدر الدین آزادہ

سالہ ہزار تیاں ہے کہ یہ سنہ ۱۲۸۷ یا ۱۲۸۸ کا مکتوب ہے۔ اس لئے کہ انہی دنوں میں جب کہ آئندہ اقتباسات
سے معلوم ہو گا۔ غالب نے گریستن والا قصیدہ کہا تھا۔ جو سید الاخبار کی ۱۲۸۳ء کی ایک انشوت
میں چھپا "سید الاخبار" کا یہ پرچہ میرے دوست مولانا مظہر الدین مرحوم شیر کوٹی مالک وایٹریٹر
الامان و وعدت کے پاس تھا۔ اس کا کچھ حصہ الامان میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہو گئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غنڈل پڑھی۔ دو
تین شعر دل نشین تھے۔ عارف و جوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک
غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے :

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم

چہرہ آغشته بہ خون باب جگر بنمایم

یہ غزل سنائی۔ آئندہ مشاعرے کے لئے "گرمیبا نم نے آید" "دامانم نے آید"

طرح ہوئی ہے۔

دوسرا مشاعرہ [دوسرے مشاعرے میں بھی غالب شریک ہوئے۔ فرماتے ہیں: اردو کے

بہت سے شاعر جمع تھے۔ اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آذرہ

بیمار تھے۔ اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہوئے؛

چوں زبوت بہ من رسید نخت ملک خواست "ملک خواست" سرودم سا نگاہ غزل طرحی

خواندم؛

چہ پیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نے آید

بہ زورے گفت سے آیم کرے دامنم نے آید

مشاعرے میں آئندہ کے لئے عرقی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا:

صد سال سے تو اں بہ تنہا گریستن،

غالب لکھتے ہیں:

دیرین زمین غالب آملی قصیدہ دارد و عرقی، و غزل۔ تا غالب بے نوا رہا کہ دام زمزمہ درخروش آرد۔

۱۵ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱۔ ۱۵ اس زمین میں صہبائی کا مقطع یہ تھا:

چو دیدم غالب و آذرہ را از ہند صہبائی بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نے آید

۱۶ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲۔

تیسرا چوتھا مشاعرہ | تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو آکر مجھے لے گئے۔ میر نظام الدین ممتون اور مولوی امام بخش جہاںی بہ سبب علالت نہ آ سکے۔ حضرت آزرده کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا۔ وہ اگرچہ دیرت آئے مگر آ گئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصبہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہ اسے برات مقبول کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور اردو کے شعرا کو درد سرنہ دوں۔ لیکن حضرت آزرده کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا۔ اور میں نے قصبہ پڑھنا فردری سمجھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ مشاعرہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ اور دونوں زبانوں کے شعرا آتے تھے۔ مگر غالب اس زمانے میں صرف فارسی کلام پڑھتے تھے۔

چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ اس میں میری "خاک زمیں گیر" ریختہ گوئیوں کی آنکھوں کا غبار نہ بتی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ جسے حضرت آزرده کی خدمت میں بھیج دیا۔

۱۷ کلیات نثر فارسی صفحہ ۳۰۲ | غالب کا قصبہ بہت مشہور ہے نواب ضیاء الدین احمد غاں نے اس کے متعلق دقت کے اکابر علم کی رائیں حاصل کی تھیں اور یہ رائیں "سید الاخبار" میں چھپی تھیں مفتی صدر الدین آزرده مرحوم نے اس طرح میں ایک غزل پڑھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے :

خواہم دم دعا بہ دعا تا گر لیستن
شد بسکہ بے اثر بہ دعا تا گر لیستن

ضیاء الدین احمد غاں تیسری غزل ان کے مجموعہ نفیس میں موجود ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے :

زمین پس یہ ضبط کو ششم و سوزم بہ سوزا شک
فرمودہ شیوہ ایست ہما تا گر لیستن

کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہو گئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غنہ ل پڑھی۔ دو
تین شعر دل نشین تھے۔ عارف و جوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک
غزل کہی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے :

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم
چہرہ آغشته بہ خون باب جگر بنمایم

یہ غزل سنائی۔ آئندہ مشاعرے کے لئے "گرمیبا نم نے آید"۔ "دامانم نے آید"
طرح ہوئی ہے۔

دوسرا مشاعرہ [دوسرے مشاعرے میں بھی غالب شریک ہوئے۔ فرماتے ہیں : اردو کے
بہت سے شاعر جمع تھے۔ اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدر الدین آزاد
بیمار تھے۔ اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہوئے :

چوں زبیت بہ من رسید نخست ملک خواست : "ملک خواست" سرودم سا نگاہ غزل طرحی
خواندم :

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نے آید
بہ نزع گشت مے آیم کہ مے دامنم نے آید

مشاعرے میں آئندہ کے لئے عرتی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا :
صد سال مے توں بہ تنہا گریستن،

غالب لکھتے ہیں :

دریں زمین طالب آملی قصیدہ دار و عرفی : غزل۔ تا غالب بے نوا رہا کہ دام زمزمہ درخروش آرنده۔

۱۵ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱۔ ۱۵ اس زمین میں صہبائی کا مقطع یہ تھا :

چو دیدم غالب آرنده را از ہند صہبائی بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نے آید

۱۶ کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲۔

تیسرا چوتھا مشاعرہ | تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو آکر مجھے نے گئے۔ میر نظام الدین ممتون اور مولوی امام بخش صہبائی یہ سبب علالت نہ آ سکے۔ حضرت آزرده کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا۔ وہ اگرچہ دیسے آئے مگر آگئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصبہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہ اسے "یرات نامقبول" کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور اردو کے شعرا کو درد سر نہ دوں۔ لیکن حضرت آزرده کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا۔ اور میں نے قصبہ پڑھنا ضروری سمجھا۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ مشاعرہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ اور دونوں زبانوں کے شعرا آتے تھے۔ مگر غالب اس زمانے میں صرف فارسی کلام پڑھتے تھے۔
چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ اس میں میری "خاک زمیں گیر" رنجتہ گویوں کی آنکھوں کا عبارتہ بنی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ جسے حضرت آزرده کی خدمت میں بھیج دیا۔

۱۔ کلیات نثر فارسی صفحہ ۳۰۲ تا ۳۰۳ غالب کا قصبہ بہت مشہور ہے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اس کے متعلق دنت کے اکابر علم کی راہیں حاصل کی تھیں اور یہ راہیں "سید الاخبار" میں چھپی تھیں مفتی صدر الدین آزرده مرحوم نے اس طرح میں ایک غزل پڑھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

خواہم دم دعا بہ دعا تا گر لیستن
شد بسکہ بے اثر بہ دعا تا گر لیستن

ضیاء الدین احمد خاں تیر کی غزل ان کے مجموعہ نظم میں موجود ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

زمین پس بہ ضبط کو ششم و سوزم بہ سوزا شک
فرسودہ شیوہ ایست ہا تا گر لیستن

میر مہدی مجروح والے خط میں قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں :
 جمعہ کی شب ۲۵ فروری (سنتہ درج نہیں) کو پادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر
 قلعہ میں جمع ہوں۔ چنانچہ خاندان بابر کے شہزادے اور لوگ اس قدر تعداد میں
 آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ سب سے پہلے "سلطان الشعراء"
 شیخ محمد ابراہیم ذوقؒ نے پادشاہ کی غزل پڑھی۔ پھر شہزادہ حفر سلطانؒ نے اپنی غزل
 سنائی۔ ان کے بعد میرزا جید رشکوہ، میرزا نور الدین اور میرزا عالی بخت عالی نے اپنا
 اپنا کلام سنایا۔ عالی کے پاس ہی میں (غالب) بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی غزل دس شعر کی پڑھی
 میرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر میں طرچی میں سنائے۔ میں ایک بہانے سے اٹھا
 اور اپنے گھر چلا آیا۔ دوکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ شراب پی
 اور سو رہا۔ صبح قلعہ میں گیا۔ تو وہ چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں،
 جمع تھے۔ انہوں نے رات والی غزلیں پھر سنائیں۔ میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی
 وہیں سنایا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب سے آخر میں "سلطان الشعراء (ذوق)"

۱۔ یہ مشاعرہ غالباً قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہو جانے کے بعد ہوا۔ جبکہ ذوقی بقید حیات موجود
 تھے۔ گویا یہ سنہ ۱۸۵۷ء اور سنہ ۱۸۵۸ء کے درمیان کا کوئی مشاعرہ سمجھنا چاہیے۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں کہ تمام شہزادوں میں یہ سب سے زیادہ خوش فکر تھے، مگر اہل نے
 مہلت نہ دی۔ غالب کے شاگرد تھے۔ مندرجہ ذیل مشہور شعرا بھی کا ہے :

گلی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق

جو تیری خوشی وہ ہی مراد مبرا ہوا

نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں۔

چھٹا مشاعرہ [فتنی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں کہ شہزادگان تیموریہ میں سے ایک نے بزم سخن راستہ کی اور شعرا کو بلایا۔ مجھے ریختہ گوئی سے کوئی ربط نہیں لیکن چنانہ ضروری تھا۔ شب کو مشاعرہ تھا۔ دن کے وقت بالخصوص مشاعرہ میں جاتے وقت بے تکلف چند شعر خیال میں آئے۔ یہ شعر آپ کو بھیجتا ہوں اچاہتا ہوں کہ آپ بھی اس زمین میں غزل کہہ کر میرے پاس بھیج دیں۔

خط کے آخر میں مرقوم ہے: نگاشۃ سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ فروری ہنگام نیمروز سال درج نہیں۔ تقدیم سے معلوم ہوا کہ سال ہجری ۱۲۸۲ ہوتا چاہیے اور سال عیسوی ۱۸۶۵ء۔

غالب کی شاعری کے متعلق محولہ بالا بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ ابتدا اردو سے ہوئی۔ تیرہ چودہ برس میں خیالی مضامین کا ایک یوان تیار کر لیا تھا۔ جب اچھائی برائی کی تیز پیدا ہوئی تو اکثر اشعار حذف کر ڈالے۔ تھوڑے سے بہ طور نمونہ رکھے۔

۱۸۶۵ء کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۳۸ مولانا ابوالکلام آزاد نے خواجہ حالی مرحوم کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ غالب مشاعرہ میں صرف ایک مرتبہ ذوق سے ہم طرح ہوئے، وہ بھی شاہی مشاعرہ میں اور پادشاہی حکم سے۔ غالب یہ وہی مشاعرہ ہے جس میں طرح تھی بیاباں کے لئے، زبان کے لئے اس زمین میں ذوق کی غزل مشہور ہے۔ غالب نے اس مشاعرہ کی غزل کو چند جید اشعار بڑھا کر فرخ آباد بھیجا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں فرماتے تھے کہ ذوق نے اس مشہور شعر کی بے حد تعریف کی تھی۔ اور بار بار دہرایا گیا تھا:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

نواب سید الدین احمد خاں غالب، نواب فیاض الدین احمد خاں کی زبانی روایت کرتے تھے کہ ایک مرتبہ بہادر شاہ نے ذوق سے روایت کی، آمد کو کوئی ایسا شعر سنا جو تمہارے خیال میں سب سے بہتر ہو۔ ذوق نے کچھ دیر تامل کیا پھر غالب کا یہ شعر پڑھا:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سرداس بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

(۲) فارسی بھی اُردو کے ساتھ ہی شروع کر دی تھی اور کم و بیش بیس برس کی عمر تک دونوں کی مشق برابر جاری رہی۔

(۳) اس کے بعد فارسی کی طرف زیادہ توجہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۵ء سے لے کر ۱۸۵۰ء تک وہ اُردو کے بجائے فارسی کے شاعر سمجھے جاتے رہے۔

(۴) قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے کے بعد یہ پاس خاطر پادشاہ انہوں نے پھر اُردو پر توجہ مبذول کی۔ ان کے مروجہ دیوان کی کئی اچھی غزلیں اسی دور کی کہی ہوئی ہیں۔

(۵) نظم و نثر کا سلسلہ یوں تو آخری دم تک قائم رہا۔ لیکن ان کی اُردو اور فارسی نظم و نثر کی بہترین چیزیں وہ ہیں۔ جو ۱۸۲۵ء سے لے کر قریباً ۱۸۴۵ء تک لکھی گئیں۔ ۱۸۲۵ء سے بیشتر ان میں عامی تھی۔ ۱۸۴۵ء کے بعد مانعی قوے مضمحل ہو گئے۔ اور قوت فکر و نظم پہلی حالت پر قائم نہیں رہی تھی۔ *